سلسلۂ مطبوعات مجلس علمی نمبر ۳۲

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

تفسیر سورۂ والعصر

المسمیٰ بہ

نظامِ صلاح و اصلاح

از

حضرت مولینا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ العالی

سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی

۱۹۶۲ء

ناشر

ادارۂ مجلس علمی کراچی

أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝

کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن۔

قرآن کا دو آیاتی

نظام صلاح و اصلاح

از

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ

سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

ناشر

ادارہ مجلس علمی ــــ کراچی

[illegible] پبلشنگ ہوس بک سیلر اینڈ پبلشر چار مینار حیدرآباد

سنہ طباعت — ۱۹۶۲ء

مقامِ طباعت — مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی

تعدادِ اشاعت — ایک ہزار

قیمت مجلد — ساڑھے تین روپے

ناشر

ادارۂ مجلس علمی پوسٹ بکس ۳۸۸۳ کراچی

فہرست مضامین

مُقدّمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمان کیا کریں؟

مسلمان اپنے مسلمان ہونے کا مطلب کچھ سمجھیں تو یہ سوال حیرت ناک وعبرتناک ہی نہیں انتہائی شرمناک بھی ہے! اسلام کے حق میں خود سراپا رسوائی راقم نابکار اپنے بھائیوں کی جن باتوں کو دیکھ سُن اور پڑھ کر کُڑھتا ہے، ان میں اس سوال وبحث کا نمبر شاید سب سے بڑھ گیا۔ جب تک ہمارے بعض اخبارات ورسائل میں اس کا چرچا رہا جب کہیں نظر پڑجاتی دل ودماغ پر تازہ بم پھٹتا۔

غضب خدا کا جس اسلام پر ہم کو ایمان کا دعویٰ ہے اور جس کا دعویٰ یہ ہے کہ "دین" و "نعمت" ہر جہت سے کامل ومکمل فرما کر رہتی دنیا تک انسان کی صلاح وفلاح کے لئے اپنی رضامندی کو بالکلیہ خدا نے اس کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، وہ معاذ اللہ چودہ سو سال کے اندر ہی ایسا فرسودہ وناکارہ نکل گیا کہ خود اس کے نام لیوا بر ملا اس پوچھتے پھریں کہ مسلمان کیا کریں؟ اور جواب کے لئے اپنوں ہی نہیں پرایوں تک کا منہ تکتے پھریں کاش زمین پھٹ جاتی اور اسلام اور اس کے خدا ورسول کو رسوا کرنے والے ہم مسلمان اس میں دھنس جاتے۔

پھر جب سوال یہ ہے کہ مسلمان کیا کریں؟ تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جاسکتا ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر یا اپنی اسلامیت کے انفرادی واجتماعی

تقاضوں اور مطالبوں کے تحت رہتے ہوئے ان کو پورا کرنے کیلئے کیا کریں؟ اس لئے اس کا کوئی ایسا جواب کسی طرح جائز و درست ہی کیسے ہوگا جس میں سب سے مقدم مسلمانوں کی "اسلامیت" یا ان کی فکری و عملی انفرادیت اور اس کی خصوصیات و شعائر کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔

دین کی اصلی و حقیقی منزلِ مقصود اگرچہ "یوم دین" یا آخرت کی "خیر و ابقیٰ" ابدی فلاح ہے، لیکن اس کی تربیت گاہ یا امتحانی راستہ دنیا اور اس کی زندگی کا موجودہ عبوری دور ہی ہے۔ لازماً سارے دینی افکار و اعمال اس عبوری دور ہی میں کام لانے یا برتنے کے ہیں۔ لہٰذا دینِ اسلام میں اصولاً نہ تو دنیا سے فرار کی گنجائش ہی نہ اس کی تعلیمات و احکام ایسے ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں ان پر عمل تکلیف مالا یطاق کی حد تک دشوار ہو یا اس عمل کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی ہی ان پر وبال ہو جائے۔ ایسا دین نہ کامل کہا جا سکتا ہے نہ نعمت، کامل و نعمت تو جب ہی ہوگا کہ اسکے اوامر و نواہی پر عمل یوم دین یا آخرت کے راستے دنیا کو بھی زندگی کے ہر دوسرے راستے یا طریقے سے زیادہ امن و امان عافیت و سلامتی کا راستہ انفرادی و اجتماعی قومی و بین اقوامی ہر اعتبار سے بنا دے۔ البتہ راستہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایک طرف کچھ نہ کچھ مسافرانہ دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا اور دوسری طرف اس کو تمام تر راستہ سمجھ کر اور منزل کے تابع بنا کر ہی اس پر چلنا چلانا ہوگا۔ حتیٰ کہ راستہ کی ایسی مصروفیتوں اور دلچسپیوں سے بھی بچنا بچانا ہوگا، جن میں منزل کا کوئی کھوٹا ہوتا ہو۔

اب پہلے اسلام کے بنیادی فکری مطالبات کو لیں۔ ان کا جامع و مانع

کل چار لفظوں کا ایک ہی ایجازی واعجازی جملہ "لا الٰہ الا اللہ" کا مشہور و معروف کلمہ ہے۔ الٰہ عربی میں اسی کو کہتے ہیں جس کو ہندی دیوی دیوتا اور جس کو انسان اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے کسی نہ کسی دائرہ میں کسی نہ کسی حد تک اپنے بناؤ بگاڑ یا نفع و ضرر میں غیبی طور پر دخیل و متصرف مانتا ہے۔ پھر لازماً اسی بنا پر اس کے آگے جھکتا اور ہاتھ پھیلاتا یعنی اس سے عبادت و استعانت کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ یہ الٰہ یا دیوی دیوتا عرب و عجم ہندوستان و یونان کہیں کی دیومالا کے بھی ہوں، ان کے تصرف کی بڑی نمایاں امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کارفرمائیوں کو عالمِ شہادت کے ظاہری و مادی اسباب کے پس پشت ان کے غیبی ارادہ و مشیت پر مبنی یقین کیا جاتا ہے۔

اسلام کے دعوتی کلمہ کا بنیادی مطالبہ اس کے برخلاف یہ ہے کہ شہادت و غیب کی پوری کائنات میں ایسی ارادہ و مشیت والی متصرف غیبی ذات ایک اور صرف ایک اللہ کی ہے۔ یہ مشیت ایسی ہمہ جہتی و ہمہ گیر ہے کہ اس کے چاہے بغیر کوئی مادی و غیر مادی جاندار و بے جان، حتیٰ کہ بظاہر انسان جیسی بااختیار مخلوق تک بذاتِ خود اپنی کسی مستقل قوت و خاصیت یا ارادہ و مشیت سے نہ ذرہ بھر کوئی حرکت کرتی ہے نہ کسی فعل و اثر یا نفع و ضرر کا سبب یا اس کی حقیقی علت ہوتی ہے جب نفع و ضرر کی مستقل بالذات مالک و متصرف ایک ہی ذات ٹھہری، تو آپ سے آپ عبادت و استعانت کا تعلق بھی صرف اسی ذات سے جائز و درست رہ جاتا ہے۔ اس لئے کتاب اسلام کے چند سطری دیباچہ ہی میں —— جو دراصل کتاب کے سارے مضامین کا نچوڑ ہے —— ہم سے سب سے پہلا اقرار یا حلف وفاداری یہی لیا گیا کہ

ہم صرف اور صرف تیرے ہی آگے جھکیں گے اور تیرے ہی آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔ یعنی تیرے سوا نہ کسی کی عبادت واطاعت کریں گے اور نہ کسی کو حقیقی طور پر صاحب اقتدار و اختیار معین ومددگار جان کر اس کے آگے سوال کا ہاتھ پھیلائیں گے۔ ایاك نعبد وایاك نستعین۔ یہ وہ حلف وفاداری ہے جس کو دن رات نمازوں میں بار بار دہراتے رہنا ہر مسلمان پر فرض کر دیا گیا ہے۔

انسان کا ایک ہی حقیقی مسئلہ درحقیقت نفع وضرر کے حقیقی سبب وعلت کو جان اور پا لینا ہے۔ کیونکہ انسان کی پوری زندگی کا پنڈلم یا رقاص صرف ان ہی دو نقطوں کے درمیان رقص کرتا ہے ہماری زندگی کی ہر نقل وحرکت یا تو کسی نہ کسی ضرر سے بچنے کے لئے ہوتی ہے یا کسی نہ کسی نفع کو پانے کے لئے۔ عالم شہادت کے لامذہب یا مادہ پرست چونکہ ہر فعل واثر کو کسی نہ کسی طبعی یا مادی سبب وعلت کا مسبب ومعلول سمجھ بیٹھے ہیں، اس لئے وہ اپنا سارا زور، مادی وطبعی اسباب وعلل کی دریافت اور ان ہی کو معبود و مستعان بنانے میں لگا دیتے ہیں۔ دوسری طرف عالم غیب یا غیر مادی وروحانی طاقتوں کو ماننے والے مذہبی مشرکین جاندار و بے جان مظاہر فطرت آگ، پانی، سورج، ستاروں، جانوروں، تک کے غیبی تصرفات کا دھوکا کھا کر ان کی پوجا پاٹ میں لگ گئے یا پھر فرشتوں اور فرشتہ صفت انسانوں انبیاء واولیا وغیرہ خدا کے خاص ومقبول بندوں کو خدا اور خدائی طاقتوں کا مظہر ونمایندہ بلکہ عین خدا یا اوتار قرار دے کر ان کے بتوں تک کی پرستش اختیار کر لی۔:

اسلام اپنے چار لفظی دعوتی کلمہ ہی کی رو سے، جس دین توحید کا داعی و

مدعی ہے، مذہب اور لامذہبی کے تمام ایسے اصناف شرک کی یک قلم نفی وانکار کرتا ہے، جن میں اصل خالقِ کائنات خدا کے سوا کسی بھی مادی وغیر مادی یا روحانی مخلوق کو کسی دائرہ و درجہ میں بھی بذات خود فاعل و موثر، بہ الفاظ دیگر کسی فعل واثر یا نفع وضرر کا مالک ومختار جانا اور مانا ہے بلکہ اسلام کا اپنے ہی متعلق نہیں، بلکہ تمام سچے دینوں اور ان کے سچے داعیوں کے متعلق یہی دعویٰ ہے کہ ان کی دعوت بھی لا الہ الا اللہ ہی تھی۔ سورۂ اعراف وہود میں مختلف انبیا کی زبانوں سے بار بار اسی دعوت و دعوے کو ان کی قوم کے سامنے دہرایا گیا ہے کہ یا قوم اعبدو اللہ مالکم من الہ غیرہ یعنی اللہ کے سوا قطعاً کوئی دوسرا الہ نہیں، جو تمہاری عبادت یا بندگی و فرمانبرداری کا حقدار و سزاوار ہو۔ لہٰذا اسی اور صرف اسی کی پوجا یا پرستش کرو۔ بہت بڑی غلطی اور غلط فہمی خود مسلمانوں بلکہ ان کے بہتیرے علما تک کو یہ دیکھی کہ اسلام کی اصل توحیدی دعوت خدا یا اللہ کے واحد ہونے کو جانتے ہیں حالانکہ خدا و خالق تو تمام دنیا بلکہ خود عرب کے مشرک تک ایک ہی اور صرف اللہ ہی جانتے اور مانتے تھے۔ من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ۔ شرک تو سارا کا سارا "توحید الہ" یعنی صرف ایک اللہ کی اُلوہیت یا اس کے بلاشرکت غیرے "الہ واحد" ماننے میں تھا۔ اس لئے اس حقیقت کو بار بار ہر عنوان سے دہرایا گیا ہے کہ تمہارا الہ ایک ہی الہ ہے (الٰھکم الہ واحد) اور اس ایک ہی الہ کے سوا کوئی قطعاً دوسرا الہ نہیں (وما من الہ الا الہ واحد) صرف اللہ ہی ایک الہ ہے۔ اور وہی آسمان میں بھی الہ ہے اور زمین میں بھی وہی الہ ہے۔ وھوالذی فی السماء الہ وفی الارض الہ۔ ایسا نہیں ہے کہ زمین و

آسمان کو پیدا کر کے خود کو معطل کر لیا ہو۔ اللہ ہی ہو نہ کہ کوئی دوسرا الٰہ مگر وہی اللہ لا الٰہ الا ھو ــــ یقیناً میرے سوا کوئی الٰہ نہیں پس مجھی سے ڈرو۔ انہ لا الٰہ الا انا فاتقون ــــ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ ہرگز نہیں، فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ ــــ اللہ کے ساتھ کسی اور کو الٰہ نہ بناؤ۔ ولا تجعل مع اللہ الٰھاً اخر ــــ اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیات ہیں بار بار اس پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام کا اصل مطالبہ اللہ کے ایک یا واحد ہونے کا نہیں بلکہ صرف اسی کے الٰہ یا "الٰہ واحد" ہونے کا ہے۔

اور صرف اسی ایک کے الٰہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نفع وضرر پر مبنی بندگی و فرمانبرداری کا تعلق صرف ایک سے رکھا جائے چنانچہ توحید الٰہ کی ایسی ہی آیتوں کے ساتھ ہی ساتھ جا بجا اس کی صراحت بھی ہے کہ "بیشک" میں اللہ ہی ہوں کہ سوا میرے کوئی دوسرا الٰہ نہیں، پس عبادت بھی میری ہی کرو۔ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون ــــ حضرت موسیٰؑ کو جب نبی بنائے جانے کی اطلاع فرمائی جاتی ہے تو خصوصی توجہ کے ساتھ سننے اور یاد رکھنے کی مقدم ترین وحی یہی فرمائی جاتی ہے کہ بیشک و بے شبہ میں ہی تنہا وہ اللہ ہوں کہ میرے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ لہٰذا بندگی و تابعداری بھی صرف میری ہی کرو۔ وانا اخترتک فاستمع لما یوحی اننی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی۔

دوسری طرف طبعاً و عقلاً ہر طرح ظاہر ہے کہ بندگی و تابعداری یا عبادت و طاعت کا واحد حقیقی حقدار وہی ہوگا جس کے ہاتھ میں حقیقتہً ہر طرح کا نفع وضرر ہو۔ ہر غیر اللہ سے کاٹ کر صرف اللہ کے ساتھ انسان کو جوڑنے والے موحّد

حنیف ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے انسان کو اس کی
انسانیت پر تھوکنے والی انتہائی ذلت و رسوائی کا سزاوار اسی بدولت ٹھہرایا
گیا ہے کہ "کیا تم خدا کو چھوڑ کر ایسوں کی بندگی پر اتراتے ہو جو نہ تم کو کوئی نفع
پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، تھو ہے تم پر اور اُن پر بھی جن کی تم بندگی کرتے ہو کہ اتنی
موٹی بات بھی نہیں سمجھتے" اتعبدون من دون اللہ ما لا ینفعکم ولا
یضرکم اف لکم ولما تعبدون افلا تعقلون۔

سورۂ نمل کے قریباً پورے پانچویں رکوع میں نفع و ضرر کی مختلف چیزوں
کی طرف توجہ دلا کر بار بار اس طرح چیلنج دیا گیا ہے کہ دیکھو

اَمَّن خلق السموٰت والارض	"جس ذات نے سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا
وانزل لکم من السماءِ ماءً	اور آسمانوں سے پانی برسایا جس سے ہرے بھرے باغ
فانبتنا بہٖ حدائق ذات بہجۃ	اگائے ورنہ تم ان باغوں کو ہرگز نہ اگا پاتے تو بتلاؤ
ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا	کہ ایسے اللہ کے ساتھ (اس کا شریک) کوئی دوسرا
ءالٰہ مع اللہ بل ھم قوم	الٰہ ہو سکتا ہے پھر بھی (یہ مشرک) دوسروں کو اللہ کے
یعدلون ۰ اَمَّن جعل الارض	برابر ٹھہراتے ہیں۔ اس طرح جس ذات نے زمین کو مخلوق
قرارا وجعل خلالھا انھارا	کیلئے قرارگاہ بنایا اس کے درمیان درمیان دریا نکالے
وجعل لھا رواسی وجعل بین	اور اس کے جماؤ کیلئے پہاڑ بنائے اور سمندروں کے بیچ
البحرین حاجزا ء الٰہ مع اللہ	میں حد فاصل بنائی کیا ایسے اللہ کے ساتھ کوئی اور
بل اکثرھم لا یعلمون ۰ اَمَّن	الٰہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ شرک کرنے والے اکثر اتنے
یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف	نادان ہیں کہ ایسی کھلی بات بھی نہیں جانتے! علیٰ ہذا

جب کوئی مصیبت زدہ بیقرار ہو کر اسکو پکارتا ہے اور
وہ اس کی مصیبت کو دور فرما دیتا ہے (اس سب سے
بڑھ کر یہ کہ) تم خود انسانوں کو اس زمین پر (بہت کچھ
تصرف و اختیار عطا فرما کر) اپنا نائب یا جانشین بنا
رکھا ہے۔ کیا ایسے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ
ہو سکتا ہے مگر تم اس (احسان و حقیقت) کو بھی
بہت کم یاد رکھتے ہو اچھا اور بتاؤ جو ذات تم کو
خشکی و سمندر کی تاریکیوں میں راستہ دکھاتی ہے اور جو
ہواؤں (یا مانسونوں) کو اپنی رحمت (بارش) کی
خوشخبری سنانے کو بھیجتی ہے کیا ایسے اللہ کے ساتھ
کوئی دوسرا (اس کا شریک و سہیم) الٰہ ہو سکتا ہے

السوء ویجعلکم خلفاء الارض ۚ
ءاله مع الله ۚ قلیلا ما تذکرون
امن یهدیکم فی ظلمات البر
والبحر ومن یرسل الریاح
بشرا بین یدی رحمته ء اله
مع الله تعالی الله عما یشرکون
امن یبدؤا الخلق ثم یعیده
ومن یرزقکم من السماء
والارض ۚ ءاله مع الله
قل هاتوا برهانکم ان کنتم
صادقین۔

ایسے اللہ تعالیٰ کی شان شریکوں یا ساجھیوں سے
بہت برتر ہے یا وہ ذات جو مخلوق کو پہلے پہل پیدا کرتی اور
پھر ویسی ہی برابر پیدا کرتی رہتی ہے اور جو تم کو آسمان و زمین سے
رزق عطا کرتی ہے کیا ایسے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا
الٰہ مانا جا سکتا ہے ایسی ایسی شہادتوں اور دلیلوں کے
مقابلے تم اللہ کے سوا دوسروں کو الٰہ بنانے کی کوئی
دلیل رکھتے ہو تو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

آگے اس سے بڑھ کر تیز تحدی سورۂ واقعہ میں پڑھ لیں کہ:-

بتاؤ جو کچھ تم بوتے ہو اس کو اگاتے تم ہو یا ہم ہیں   افرءیتم ما تحرثون ○ ءانتم تزرعونه

اگانے والے! اگر ہم چاہیں تو ساری پیداوار کو   ام نحن الزارعون ○ لو نشاء

چورچور کرکے رکھ دیں، جس کے بعد تم ایسی باتیں   لجعلنه حطاما فظلتم تفكهون

بناتے رہ جاؤ کہ ہم تو نرا گھاٹے ہی میں پڑ گئے   انا لمغرمون ○ بل نحن محرومون

تو نجی تک کھو بیٹھے۔ اور بتاؤ کہ جو پانی تم پیتے ہو   افرءيتم الماء الذي تشربون ○

اس کو بادلوں سے تم اتارتے ہو یا ہم ہیں اتارنے   ءانتم انزلتموه من المزن ام

والے! اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر چھوڑ دیں، اس پر   نحن المنزلون ○ لو نشاء جعلنه

بھی شکر کیوں نہیں کرتے۔ اسی طرح دیکھو کہ جس   اجاجا فلولا تشكرون ○ افرءيتم

آگ کو تم سلگاتے ہو اس (کی لکڑی) کا درخت   النار التي تورون ○ ءانتم انشاتم

تم نے پیدا کیا یا ہم ہیں پیدا کرنے والے۔   شجرتها ام نحن المنشئون ○

اور بھی جا بجا کثرت سے مختلف تکوینی یا طبعی مظاہر و آثار کو بالذات اللہ تعالیٰ ہی کے علم و ارادہ کا مخلوق و مجعول قرار دے کر اسی بنا پر غیر اللہ کے الٰہ یا شریک ہونے کی شد و مد سے نفی فرمائی گئی ہے:

تمہارا رب ہی پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور   وربك يخلق ما يشاء ويختار

پسند کرتا ہے دوسروں کو (جن کو تم نے اللہ کا   ما كان لهم الخيرة ؕ سبحان

شریک بنا رکھا ہے) کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ   الله وتعالى عما يشركون ○

تعالیٰ اس شرک سے پاک و برتر ہے اور تمہارا رب   وربك يعلم ما تكن صدورهم

وہ سب کچھ جانتا ہے جو یہ اپنے سینوں میں چھپاتے   وما يعلنون ○ وهو الله

ہیں اور جو کچھ (اپنی زبانوں یا افعال و حرکات سے)   لا اله الا هو له الحمد

ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہ فقط اللہ ہی ہے کہ جس کے سوا — فی الاولیٰ والاٰخرۃ ولہ الحکم
کوئی الٰہ نہیں (لازمًا) حمد و ستائش بھی ازاول تا آخر — والیہ ترجعون ٥ (قصص)
فقط اسی کا حق ہے اور اسی کا حق فرمانروائی
بھی ہے اور بالآخر تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

آگے اس اللہ کی بلا شرکت غیرے "الٰہیت" کے ثبوت و شہادت ہی میں حضور کو حکم ہے کہ ان کو چیلنج دے کر پوچھو کہ :۔

اگر اللہ تم پہ ہمیشہ قیامت تک رات ہی رات مسلط — قل ارء یتم ان جعل اللہ علیکم
رکھے تو اس کے سوا کون دوسرا الٰہ ہے جو تمہارے — اللیل سرمدا الی یوم القیامۃ
لئے دن کی روشنی لا سکے؟ کیا تم (توحید الٰہی کی ایسی — من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بضیاء
واضح نشانیوں کو بھی) نہیں سنتے سمجھتے۔ اسی طرح ان سے — افلا تسمعون ٥ قل ارء یتم
پوچھو کہ اگر اللہ تم پر قیامت تک دن ہی دن مسلط — ان جعل اللہ علیکم النہار
رہنے دے تو اس کے سوا کون دوسرا الٰہ ہے — سرمدا الی یوم القیامۃ من الٰہ
جو تمہارے لئے رات لا سکے، جس میں تم آرام لو، کیا — غیر اللہ یاتیکم بلیل تسکنون
تم یہ سب دیکھتے سمجھتے نہیں! لہٰذا یہ اس کی رحمت — فیہ افلا تبصرون ٥ ومن
ہی تو ہے کہ اس نے (صرف رات یا دن کے بجائے) — رحمتہ جعل لکم اللیل والنہار
رات اور دن دونوں بنائے کہ رات میں آرام اور دن میں — لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من
روزی روزگار کے کام دھندوں میں لگو اور ایسی — فضلہ ولعلکم تشکرون ٥
ایسی بیشمار نعمتوں پر اللہ کا شکر بجا لاؤ۔ — (قصص ع ۷)

غرض اسلام کا خدا نہ فلسفیوں کا خدا ہے جس نے زمین آسمان کی کائنات اور

انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ان کو کچھ پیدائشی یا طبعی خواص و اختیار دے کر مطلق العنان چھوڑ دیا اور خود ریٹائر یا معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ وہ مشرکوں کا خدا ہے جس نے کائنات کے کارخانے کو چلانے کے لئے کچھ مختار قسم کے ایجنٹ یا کارکن مختلف الہوں یا دیبی دیوتاؤں کی صورت میں مقرر کر رکھے ہیں۔ نہ وہ اپنے علم و قدرت میں معاذ اللہ ایسا محدود و عاجز ہے کہ کبھی تھک اور سوجاتا ہو اور بذاتِ خود اپنی مخلوقات کی نگرانی و خبر گیری سے قاصر ہو۔ اس کے برخلاف اسلام کے تعین کلمۂ دعوت "لا الٰہ الا اللہ" ہی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا "اللہ" محض خالق نہیں بلکہ اپنے علم و قدرت ارادہ و مشیت تمام صفات و کمالات میں ایسا نامحدود و ہمہ گیر ہے کہ وہ خود ہی براہِ راست اپنی تمام زمین و آسمان کی مخلوقات کا رب و قیوم بھی ہے[1] یعنی جاندار و بے جان تمام موجودات کو اس نے وجود صرف بخشا ہی نہیں، بلکہ اس وجود کا مسلسل بقا و قیام بھی تمام تر اللہ کی قیومیت و مشیت سے ہے نیز وہی براہِ راست ان کا رب یا پروردگار و نگراں کار بھی ہے۔ یعنی مختلف موجودات کے جو مختلف افعال و آثار نظر آتے ہیں، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی ربوبیتی و پرورشی شان کے مظاہر ہیں جو زمین و آسمان کی ہر مخلوق کی ہر خصوصی خلقت کے سوال و طلب کے موافق اس کی تربیت و پرورش سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یسئلہ من فی السمٰوٰت والارض کل یوم ھو فی شان فبای الاء ربکما تکذبٰن۔

---

[1] اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ ولا نوم لہ ما فی السمٰوٰت والارض۔

بلکہ موجودات کی بے شمار گوناگوں رنگا رنگ کثرتیں حقیقت میں خالقِ عالم کی ہمہ وقتی و ہمہ جہتی شانِ ربوبیت یا پروردگاری ہی کے کرشمے ہیں کہ ہر موجود کی صورت و نوعیت یا اقتضائے ذات کے مطابق اس کے افعال و آثار کا فیضان یا ان کی تربیتی تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے "خالق العالمین" کے بجائے اپنا اولین تعارف "رب العالمین" سے فرمایا گیا۔ انسان کو اپنے اندر یا باہر انفس و آفاق میں ہر آن براہِ راست مشاہدہ اللہ تعالیٰ کے ربوبیتی یا پروردگارانہ صفات و کمالات ہی کا ہوتا رہتا ہے۔ اسمِ ذات (اللہ) کے بعد سب سے زیادہ تکرار و تذکیر صفتِ "رب" ہی کی پوری کتابِ اسلام ہی میں ملتی ہے۔ باقی رحمانیت، رزاقیت وغیرہ بلکہ خالقیت تک سارے اسما و صفات دراصل صفت رب ہی کے توابع و لوازم ہیں۔

انسان کا حقیقی نفع و ضرر ہر موجودہ مخلوق کا حقیقی نفع و ضرر وہی ہے جو اس کے خلقی یا خصوصی کمال کے حق میں نفع و ضرر کا باعث ہو۔ کتے کی تربیت یہ نہیں ہے کہ اس کو گھوڑا بنا دیا جائے بلکہ اس کے کلبی صفات ہی کو تربیت و ترقی دے کر بہتر سے بہتر کتا بنایا جائے۔ انسان جو اس کائنات کا گل سر سبد اور اپنے خالق کا شاہکار بلکہ خود اس کی ذات و صفات خصوصاً اس کے علم و ارادہ کا مظہرِ اتم یا زمین میں اس کا خلیفہ و جانشین ہے۔ سب سے زیادہ اسی کو شعوری طور پر رب العالمین کی عالمگیر ربوبیت سے متعارف اور اس کی طرف متوجہ کرنا تھا تاکہ وہ غیر اللہ کو اپنے نفع و ضرر کا مالک اور لازماً الٰہ یا معبود و مقصود سمجھ کر اپنی خلقت کے بلند ترین مقام "احسن تقویم" سے گر کر

اسفل سافلین کی حیوانی پستیوں میں نہ جا پڑے یا انسان ہو کر کووں اور چیلوں کی طرح فضا یا خلا میں اُڑنے ہی کو اپنا اصل کمال نہ جاننے لگے۔

مسلمان ہونے کی حقیقت بھی صرف یہی ہے کہ انسان اپنے کو حیوان نہیں انسان سمجھ کر اپنی انسانیت کی تکمیل و تربیت کے لئے اس رب العالمین کی تربیتی ہدایات کے بے چون و چرا اپنے کو حوالہ کر دے، جس کی ربوبیت پروردگاری دن رات ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوقات تک میں مشاہدہ کر رہا ہے یہی معنی ہیں لا الٰہ الا اللّٰہ کے عہد و اقرار کے کہ اللہ کے سوا کسی غیر کو دین و دنیا کے کسی چھوٹے بڑے نفع و ضرر کے معاملہ میں الٰہ و معبود یا رب نہ ٹھہرایا جائے یہی اسلام کی "صراط مستقیم" یا عین اسلام ہے۔ ان اللہ ربی و ربکم فاعبدوہ ھٰذا صراط مستقیم۔

غرض انسان کا واحد مسئلہ اس کے حقیقی انسانی نفع و ضرر کا مسئلہ ہے اور اسلام کی توحید چھوٹے بڑے انفرادی و اجتماعی ہر نفع و ضرر کا واحد مالک و متصرف بلا شرکتِ غیرے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو جاننا اور ماننا اور عملاً صرف اسی سے عبادت و استعانت کا تعلق رکھنا ہے، اور یہی ہر شک و شبہ سے ماورا اسلام کا دین اور اس کی دینی دعوت ہے، سورۂ یونس کے آخر میں کس شدومد کے ساتھ خود نبی الاسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کے اعلان کا حکم ہے:۔

قل یا ایھا الناس ان کنتم	"کہدو کہ اے لوگو اگر تم کو میرے دین (کی حقیقت
فی شک من دینی فلا اعبد	نوعیت) میں کچھ شک ہے تو کان کھول کر سن لو
الذین تعبدون من دون	کہ اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کرتے ہو میں نہیں کرتا

میں تو صرف اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جس کے ہاتھ میں تمہاری موت ہے (جو تمہاری زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خاتمہ ہی کر دیتی ہے) اور مجھ کو یہ حکم دیا گیا کہ (اس توحیدی حقیقت پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور اپنے کو اس دین کے اس طرح حوالہ کر دو کہ زندگی کے ہر دوسرے طریقے سے بالکل الگ ہو جاؤ اور شرک کرنے والوں میں ہرگز ہرگز نہ ہو۔

ولکن اعبد اللہ الذی یتوفکم وامرت ان اکون من المومنین ○ وان اقم وجھک للدین حنیفاً ولا تکونن من المشرکین ○

اس شرک کی حقیقت ہے کیا؟ وہی کہ دین و دنیا کے کسی مطلب و مقصد کے لئے۔

«اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسے کو نہ پکارنا جو حقیقۃً تم کو نہ کوئی نفع پہنچا سکے نہ ضرر، پھر بھی (بالفرض) اس کھلے کھلے (حکم و ہدایت کے) خلاف تم نے کیا تو تم بھی (حق ناشناسوں یا) ظالموں میں شمار ہو گے۔»

ولا تدع من دون اللہ ما لا ینفعک ولا یضرک فان فعلت فانک اذاً من الظلمین۔ (یونس ع ۱۱)

آگے پھر اس نفع و ضرر ہی کے معاملہ و مسئلہ کے متعلق کلی و قطعی اعلان ہے کہ:-

اگر اللہ تم کو کوئی ضرر پہنچا دے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اس کو دور کرنے والا نہیں۔ اسی طرح اگر وہ تمہارے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمائے تو اس کے اس فضل و کرم کو کوئی ٹالنے والا نہیں وہ اپنے جس بندہ کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے وہ بڑی بخشش و رحمت والا ہے۔

وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ وھو الغفور الرحیم ○ (ایضاً)

الغرض قیامت تک کے لئے اب تمام بنی آدم کو بہ بانگ دہل سنا دو کہ زندگی کی تمام دوسری مشرکانہ و باطل راہوں کے مقابلہ میں تمہاری آدمیت و انسانیت کی تربیت و تکمیل کے نفع و ضرر کے لحاظ سے **توحید اللہ** کی جو واحد راہِ حق تھی وہ خود تمہارے حقیقی مربی (رب) کی طرف سے آچکی۔ (قل یاایھا الناس قد جاءکم الحق من ربکم) بس اب اس کے بعد جو اس راہِ حق کو اختیار کرے گا وہ اپنے ہی نفع یا بھلائی کے لئے، اور جو بے راہ ہوگا وہ خود اپنی ہی برائی اور بربادی خریدے گا (فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا) رہا خود اپنی ذات کا معاملہ تو کہدیں کہ اس واشگاف اعلانِ حق کے سوا مجھ پر اس کی ذمہ داری مطلق نہیں کہ تم اس کو قبول کرتے ہو یا نہیں (وما انا علیکم بوکیل) البتہ ساتھ ہی ساتھ یہ حکم مجھ کو ضرور ہے کہ بجائے خود اس کی پیروی پوری پوری کرتا رہوں، جس کا وحی کے ذریعے مجھ کو امر کیا گیا ہو۔ اور صبر کے ساتھ اپنے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ ہی کے فیصلہ کا انتظار کرتا رہوں کہ وہی ہر معاملہ میں ہر طرح بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (اتبع ما یوحی الیک واصبر حتی یحکم اللہ وھو خیر الحاکمین)

ہر ملک و ماحول کے مسلمانوں کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل و مشکلات کے حق میں سورۂ یونس کا یہ پورا آخری رکوع بجائے خود "خیر الحاکمین" کا کتنا خیر ہی خیر عملی فیصلہ ہے کہ بس ہر مسلمان اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی صلاحیت و وسعت کی حد تک ایک طرف اپنوں پرایوں سب کو "دین حق" والی فکری و عملی زندگی کے اوامر و نواہی کی تعلیم و تفہیم کرتا ہے اور دوسری طرف مقدور بھر خود پورا

پورا ان کا اتباع۔ اس کے بعد نتائج کو "خیر الحاکمین" پر چھوڑ کر انجام کا صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہے۔

مشہور آیت جو مدتوں مولویوں اور لیڈروں سب کی زبانوں پر بہت چڑھی رہی کہ "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم" اس کا مطلب یہ ہے کہ "ما بقوم" یعنی کسی قوم کے قومی حالات میں محض ظاہری تبدیلیوں یا تدبیروں سے کوئی انقلاب نہیں پیدا فرماتا جب تک وہ خود اپنے "ما بانفس" یا اپنی نفسیت و ذہنیت میں باطنی و قلبی انقلاب نہ برپا کرلے اور اس اندرونی و نفسی انقلاب بغیر کسی قوم پر جو مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے وہ نہ کسی اور تدبیر سے ٹالی جا سکتی ہے اور نہ خدا کے سوا کوئی دوسرا مدد کر سکتا ہے وان اراد اللہ بقوم سوءاً فلا مرد لہ وما لھم من دونہ من وال (رعد ۲)

مسلمانوں سے من حیث القوم بھی اسلام کی طرف سے جس بنیادی انقلاب کا مطالبہ ہے وہ سب سے مقدم "توحید الٰہ" کا یہی فکری و نظری انقلاب ہے کہ شخصی کی طرح دین و دنیا کے کسی چھوٹے بڑے قومی نفع و ضرر یا بناؤ بگاڑ کے کسی معاملہ میں کسی غیر اللہ کو مالک و مددگار بالذات قطعاً نہ بنایا جائے۔ حد یہ کہ جنگ بدر میں ہر طرح کی ظاہری بے سرو سامانیوں کے عالم میں پانچ ہزار خاص غیبی فرشتوں سے مدد فرمائی جاتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ تنبیہ بھی فرمادی جاتی ہے کہ فرشتوں سے تمہاری امداد کا یہ وعدہ محض تمہارے اطمینان قلب کیلئے ایک خوشخبری ہے ورنہ حقیقت میں تو بالذات مدد صرف زبردست قوت و حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے (وما النصر الا من عند اللہ

العزیز الحکیم۔)

انسان کا سب سے بڑا نفع وضرر شخصی و قومی سب ہی آخرت کی ابدی زندگی کا بناؤ بگاڑ ہے کہ وہی دنیا کی سفری و امتحانی زندگی کی آخری منزل و نتیجہ اور انسانیت کی تکمیل کا مقام ہے۔ پھر انسانیت کی اس تکمیل کو ختم نبوت کے بعد اب آخری طور پر حضرت خاتم النبیین (صلی اللہ علیہم اجمعین) ہی پر ایمان کے ساتھ قیامت تک کے لئے وابستہ فرما دیا گیا ہے۔ اس لئے بالفاظ دیگر انسانیت کا سب سے بڑا نفع وضرر رہتی دنیا تک براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نبوت ورسالت کی تصدیق و تکذیب میں منحصر ہو گیا ہے۔ پھر بھی خود آپ ہی کو اپنی زبان سے یہ دو ٹوک اقرار فرمانے کا حکم ہے کہ "کہدو کہ میں تمہارے حق میں کسی برائی بھلائی کا قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتا" (قل انی لا املك لكم ضراً ولا رشداً) دوسروں کی بھلائی برائی کا اختیار کیا ہوتا، جب خود اپنی ذات خاص سے متعلق بھی اس علانیہ اقرار کا حکم دیا گیا کہ "کہہ دو میں خود اپنے حق میں بھی کسی نفع وضرر یا سود و زیاں کا کوئی اختیار خدا کے چاہے بغیر بالکل نہیں رکھتا۔ (قل لا املك لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ) اور تو اور ایک طرف آپ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں، دوسری طرف اپنے محسن چچا کے معاملہ میں کیسی انتہائی بندگی و بے چارگی عجز و عبدیت کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے کہ جب ان کے آخری دم تک ایمان لانے کے لئے آپ تڑپتے رہتے ہیں تو آگاہی دی جاتی ہے کہ دیکھو محمدؐ تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ یہ تو اللہ ہی کا کام ہے کہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ انك لا تهدی من احببت

ولکن اللہ یھدی من یشاء۔

ایک اور بہت موٹی بات۔ جس کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کے اقرار و ایمان سے آدمی کھڑے کھڑے ایک منٹ میں کافر و مشرک سے مومن و موحد بن جاتا ہے کیا وہ کوئی جادو کی چھڑی ہے کہ مردہ کے پیروں کی طرف سے اٹھا کر سر کی طرف رکھ دیا اور مردہ زندہ ہو گیا۔ اصل میں یہ اقرار ذہنی و قلبی ایسے عظیم انقلاب کے ایمان و یقین کا عہد و اعلان ہے جس کے بعد نظر و فکر کی پوری دنیا الٹ جاتی ہے یعنی ہم دن رات کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ زمین سے لے کر آسمان تک کی ساری موجودات جمادات و نباتات اور حیوانات سب ہی کچھ نہ کچھ بظاہر اپنے خاص خاص خواص اور افعال و آثار رکھتی ہیں۔ اور انسان کے لئے بواسطہ یا بلاواسطہ کم و بیش ان تمام افعال و آثار میں قریب و بعید کوئی نہ کوئی نفع و ضرر کا پہلو ضرور ہوتا ہے لیکن الٰہ یا معبود کی توحید کے اس دعوئی کلمہ کا مطلب و مطالبہ یہ ہے کہ کوئی موجود و مخلوق بذات خود نہ کوئی خاصیت یا فعل و اثر رکھتی ہے اور نہ لازماً اس کے ہاتھ میں کسی کا کوئی نفع و ضرر ہے۔ اس لئے لا الٰہ الا اللہ یا لا معبود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا ہر غیر اللہ کی "الٰہیت" و معبودیت کی نفی کے معنی بالذات ہر غیر اللہ سے نفع و ضرر کی نفی و انکار اور صرف ایک اللہ ہی کے لئے اس کے اثبات کے ہیں۔ بالفاظِ دیگر لا الٰہ الا اللہ کے عہد و اقرار کا مطلب "لا نافع و لا ضار الا اللہ" ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کسی طرح کا نفع و ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ توحید الٰہ کا یہی وہ عظیم و بنیادی ذہنی و فکری انقلاب کا پیغام ہے جس کی بنا پر مسلمان ہونے کیلئے

اس کے لانے اور سنانے والے آخری پیغامبر یا رسول کے رسول ہونے" محمد رسول اللہ" پر ایمان لانے کو بھی کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کا جزلاینفک بنا دیا گیا۔

تو اب اس کلمہ یا پیغام کو قبول کرنے یا مومن و مسلمان ہونے کے معنی یہی ٹھہرے کہ مختلف چیزوں سے مختلف قسم کے افعال و آثار اور ان سے انسان کے حق میں طرح طرح کے نفع و ضرر کو ظاہر ہوتے جو گویا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جو نہیں دیکھتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، پانی آگ اور پیاس کو بجھاتا ہے، سانپ کے کاٹنے یا زہر سے آدمی مرتا ہے اور تریاق اس زہر یا ضرر کا توڑ کر کے موت سے بچا لیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مر کر سڑ گل جاتا یا جل بھن کر راکھ ہو جاتا ہے مگر اس چشم دید واقعہ کو غلط جان کر ماننے کو ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں ہر مرنے والا پھر جلایا جاتا اور اس سے اس کے نیک و بد اعمال کا محاسبہ ہوتا ہے جس کے مطابق اس کو جزا و سزا ملتی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہمارے حواس و محسوسات کی اس دنیا یا عالم اسباب کے پیچھے ایک اور عالم غیب یا ان دیکھی حقیقی دنیا ہے جس کا یہ ہماری آنکھوں دیکھی دنیا محض ایک ظلی و ظاہری رُخ ہے۔ اور ہم سایہ پر حقیقت کا دھوکا کھا رہے ہیں۔ کچھ ایسا ہی دھوکا جو ہماری یہی آنکھیں ہزاروں لاکھوں سال دیتی رہیں کہ جس زمین پر ہم چلتے پھرتے ہیں وہ ساکن ہے اور چاند سورج جیسا کہ ہم ان کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں متحرک ہیں۔ دراں حالیکہ نفس الامری حقیقت بالکل برعکس نکلی۔ یعنی جس کو ہم ساکن دیکھتے ہیں وہ درحقیقت متحرک ہے اور جس کو ہم آنکھوں سے متحرک دیکھتے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں ساکن۔

اس سے بھی بڑا اور بہت بڑا دھوکا وہ ہے جو ہماری یہی آنکھیں اور حواس ہم کو دن رات دیتے رہتے ہیں کہ کائنات کی مختلف موجودات سے جو ہم مختلف افعال و آثار پیدا ہوتے دیکھتے ہیں، ان کو پیدا کرنے والی کوئی قوت یا خاصیت خود ان موجودات کے اندر ایسی پائی جاتی ہے جس سے غیر منفک و ناگزیر طور پر وہی افعال و آثار پیدا ہو سکتے ہیں جو ہوتے ہیں[۱]۔ اسلامی توحید کی رو سے یہ بھی سراسر فریبِ نظر ہی ہے۔ ورنہ اصل واقعہ و حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سمٰوٰت و ارض کی ساری موجودات براہِ راست و بالذات صرف خدا کے "کن فیکونی" ارادہ و مشیت کی مخلوق ہیں، اسی طرح ان کے سارے افعال و آثار اور ان سے وابستہ تمام منافع و مضار کو بھی بلا شرکت غیرے براہِ راست خود خدا ہی پیدا کرتا رہتا ہے۔ یوں ہمارے عوام و خواص سب ہی زبان سے اجمالاً کہتے اور مانتے ہیں کہ خدا کے علم کے بغیر کوئی پتّی جنبش نہیں کر سکتی۔ ہمارے اطبا آج بھی اپنے نسخوں کو "ھوالشافی" سے شروع کرتے ہیں کہ حقیقۃً شفا بخشنے والا بذات خود اللہ ہی ہے نہ کہ کوئی نسخہ یا دوا۔ مگر شعوری و عملی طور پر اپنے نفع و ضرر کے معاملات سے خدا کو اسی طرح ہم بے دخل جانتے ہیں جس طرح کوئی منکر و مشرک۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے نفع و ضرر کے پیچھے بھی ہم بے دھڑک خدا کے موٹے موٹے اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام کو اس طرح توڑتے رہتے ہیں کہ گویا ان کے توڑے بغیر نہ ہم اپنے نفع کے کسی مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں نہ اس کے ضرر کو دفع کر سکتے ہیں۔

---

[۱] ان مباحث پر جدید فلسفہ و سائنس کی روشنی میں آخر کتاب میں مستقل ضمیمہ کی صورت میں نظر ڈالی گئی ہے۔

بلکہ ہماری نئی تعلیم والے مسلمانوں میں تو زیادہ پرستانہ نئی تعلیم کی بدولت یہ شرک صرف عملی ہی نہیں رہا اعتقاد تک کی خبر لے ڈالی ہے۔ ان کے تصور میں یہ کائنات بس خودکار مشین ہے جو اپنی اندرونی قوت اور پرزوں کی ساخت سے خود بخود چلتی رہتی ہے۔ خدا زیادہ سے زیادہ اس خودکار مشین کا بہت بڑا مشین ساز ہے جس کو اس مشین کے ایک مرتبہ بنا اور چلا دینے کے بعد نہ اس میں کسی مداخلت کی ضرورت رہی ہے اور نہ کرتا ہے۔ بس ایک بے تعلق تماشائی کی طرح معطل الگ بیٹھا اپنے اس مشین سازی کے کمال کا تماشہ دیکھتا رہتا ہے[له]، سبحانہ وتعالٰی عمایشرکون!

تو اسلام کا خدا جیسا کہ خود اسلام کی کتاب سے اوپر بہ اصرار و بہ تکرار معلوم و واضح ہو چکا کائنات سموات وارض کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ "قیوم السموٰت والارض" بھی ہے۔ یعنی زمین سے لے کر آسمانوں تک کی ساری موجودات نہ صرف اپنے وجود و خلق میں خدا کی محتاج تھیں، بلکہ اس وجود کے قیام و بقا اور اس کی کارکردگی کی ہر جنبش میں ہر آن بالکلیہ اس کی مشیت یا "کن فیکون" ارادہ کے تابع ہیں اور وہی خالق ہونے کے علاوہ ہر شے کا نگران ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں سارے آسمانوں اور زمین کے بست و کشاد کی کنجیاں ہیں۔ اللہ خالق کل شئ وھو علی کل شئ وکیل له مقالید السموٰت والارض۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے ان نو تعلیم یافتہ بھائیوں کے ذہن جن میں اب

له ان مباحث پر جدید فلسفہ و سائنس کی روشنی میں آخر کتاب میں مستقل ضمیمہ کی صورت میں نظر ڈالی گئی ہے۔

بہتیرے مسلمان کہنے کے بجائے اپنے کو "اسلام پسند" کہنا کہلانا پسند فرمانے لگے ہیں — سرے سے منکرِ خدا مادیت اور مادہ پرستانہ زندگی کے باہمی تعلق ہی کے بارے میں صاف نہیں ورنہ مادہ پرستانہ زندگی کے ساتھ معطل کیا سرے سے کسی موجود خدا ہی کا جوڑ نہیں لگایا جا سکتا۔ مادہ پرستانہ زندگی کے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری اس مادی یا دنیاوی زندگی کے انفرادی واجتماعی، سیاسی ومعاشی قومی وبین اقوامی معاملات اس مادی دنیا سے باہر کی کسی غیر مادی ماورائی یا خدائی مداخلت سے زیادہ سے زیادہ بلکہ سرے سے آزاد ہوں (نہ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال وحرام جائز وناجائز کے اوامر ونواہی کی پابندیاں قبول کریں) جو سرے سے منکرِ خدا پوری پکی مادیت ہی کی منطق کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے جس کی رو سے یہ کائنات وجود ہی میں ایک بالکلیہ مردہ اندھے بہرے گونگے، بے علم وارادہ مادہ سے آئی ہے[1]۔ اسلام کے حی وقیوم صاحبِ علم وارادہ خالق وخدا والے تصور کے معنی اس کے سوا کچھ اور ہی کیا سکتے ہیں کہ اس نے اس کائنات اور اس کے اندر انسان کو اپنے علم وارادہ یا مرضی ومشیت کے مطابق کسی نہ کسی معلوم مراد ومقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ لازماً اپنی اس مرضی ومقصد سے اپنی سب سے زیادہ صاحبِ علم وارادہ بااختیار وذمہ دار مخلوق انسان کو آگاہ کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی ہدایتی نظام بھی ضرور عطا کرنا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس ہدایتی نظام وانتظام کے موافق ومخالف زندگی کا انجام بھی ایک دوسرے سے مخالف ہی ہونا چاہیئے۔ یہ سب علیم وخبیر

---

[1] اس مادہ ومادیت کی حقیقت ضمیمہ میں معلوم ہوگی۔

حکیم وقدیر خدا کو ماننے کے ناگزیر منطقی لوازم ہیں۔

غرض یہ کہ مادہ پرستانہ یا من مانی خود پسندانہ زندگی کا پیوند اسلام کی دینی زندگی کے ساتھ کسی طرح لگانا ممکن نہیں۔ نہ اسلام کے ردو قبول کے درمیان منافقانہ کے سوا کوئی تیسرا مصالحانہ رویہ اختیار کرنا ممکن ہے۔ اس مصالحانہ راہ و رویہ کا مغالطہ سب سے زیادہ ہمارے مغربی تعلیم و تہذیب اور اس کے علوم و فنون اکتشافات و اختراعات سے مرعوب بھائیوں ہی کو ہے۔ وہ ایماناً و عملاً پورا پورا دینی مسلمان بننے کے بجائے زیادہ تر قولاً نسلی و قومی مسلمان یا "اسلام پسند" بنے رہتے ہی ہیں بزعم خود اسلام کے ردو قبول دونوں کے منافع و مصالح جمع کرنا چاہتے ہیں۔ سو ان حضرات کو ذرا کھلے دل و دماغ سے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ دین اسلام جس طرح ایک طرف دنیا کے ترک یا اس سے فرار کی راہ نہیں، اسی طرح دوسری طرف دنیا کے عیش و آرام اس کی زینت و آرائش اور رنگ رلیوں ـــ نام نہاد تمدن و ثقافت ـــ یا دنیا ہی دنیا کی خاطر سائنسی و صنعتی ایجادات کی بھرماروں کو بالذات مطلوب و مقصود بنانے کی بھی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔

اسلامی منطق کی راہِ آخرت

دنیاوی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی، تمدنی و تہذیبی، علمی و تعلیمی، سائنسی و صنعتی شعبوں سب کو بالکلیہ ویسے ہی بلکہ اس سے ہزاروں درجے بڑھ کر دین کے تابع و ماتحت رکھنا لازم ہے، جیسے ہم اپنے بچوں کی راحت و آرام کھیل کود تعلیم و تربیت سب کو تمام تر ان کے بچپن کے بعد آنے والے

طویل تر مستقبل کے تابع رکھنا ہی ان کے حق میں دانشمندی و خیر خواہی جانتے ہیں — ان کی زندگی کو بے روک ٹوک آزادی سے حاضر کی صرف طفلانہ خوشیوں اور خواہشوں کے حوالہ کر دینا ان کی صرف بدترین بدخواہی ہو گی۔ پھر اپنے اپنوں پرایوں سب کی اس سے بڑھ کر کوئی بدخواہی و بداندیشی کیا ہو گی کہ اپنے کو مسلمان کہہ کر بھی اس دنیا کی چند روزہ زندگی — وہ بھی ایسی غیر یقینی کہ یقین ایک روز کیا ایک پل کا نہیں — کبھی ختم نہ ہونے والی ابدی زندگی والے مستقبل کو اس طرح بے فکری و غفلت شعاری سے قربان کیا جائے کہ گویا اسلام کے خدا و رسول نے نہ اس پر ایمان و یقین کا کوئی مطالبہ کیا ہے اور نہ ہم اس پر اتنا بھی یقین رکھتے ہیں جتنا بچوں کے بچپن کے بعد جوانی اور بڑھاپے پر!

اصل میں ہمارے نیوں پرانوں عوام و خواص کا دین کی جان یوم دین یا آخرت کی ابدی زندگی پر ایمان و یقین کیا، کسی موثر درجہ میں اس کا احتمال تک نہیں رہا۔ اتنا بھی نہیں جتنا دنیاوی زندگی کے نفع و ضرر کے کسی احتمال کی صورت میں احتیاط کی اسلم راہ (Safest Couse) کو سب ہی سلامتی و دانشمندی کی راہ جانتے ہیں کیونکہ زیان و ضرر کے کسی احتمال سے بچاؤ کی صورت صرف یہی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی ایسے جنگل سے گذر رہے ہوں جس سے پہلے کبھی نہیں گزرے یا کسی تاریک غار میں داخل ہونا ناگزیر ہو رہا ہو اور کوئی عامی ان جانا راہ گیر جس کے سچے جھوٹے ہونے کا بھی کوئی علم و تجربہ ہم کو نہیں کہدے کہ اس جنگل میں آدم خور شیر یا زہریلے سانپ بہت ہیں تو ہم یقیناً عقلمندی و سلامتی اس میں جانیں گے کہ اگر کوئی دوسرا راستہ ہے تو اس جنگل کے راستہ کو سرے سے

چھوڑ دیں، یا اگر کسی وجہ و مجبوری سے اس سے گذرنا یا ان دیکھے غار میں داخل ہونا ہی ہے تو اس کے امکانی و احتمالی خطرات سے بچاؤ کی اپنی والی پوری احتیاط و اہتمام سے کام لیا جائے گا۔

پھر جس شخص کی سچائی کی کٹر سے کٹر جانی دشمن تک عمر بھر گواہی دیتے رہے ہوں وہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر ان ہی لوگوں سے پوچھتا ہو کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے جس کو تم نہیں دیکھ رہے ہو لیکن میں پہاڑی پر کھڑا ہونے کی وجہ سے دیکھ رہا ہوں تو کیا تم یقین کرو گے؟ ہم آواز جواب دیتے ہیں کہ کیوں نہیں ہم آپ کو ہمیشہ سے صادق و امین جانتے ہیں اور کبھی جھوٹا نہیں پایا! مگر یہی شخص جب موجودہ زندگی کے ان دیکھے یا غیبی مستقبل کی خبر دیتا ہے جس میں موت کے اندھے گڑھے کی راہ سے داخل ہونا ہر زندگی والے کے لئے ناگزیر ہے تو وہ فرعون کی قوم کے اس عامی مگر محتاط دانشمند کے اس دانشمندانہ احتمال تک سے کام نہیں لیتے کہ "اگر یہ شخص بفرض جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہے تو جو کچھ تم سے کہہ رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تم پر ضرور پڑ کر رہے گا"[1]۔

کچھ اسی طرح کا جواب حضرت علیؓ سے منقول کہیں پڑھا کہ کسی نے پوچھا کہ یہ مرنے کے بعد حشر و نشر حساب و کتاب، جنت و جہنم وغیرہ کی باتیں جو ہیں اگر

---

[1] قال رجل مومن من آل فرعون یکتم ایمانہ اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم بالبینات من ربکم وان یک کاذبا فعلیہ کذبہ وان یک صادقا یصبکم بعض الذی یعدکم (مومن ع ۳)

کچھ نہ نکلیں تو؟ آپ نے فرمایا کہ اگر نکلیں تو؟

خود کتاب اسلام میں زندگی کی صاف سیدھی شاہراہ (صراط مستقیم) کی طلبِ ہدایت کی درخواست پیش کرانے کے بعد ہی اس کتاب سے حصولِ ہدایت کی جو فکری و عملی بالکل منطقی و نفسیاتی پانچ شرطیں لگائی گئی ہیں ان میں ایمان سے بڑھ کر زور مستقبل کی ابدی زندگی یا آخرت کے ایقان پر دیا گیا ہے و بالآخرۃ ھم یوقنون۔ پھر پوری کتاب میں جتنا آگے بڑھتے اور پڑھتے چلے جا رہے ہیں سب سے زیادہ طرح طرح کی تعبیرات و تمثیلات سے تفہیم و تکرار آخرت کے مضمون کی ملتی چلی جائے گی حتیٰ کہ آخر کتاب کی بہت سی سورتوں یا ابواب کا مرکزی و عمودی مضمون و مفاد آخرت ہی آخرت ہے۔ بعض میں رکوع کے رکوع اور بعض پوری پوری لمبی سورتیں اسی مضمون پر ملیں گی۔ صرف کتاب اسلام کیا تمام آسمانی کتابوں کا خاص مفاد و مضمون یہی بتایا گیا ہے کہ "تم اس دنیا کی ناپائدار زندگی پر آخرت کو قربان کرتے رہتے ہو، حالانکہ ہمیشہ باقی رہنے والی اور بہترین زندگی آخرت ہی کی ہے اور یہی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام وغیرہ تمام انبیاء کی کتابوں کا نچوڑ رہا ہے۔ بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والآخرۃ خیر و ابقی ان ھذا لفی الصحف الاولی صحف ابراھیم و موسیٰ۔

نیز دنیوی زندگی کے لئے "الحیوۃ الدنیا" کی تعبیر جو اختیار فرمائی گئی ہے اس کے لفظی معنی ہی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کے پست ترین یا حد درجہ حقیر و خسیس ہونے کے ہیں۔ اس حقیقت کو ایک دو جگہ نہیں بار بار بیسیوں آیات میں دہرایا گیا ہے:-

"کیا تم نے اس دنیا کی (پست ترین) زندگی کو آخرت کے عوض پسند کر لیا ہے حالانکہ
دنیا کی بساط آخرت کے سامنے کچھ بھی نہیں ـــ أرضیتم بالحیوۃ الدنیا
من الاٰخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل (توبہ ع ۵) زندگی
تو بس آخرت کی زندگی ہے اس کے سامنے دنیا کی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ نہیں
کاش لوگ اتنی موٹی بات سمجھتے! ـــ وما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو و
لعب وان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون (عنکبوت ۶۴)

وہی بات کہ اگر کسی بچے کی زندگی سے اس کی جوانی اور بڑھاپے کے مستقبل کے نفع وضرر
کو خارج کر دیا جائے تو پھر وہ خالی طفلانہ کھیل کود کے سوا رہ ہی کیا جائے گی۔ علاوہ
بریں اس "پست ترین زندگی" (الحیوۃ الدنیا) کا جو بڑا سے بڑا سرمایہ سمجھا جاتا ہے
وہ آل و اولاد مال و دولت نام و نمود افراد و اقوام کی باہمی مسابقت و مقابلہ اور
اس پر فخر و مباہات ہی ہے نا۔ لیکن اس کا بھی اگر کوئی "خیر و ابقٰی" مآل و انجام
نہیں تو یہ بھی بچوں کا نہ سہی جوانوں اور بوڑھوں کے وقتی کھیل کود ہی کے سوا
کیا ہے۔ سورۂ حدید میں اس پر کیسی تنبیہ ہے کہ "خوب جان رکھو دنیا کی زندگی
نام ہی ہے کھیل کود و آرائش و نمائش اور اموال و اولاد وغیرہ پر باہمی تفاخر اور
ایک دوسرے سے نکل جانے کی جدوجہد کا ـــ اعلموا انما الحیوۃ الدنیا
لعب و لھو و زینۃ و تفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال والاولاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ـــ پھر اس کے بعد دنیوی زندگی کی چند روزہ رونق و سرسبزی کی ایک مثال دے کر
آگاہ فرمایا کہ جو لوگ اسی میں مر کھپ کر رہ گئے ان کو آخرت (کی ابدی زندگی) میں
شدید دکھ یا عذاب کا سامنا ہوگا ـــ وفی الاٰخرۃ عذاب شدید ـــ

بخلاف اس کے جن لوگوں نے اس فانی رونق وبہار پر جان دینے کے بجائے غیر فانی آخرت پر نظر کی وہ وہاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و بخشش کی دولتوں سے مالا مال ہوں گے جن کے مقابلہ میں یہاں کی یہ "پست زندگی" صرف ایک فریب ہی فریب ہے ـــ وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور ـــ لہذا جدوجہد یا مقابلہ و مسابقت کی چیز خدا کی رضا و مغفرت یا آخرت کی کامیاب زندگی و جنت ہی ہو سکتی ہے ـــ "سابقوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ . . ." ایک اور جگہ (عمران ع ۱۹) اس سراپا فریب دنیوی زندگی پر بالکل منطقی طور سے اس طرح چونکایا گیا کہ موت سے تو بہرحال کسی کو چارہ نہیں اور مرنے کی جزا و سزا کا معاملہ جو کچھ بھی ہوگا قدرۃً ہماری دنیوی زندگی کے اعمال و اقوال کے مطابق ہی ہونا چاہئے۔ سو جس نے دنیوی زندگی اخروی زندگی کی تیاری میں گزاری اور اس کی بدولت وہاں کی آتشِ عذاب سے بچ کر جنت میں جا پہنچا، بالا یقیناً اسی نے مارا ـــ کل نفس ذائقۃ الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامۃ فمن زحزح عن النار و ادخل الجنۃ فقد فاز وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

کہیں یوں ڈرایا کہ خدا و آخرت کے وہ منکر عذاب شدید کی تباہی و بربادی سے آگاہ رہیں جنھوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا ہی کی زندگی کو محبوب و مطلوب بنا رکھا ہے ـــ وویل للکافرین من عذاب شدید الذین یستحبون الحیوۃ الدنیا علی الاخرۃ (ابراہیم ع ۱) جس طرح ایک طرف خدا و آخرت کا انکار دنیا کی زندگی کو محبوب و مستحسن بنا دیتا ہے اسی طرح دوسری طرف دنیا کی آخرت فراموش محبت بھی (جو در اصل کفر ہی ہے) لازماً خدا کی ہدایت سے بھی محروم رکھتی اور دل و دماغ

آنکھ کان سب پر غفلت کی مہر لگا دی جاتی ہے ــــ ذلك بانهم استحبوا الحيوة الدنيا على الاخرة وان الله لا يهدى القوم الكافرين اولئك الذين طبع الله على قلوبهم وسمعهم وابصارهم اولئك هم الغافلون (نحل ع ۱۳)
آجکل کی ماڈرن دین بیزاری حد سے بڑھی ہوئی دنیا طلبی یا عشق دنیا ہی کا تو لازمہ ہے۔ حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔

دنیا کے جس جاہ و مال، نام نمائش، زینت و آرائش کے پیچھے ہم اپنی ابدالآباد کی اخروی زندگی تج دیتے ہیں وہ اسلام کے خدا کی نظر میں ایسی ہیچ و پوچ ہے کہ اگر اس کی ظاہر فریبی میں آکر سب ہی دنیا پرست نہ بن جاتے تو اللہ تعالیٰ سارے کافروں منکروں کو یہ چند روزہ پرفریب دنیا اتنی افراط سے دیدیتا کہ اپنے گھروں کے در و دیوار ساز و سامان فرنیچر وغیرہ سب سونے چاندی کا بنا لیتے کیونکہ آخرت کے مقابلے میں سونے چاندی کی اتنی بھرمار کی بساط بھی اس ناپائدار زندگی کے ایک ناپائیدار و خسیس سرمایہ کے سوا کیا ہے۔ باقی انجام و آخرت کی لازوال زندگی، سو وہ ظاہر ہے کہ دنیا کے جاہ و مال کی حرص و ہوس سے بچنے والے اہلِ تقویٰ ہی کا حق و حصہ ہو سکتی ہے ــــ ولولا ان يكون الناس امة واحدة لجعلنا لمن يكفر بالرحمن لبيوتهم سقفا من فضة ومعارج عليها يظهرون ۝ ولبيوتهم ابوابا وسررا عليها يتكئون ۝ وزخرفا وان كل ذلك لما متاع الحيوة الدنيا والاخرة عند ربك للمتقين (زخرف ع ۳) اسی طرح سورۂ آل عمران (ع ۲) میں ارشاد ہے کہ عورتیں آل و اولاد، سونا چاندی یا روپیہ پیسہ کی بہتات اور گھوڑے ہاتھی موٹر شوفر بنگلہ گملہ وغیرہ جو کچھ بھی دنیوی ساز و سامان یا مرغوبات ہماری

نظروں میں خوشنما بنا دیئے گئے ہیں، یہ سب کی سب ہیں بہر حال بس اسی ناپائیدار و حقیر زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ورنہ آخرت کی حقیقی و ابدی فوز و فلاح تو صرف اللہ ہی کے پاس پہنچ کر حاصل ہوگی۔ زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین و القناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب ۵

پورے قرآن کی ایک سو چودہ میں دو چار آیت کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی سورت کیا معنی ایک آیت بھی ایسی ڈھونڈھے نہ ملے گی جس میں آخرت سے جدا کرکے دنیا ہی دنیا کی سیاسیات و معاشیات، معاشرت و ثقافت، علوم و فنون، سائنس و فلسفہ وغیرہ کو بجائے خود مطلوب مقصود بنانے کی تعلیم و تحریص کیا ادنیٰ سے ادنیٰ تحسین و ترغیب بھی نکلتی ہو۔[1] لے دے کر ایک آیت دنیا پرستوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے — ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ — سو اولاً تو اس میں بھی "حسنہ دنیا" کا دامن "حسنہ آخرت" کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ دوسرے اس سے طلب دنیا کی تعلیم کا نتیجہ نکالنا تمامتر دنیا پرستوں کی خوش فہمی ہے۔ ورنہ مطلوب بذات دنیا نہیں، بلکہ آخرت کی طرح دنیا میں بھی مطلوب "حسنہ" ہی ہے اور دنیا اس حسنہ کا اسی طرح فقط ایک محل یا سفری راستہ ہے جس طرح آخرت اس کی آخری و مستقل منزل و محل۔ یعنی مطلوب خود دنیا نہیں بلکہ دنیا میں "حسنہ" یا نیکی اور بھلائی کی زندگی ہی مطلوب ہے۔

---

[1] باقی آخرت کے تابع دنیا تو عین مطلوب ہے۔ ورنہ دنیا اور اس میں انسان کا پیدا کرنا سب عبث ہوتا۔ اسی لئے رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کو بدعت و منافی اسلامیت قرار دیا گیا۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حضرت موسیٰؑ کی دعا ہے کہ "اے اللہ ہمارے لئے اس دنیا میں بھی حسنہ لکھ دیں اور آخرت میں بھی۔ اس دعا و درخواست کے قبول فرمانے کے لئے ہم آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں ـــــ واکتب لنا فی هذه الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة ـــــ انا هدنا الیك۔ آگے اس درخواست کے جواب ہی میں ارشاد ہے :-

"میں اپنا عذاب اس کو دیتا ہوں جس کو (بالکل ضروری) چاہتا ہوں۔ ورنہ میری رحمت تو اتنی ہمہ گیر و وسیع ہے کہ کوئی شے بھی اس سے باہر نہیں لہٰذا تمہاری حسنۂ دنیا و آخرت کی درخواست بھی ضرور منظور کروں گا (مگر) ایسے لوگوں کیلئے جو پرہیزگاری کی زندگی اختیار کرتے ہیں، زکات دیتے ہیں اور میری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

قال عذابی اصیب به من اشاء ورحمتی وسعت کل شیء فسأکتبها للذین یتقون و یؤتون الزکوة والذین هم بآیاتنا یؤمنون۔ (اعراف ع ١٩)

اس کے بعد دنیا و آخرت دونوں کی اس بھلائی (حسنہ) یا خیر و فلاح کے عطا فرمانے کی جو شرائط ہیں وہ بنی اسرائیل سے کہیں زیادہ ہم مسلمانوں کے لئے خصوصاً کان کھول کر سننے سنانے کی ہیں کہ اور

"وہ ایسے نبی امی رسول کی پیروی کرتے ہیں جس کو اپنی کتابوں توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جس کی صفت یہ ہے کہ ان کو نیک کاموں کا حکم دیتا اور برے کاموں سے روکتا ہے اور پاکیزہ

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل یأمرهم بالمعروف وینهٰهم

چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور گندہ چیزوں — عن المنکر ویحل لهم الطیبات

کو حرام ۔۔۔۔ پس جو لوگ اس رسول پر — ویحرم علیهم الخبٰئث ۔۔۔۔۔

ایمان لاتے اور اس کی حمایت و مدد کرتے اور — فالذین اٰمنوا به وعزروه و

(زندگی کی) اس روشنی میں چلتے ہیں جو اس کے ذریعہ — نصروه واتبعوا النور الذی

عطا فرمائی گئی ہے پس وہی دین و دنیا میں پوری — انزل معه اولئك هم المفلحون

پوری (حسنہ) فلاح و کامرانی پانے والے ہوں گے۔" (اعراف ع ۱۹)

ہم مسلمان جو اس "نبی امی" پر ایمان لانے ہی کی بنا پر اپنے کو "مسلمان" کہنے کہلانے کا کوئی حق رکھ سکتے ہیں اس کے لائے ہوئے دین کی کوئی اور حمایت نصرت الگ رہی کیا بجائے خود اس کی تعلیمات پر چلنے چلانے کا حق ادا کر رہے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر اس شرط کے ساتھ مشروط و موعود دین و دنیا کی بھلائی (حسنہ) اور فلاح کا بھی ہم کو کیا حق رہ جاتا ہے! اور اس سوال کا جواب کہ "مسلمان" ـــــ مسلمان رہ کر ـــــ کیا کریں؟ اس کے سوا کوئی دوسرا ممکن بھی ہے کہ جس رسول اور اس کے جس پیام پر ایمان لانے کے لئے ہم مدعی ہیں ایک طرف خود اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالیں اور دوسری طرف اس کے دشمنوں کے مقابلے میں تن من دھن کسی طرح سے اس کی نصرت و حمایت سے پیچھے نہ ہٹیں؟

غرض ان آیات کی بنا پر حسنۂ دنیا کو حسنۂ آخرت سے قطع نظر کرکے بذاتِ خود کسی درجہ میں مطلوب و مستحسن ٹھہرانا ان کی تفسیر نہیں، سراسر تحریف ہے۔ مفسر تھانویؒ نے اپنے خاص علمی و منطقی انداز میں اپنی تفسیر میں طرف و

مظروف یا حال و محل یعنی شے اور اس کی جگہ میں فرق نہ کرنے کے اس تحریفی مغالطہ پر خصوصیت سے تنبیہ فرمائی ہے کہ

"دنیا ظرفِ (یا محل) طلب ہے، خود مطلوب نہیں۔ بلکہ مطلوب خود حسنہ ہے
خلاصہ یہ کہ وہ لوگ اس کے طالب ہیں کہ ہم کو (آخرت کے ساتھ) دنیا میں بھی
وہ حالت جو آپ کے نزدیک مستحسن و پسندیدہ ہو عنایت کی جائے۔"

اور ظاہر ہے وہ حالت وہی ہو سکتی ہے جس سے آخرت کی حسنہ یا بھلائی میں فرق نہ پڑے تب ہی تو حسنۂ دنیا اس درخواست یا دعا کے ساتھ ساتھ ہی حسنۂ آخرت کی درخواست بھی کرائی گئی یعنی اس دعا کی رو سے دنیوی زندگی کی کوئی ایسی حالت بھلائی اور بہتری کی ہو ہی نہیں سکتی، جس میں اخروی زندگی کے صلاح و فساد یا بناؤ بگاڑ کو نظر انداز کیا گیا ہو، لہذا اسلامی نقطۂ نظر سے اس دنیا کی حسنہ بھی اس کے عند اللہ

"پسندیدہ اعمال حسنہ (ہی) ہیں۔ پس بالذات مطلوب بھی وہی ہوئے اور
دنیا کے جس قدر حصہ کو ان اعمال حسنہ میں دخل ہے خواہ وہ مال ہو یا صحت ہو
وہ البتہ اس حسنہ کے تابع ہو کر یا بالعرض یا بالغیر مطلوب ہو جائے گا۔"

وہی کہ دنیا کی زندگی کا کوئی بھی انفرادی و اجتماعی حصہ یا شعبہ بجائے خود دین کا مطلوب و مقصود قطعاً نہیں۔

"بخلاف اس وقت کی تعلیم و طرزِ عمل کے جس میں دنیا کا مطلوب بالذات اور
آخرت کو محض برائے نام قرار دے رکھا ہے حاشا و کلا اس کو آیت سے مَس بھی نہیں۔"

زیادہ سے زیادہ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ

"اگر طلب دنیا میں حرام وحلال کے حدود توڑے نہ جائیں تو اباحت کا حکم کر دیا جائیگا۔
لیکن مباح شرعی ہوتے سے مطلوب شرعی ہونا لازم نہیں آتا خوب سمجھ لو۔"

سبحان اللہ وماشاء اللہ! امت کے حکیم اور وقت کے مجدد کی کیا شان ہے! یعنی شریعت یا دین کی نگاہ میں دنیا کی کوئی چیز کسی حیثیت اور کسی درجہ میں بھی بالذات وبراہِ راست تو کسی طرح مطلوب ومامور ہے ہی نہیں۔ البتہ اگر شریعت کے احکام یا دین کے حدود وقیود کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر کوئی خالص دنیا یا نفس کی خواہش وخوشی بھی پوری کر لی جائے تو بہت سے بہت اس کو بس مباح یا جائز کہہ دیا جائیگا بالفاظِ دیگر اس پر کوئی مواخذہ یا بازپرس نہ ہوگی نہ کوئی جزا وسزا ہوگی۔ جزاء وسزا تو ثمر یا خمیازہ ہے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا وناراضی کا۔ یہ رضا وناراضی مرتب ہوتی ہے اس کے اوامر ونواہی پر۔ لیکن جس بات کا نہ اس نے کوئی امر فرمایا ہو نہ نہی اس سے لازماً نہ کسی جزا کا تعلق ہوگا نہ سزا کا۔

غرض جب خدا وآخرت سے قطع نظر کرکے دنیا یا اس کا کوئی کام کسی اعتبار سے دین کا مطلوب ہو ہی نہیں سکتی تو پھر دینی اعتبار سے وہ کوئی بھلائی یا "حسنہ" بھی کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ عجیب بات ہے سورۂ بقرہ کی آیت زیرِ بحث سے بالکل ملی ہوئی پہلی آیت ہی میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو آخرت سے غافل یا منکر ہونے کی بناء پر دنیا ہی دنیا کی عیش عشرت، عزت ودولت، سیاست وحکومت پر جان دیتے ہیں کہ ان کا آخرت میں قطعاً کوئی حصہ نہ ہوگا۔ فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق ـــ جس سے معلوم ہو گیا کہ کلام اللہ نری دنیا یا اس کی بھلائی کے لئے لفظ حسنہ کا استعمال تک پسند نہیں کرتا۔ ورنہ بظاہر ربنا اٰتنا فی

الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ" کا سیاق وتقابل یہی چاہتا تھا کہ اس سے بالکل متصل پہلی آیت "فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا" کے بعد بھی "حسنہ" کا لفظ ضرور ہو۔ لیکن دین و آخرت سے بے نیاز دنیا کے جاہ ومال وغیرہ کی کوئی بڑی سے بڑی ترقی بھی قرآن کی نظر میں چونکہ بھلائی یا حسنہ سرے سے ہو ہی نہیں سکتی اس لئے اس پر حسنہ کے لفظ کا اطلاق کیسے درست ہوتا۔ بس اصل بات جو تنبیہ کی تھی اسی پر متنبہ فرما دیا گیا کہ آخرت کو چھوڑ کر جو دنیا چاہتے ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ قطعاً نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ذرا تفکر وتدبر کی مناسبت وتوفیق میسر ہو تو "کلام اللہ" کا لفظ لفظ اللہ کا کلام ہونے کی گواہی دے گا۔

دنیا کو یوں تو ہمیشہ ہی کم وبیش ہر طرح کے اندرونی وبیرونی فتنوں سے دوچار رہنا پڑا ہے لیکن ادیان کی پوری تاریخ کسی ایسے دور سے قطعاً نا آشنا ہے جس میں دنیا کی زندگی سے دین یا آخرت کو نظری وعملی ہر لحاظ سے نکال پھینکنے کی اتنے وسیع ومنظم پیمانہ پر باقاعدہ دعوت وتبلیغ ہوتی ہو جتنی "جدید ترقی" کے نام سے آج کے جدید دور میں ——— ترقی کی ہی لے بڑھتے بڑھتے بیسویں صدی میں روسی اشتراکیت یا کمیونزم تک جا پہنچی ہے حتیٰ کہ اب کمیونزم ہی کی ڈنکے کی چوٹ لامذہبیت کی آواز بازگشت سکولرزم یا نامذہبیت کے نام سے ہر چہار طرف گونجنے لگی ہے اور جدید سیاست وحکومت والوں نے تو اس "نامذہبی" لامذہبیت کو اپنا عین دین ومذہب بنا لینا ہی سب سے بڑا پرفخر کارنامہ سمجھا ہے۔

دوسرے دین تو خیر سے رہ ہی محض نام کے دین گئے ہیں لیکن جو دین رہتی دنیا تک رہنے والا ہے اس کے اندر بھی باہر کا یہ فتنہ اس انتہا تک آ گھسا ہے کہ اچھے

بڑے بڑے اہل علم وصلاح حضرات غیر شعوری طور پر بھی یوم دین یا آخرت کا نام۔ خصوصًا ترقی والوں کے سامنے ۔۔۔ کھل کر لیتے جھجکتے ہیں۔ لمبی لمبی تقریریں تحریریں سننے پڑھنے چلے جاتے، اسلام کے نام سے سیاست وحکومت تعلیم وتمدن تہذیب وثقافت یا بہت سے بہت نام نہاد اخلاق وانسانیت کے مضامین پر زبان وقلم کا زور اس طرح ہوگا کہ گویا یہ بھی بالذات مقاصد دین ہیں۔ خدا وآخرت کا نام کچھ آتا بھی ہے تو دب، دبا اور گھوم گھما کر۔ لازمًا نفسیاتی اثر سننے والے دنیا طلبوں پر یہ ہوتا ہے کہ مقصود ومطلوب اسلام کا بس ہر پھر اس دنیا کی زندگی کو بہتر بنانا ہے ایسی ہی ذہنیت کا خود مسلمانوں کا سا نام رکھنے والوں تک موقع پا کر ایک موقع پرست طبقہ ابھر آیا ہے جو قرآن جیسی سراسر توحید اللہ وفلاح آخرت کی کتاب دعوت کو تحریفی کیا تمامتر افترائی تفسیر سے دنیا ہی کی دنیا دعوت کی کتاب بنا دینے پر تل گیا ہے۔

ایسے خالص موقع پرستوں، دنیا طلبوں سے قطع نظر ہمارے عام مسلمانوں کا بھی دین کی جان توحید اور آخرت پر ایمان اتنا بے جان ہو چکا ہے کہ نہ دنیا کے نفع وضرر یا برے بھلے کے معاملات میں وہ نہ خدا کی مشیت کا عملاً کوئی دخل جانتے ہیں اور نہ آخرت کی ابدی زندگی کے فلاح وخسران یا بناؤ بگاڑ کا یقین کیا کوئی ایسا موثر معتد بہ احتمال ہی رکھتے ہیں جو روزمرہ کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو بس یہی وہ ہمارا سب سے بڑا بنیادی فکری وایمانی بگاڑ ہے جس کے بغیر دین تو دین مسلمان کی دنیا بھی قطعًا نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ مسلمان کی دنیا کا دامن ہی اسلام نے توحید اللہ اور یوم آخرت پر ایمان بالغیب کے ساتھ اس طرح باندھ دیا ہے

کہ اگر وہ دنیا کی عملی زندگی میں ان سے کام نہیں لیتا تو پھر اور چاہے خالص دنیا کی بالفرض سیاسی و معاشی تعلیمی و تمدنی سائنسی و صنعتی ترقیوں کے آسمانوں ہی پر کیوں نہ اڑنے لگے۔ لیکن یہ مسلمان کی اسلامیت کی ترقی بہر حال نہ ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ دوسری نسلی و وطنی قومیتوں کی طرح مسلمان نام ایک بے نسل و بے وطن قوم و قومیت کی ترقی ہوگی۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی　　　　این رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

خدا و آخرت پر ایمان بالغیب ہی کا لازمی مطالبہ ایمان بالرسالت ہے جب یہ کائنات اور اس میں انسان ایک صاحب علم و ارادہ ذات یا خدا کا پیدا کردہ ہے، تو آپ سے آپ اس کے پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی معلوم یا جانی بوجھی مراد بھی ہوگی۔ نیز اس مراد و مقصد کا صحیح صحیح علم اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا ٹھیک ٹھیک قانون و رہنمائی بھی صرف وہی عطا کر سکتا ہے اور صرف اسی کو حق بھی ہوگا اسی کی رہنمائی کے بغیر نہ ہم سفر زندگی کی صراطِ مستقیم پا سکتے ہیں اور نہ اس کی آخری منزل (آخرت) یعنی انسان کے خصوصی انسانی مقصد آفرینش میں فلاح و کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

اس سہ گانہ فکری و ایمانی انقلاب کو عملاً برپا کرنے کیلئے عین فطرت انسانی کے مطابق ساتھ ساتھ دو ذہنی انقلاب ناگزیر ہیں۔ ایک علاقی دوسرا انفاقی بالفاظِ دیگر جاہی و مالی۔ آخرت تو آخرت دنیا کے انفرادی و اجتماعی قومی و بین اقوامی نسلی و لسانی حتی کہ فرقہ وارانہ یا نام نہاد مذہبی سارے فسادات کی جڑ جاہ و مال کی حرصی طلب ہے۔ یعنی جاہ و مال ہی کو زندگی کا مطلوب و مقصود ٹھہرا لینا ورنہ مذہب تو

دنیا کا گھٹیا سے گھٹیا بھی کوئی معلوم نہیں جو مال وجاہ کی حرص و ہوس کی تعلیم و ترغیب دیتا ہو۔

رہا اسلام تو اس نے اپنی کتاب میں ہدایت کی طلب و درخواست کی سات آیتوں (یا جملوں) کے ایجازی و اعجازی دیباچہ کے بعد ہی آغاز کتاب میں حصولِ ہدایت کے لئے کُل تین آیتوں میں جو پانچ بالکل فطری و عقلی شرطیں بیان کی ہیں ان میں عملاً دو — اقامت صلوٰۃ و انفاق — جاہ و مال ہی کی جڑ پر تیشہ لگاتی ہیں۔ حق پسندی و حق طلبی کی راہ مارنے اور ہر طرح کے انفرادی و اجتماعی فسادات پھیلانے میں ہمیشہ سب سے زیادہ حصہ جاہ و مال کی حرصی طلب و مقابلہ کا رہا ہے۔ پھر اب تو ماڈرن یا مغربی زندگی کی لائی اور پھیلائی ہوئی سکولرزم (زمانہ ہیبت) کی دعوت نے آخرت کو عملاً زندگی سے دیس نکالا ہی دیدیا ہے۔ ہر پھر کر دنیا ہی دنیا کے جاہی و مالی — چالو سکہ کی زبان میں سیاسی و معاشی — تفوق و برتری تکاثر و مسابقت ہی کا نام عین ترقی قرار پا گیا ہے۔ اس ترقی نے زمین پر فساد کے سامانوں کی ترقی کو کس آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اس میں "ہر مرد و عورت و بچہ" کو کتنا عظیم الشان حصہ ملا ہے! اس کا اندازہ ابھی ابھی اخبار (۱۳ جنوری ۶۲ء) ہاتھ میں آیا اس کی بمبئی سے ۱۰ جنوری کی چلی ہوئی ایک اطلاع سے ملاحظہ ہو:-

"پروفیسر پی ایم بلیکٹ نے جو برطانیہ کے ایک ایٹمی سائنسداں ہیں اور نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں، آج یہاں کہا کہ اگر صرف امریکہ کے ایٹمی ذخیرہ کو برابر برابر تقسیم کر دیا جائے تو بیس ٹن ڈائنامیٹ کی طاقت کی تباہ کاری دنیا کے ہر مرد و عورت اور بچہ کے حصہ میں آئیگی۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ امریکہ کے ایٹمی ذخیرہ میں تباہ کاری کی جو طاقت ہے، وہ

دوسری جنگِ عظیم میں تمام فریقوں کی طرف سے پانچ سال تک استعمال کئے ہوئے بموں سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔" انا للہ!

یہ تفوق و برتری یا قرآن کی زبان میں "علوفی الارض" کے ماڈرن میدان کے صرف ایک کیمپ یا فریق امریکہ کی جان لیوا ترقی کا سائنسی حساب ہے۔ دوسرا فریق روس اس میدان ترقی میں بڑھا ہی ہوا ہے۔ ورنہ ان پروفیسر صاحب ہی کی شہادت کی رو سے امریکہ سے کچھ کم تو بہر حال نہیں! لیکن علاج اس "تباہ کار ترقی" کا ہمارے سادہ لوح پروفیسر کے نزدیک بھی صرف مادی اسلحہ کا ترک ہے، نہ کہ اس کے مادہ تفوق و برتری کی مسابقتی ذہنیت کا!

اسلام جاہ و مال میں مقابلہ و مسابقت کی اس علو طلب و فساد انگیز ذہنیت کو سرے سے انسان کی حقیقی انسانیت کی ترقی یا ابدی فلاح آخرت کے مانع قرار دیتا ہے[1] اس علو طلبی یا احساس برتری کی ذہنیت کا جس نے شیطان کو شیطان بنا چھوڑا، کارگر توڑ یا اس کے جذبات کو قابو میں رکھنے کی تدبیر ایک ہی ہے کہ آدمی اپنے کو ایسی انتہائی عظمت و کبریائی والی ذات کے سامنے کھڑا پائے کہ خود اپنی کسی طرح کی نام نہاد یا عرفی بڑائی پر نظر پڑ بھی جائے تو ٹھہرنے نہ پائے۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے کھڑا ہو کر اپنی بلندی و برتری کا دعویٰ کس منہ سے کریگا۔ اسی طرح کسی بڑے با اقتدار جاہ و جلال والے بادشاہ کے عین دربار میں کانپتے تھراتے کھڑے رہ کر پہلو میں کھڑے اس کے کسی حقیر سے حقیر چوبدار کے ساتھ بھی تحقیر کا کوئی برتاؤ کرنے کی جرأت کسی بڑے سے بڑے امیر و وزیر کو بھی کتنی ہو گی۔ نماز کچھ بھی نماز ہو تو اس کی روح بندہ کی اپنے خالق و مالک کی بے پایاں عظمت و جلال کے

---

[1] تلک الدار الاٰخرۃ نجعلہا للذین لایریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین (قصص ع ۹)

آگے اپنی بے پایاں بندگی و عاجزی کے اظہار و استحضار کے سوا کیا ہے۔ تفوق و برتری یا جاہ طلبی کی حرص و ہوس ہی کی طرح مال کی حرصی طلب محبت بھی انسان کو حق و خیر کے دیکھنے سننے سے اندھا بہرا کر دیتی ہے بلکہ مال کی حرصی طلب کا منشا بھی اکثر مالی برتری کی راہوں سے جاہی برتری کی طلب ہوتی ہے۔ غرض ایک مال جاہ کیا دنیا کے کسی معاملہ میں بھی نفس و نفسانیت یا خود غرضی ـــــ خواہ وہ شخصی نہیں قومی و وطنی ہی ہو ـــــ کا غلبہ ہی حق بینی و خیر پسندی کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ ہے۔ اس خود غرضی یا لینے ہی لینے کی ذہنیت کو دینے ہی دینے کی ذہنیت پر زور دینے سے توڑا اور لین دین کے سارے معاملات کو اعتدال و انصاف کے حدود میں رکھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے ایک طرف اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ انفاق یا ایتائے زکوٰۃ کے حکم کو قریب قریب ہر جگہ لازم و ملزوم بنا دیا ہے دوسری طرف انفاق کے بجائے کسب اخذ یا دینے کی جگہ لینے پر زور کیا کہنا چاہیئے کہ اس کے حکم و امر کی پورے قرآن میں ایک آیت نہیں ملتی۔[1]

نہ قرآن و اسلام کی اصطلاح میں انفاق کو صرف مال یا لین دین کے معاملات میں ایثار و قربانی تک محدود رکھا گیا ہے بلکہ نفس انفاقی ذہنیت پیدا کر کے معاشرہ میں ہر طرح کی نفع رسانی کو عام کرنا ہے۔ البتہ مال سے انسان کو جان تک سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے، اسلئے خصوصی زور اس کے انفاق پر دیا گیا۔ ورنہ عموم میں تو ہر نیکی کو انفاق ہی کے ساتھ خود قرآن میں اتنا لازم و ملزوم ٹھہرا دیا گیا کہ "تم نیکی ہرگز کسی طرح پا ہی نہ سکو گے جب تک اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرتے رہو" (لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

---

[1] اس عظیم حقیقت کا انکشاف راقم ہذا کو "سلسلۂ تجدید" کی کتاب تجدید معاشیات کے لکھتے وقت ہوا جس میں اس حقیقت کی پوری تفصیل کی گئی ہے۔

مما تحبون) گویا خیر و نیکی یا نیک زندگی کی کلی حقیقت ہی یہ ہے کہ اپنی محبوب و مرغوب چیزوں سے بھی کام زیادہ تر دوسروں کی آرام یا نفع کا ایثار ہے۔ حدیث میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اسی حقیقت کو اس طرح کھول دیا گیا ہے کہ سب سے اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کی نفع رسانی میں لگا رہے (خیر الناس من ینفع الناس) لغت کی رُو سے بھی "بر" کے مفہوم میں خاص زور وسعت و عموم ہی پر ہے یعنی ہماری استطاعت و اختیار میں جو چیز بھی ایسی ہو جس سے دوسروں کو کسی طرح کا نفع پہنچایا اور ان کی راحت و مسرت کے کام میں لایا جا سکتا ہو اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔

انفاق کی اس کمّی و کیفی وسعت کا اندازہ لگانے کیلئے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اسلام کا یہ ایک ارشاد ہی کافی ہے کہ "ہر شخص کے ہر جوڑ بند یا عضو پر ہر سورج نکلنے والے دن یعنی روزانہ صدقہ واجب ہے" ظاہر ہے یہاں صدقہ سے مراد صرف مال یا روپیہ پیسہ کا خرچ کرنا نہیں ہو سکتا۔ اس کی ہر شخص کو ہر روز مقدرت ہی کہاں۔ اس لئے آگے چند مثالوں سے واضح فرما دیا گیا کہ دوسروں کو کسی نہ کسی قسم کا کوئی چھوٹا بڑا نفع پہنچانا یا ان کی خیر خواہی و ہمدردی کا کوئی کام کر دینا اسلام کی نظر میں سب صدقہ ہی صدقہ ہے۔ مثلاً

"دو شخصوں کے درمیان صلح کروا دینا بھی صدقہ ہے (حتی کہ) کسی کو سواری پر سوار کرانے میں مدد دینا یا اس کا سامان اٹھا دینا بھی صدقہ ہے (حدیہ کہ) کوئی اچھی بات کہہ یا بتلا دینا بھی صدقہ ہے۔۔۔۔ راستہ سے تکلیف کی چیز (کانٹا وغیرہ) ہٹا دینا بھی صدقہ ہے"۔

اس طرح اسلام نے اپنے کو مسلمان کہنے کہلانے والے ہر فرد پر انفاق یا خیرات و صدقات کا ہر روز جو مطالبہ عائد کر دیا ہے اس کا مطلب و مدعا یہی ہے کہ جان و مال وقت و

قوت کے تمام سرمایوں اور صلاحیتوں کو زندگی بھر اپنوں پرایوں حتیٰ کہ بے جان بے زبان راہ گیروں تک کیلئے حسب موقع و مقدرت برابر استعمال کرتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلمان وہ ہے جس کی سیرت و ذہنیت لینے سے زیادہ دینے کی، نفع اندوزی یا نفع رسانی کی، خود غرضی سے زیادہ ایثار و قربانی کی یا حقوق طلبی سے زیادہ فرائض شناسی کی ہو، نہ کہ جدید مادی تعلیم و تہذیب والوں کی جس نے قومی و وطنی سیاسی و معاشی، لونی و لسانی، جماعتی و طبقاتی خالص دنیا ہی دنیا کی مادی حقوق طلبیوں کے فتنوں فسادوں کا ساری زمین کو اکھاڑہ بنا دیا ہے۔

دنیا ہی دنیا کے ان انفرادی و اجتماعی، شخصی و قومی منافع و مقاصد پر مبنی کوئی کشمکش یا مقابلہ و مسابقت کی دوڑ ایسی زندگی والے معاشرہ میں پرورش ہی کیسے پا سکتی ہے جس کی نظر اس پوری زندگی کے کسی نیک و بد ابدی انجام پر ہو اور جس انجام کی خیر و فلاح کی ایک بڑی شرط ہی دنیا کی خود غرضانہ و نفس پرستانہ حرص و ہوس سے بچا بچا نا ہو (من یوق شح نفسہ فاولئک ہم المفلحون) اس سے بڑھ کر یہ کہ جس زندگی اور اس کی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کے متعلق تصور یہ ہو کہ وہ سرے سے اپنی ملک ہی نہیں بلکہ اپنے حقیقی خالق و مالک کی عطا و امانت ہیں ــــ جیسا کہ "ومما رزقنٰہم" سے واضح ہے ــــ وہ اصل مالک و معطی کی مرضی کے خلاف یا اس کی اجازت سے زیادہ اپنے ذاتی و نفسانی اغراض و مقاصد پر خرچ ہی کیسے کریگا۔ پھر اگر بظاہر و برائے نام کچھ مجازی یا مستعار ملکیت ہم کو انتظامی مصالح کے مد نظر اپنی جان و مال پر عطا بھی کر دی گئی ہے تو مسلمان ہونے کے ساتھ ہی وہ ہم کو اخروی و ابدی نجات و فلاح یا جنت کے معاوضہ میں خرید لی جا چکی ــــ ان اللّٰہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ" ــــ اس طرح جس چیز کو ہم بیچ چکے اس پر کسی طرح کے من مانے تصرف کا ہم کو حق کیا رہ گیا۔

اسلام کی لاریبی "کتابِ ہدایت" سے زندگی میں لاریبی و یقینی ہدایت یا روشنی حاصل کرنے کیلئے مفصلۂ بالا پنجگانہ عقلی و نقلی اصولی و کلی شرائط کو مختصراً پھر ایک مرتبہ ذہن کے سامنے کر لینا چاہئے کیونکہ ان کے بغیر نہ کوئی غیر مسلم اس کتاب کو بطور زندگی کے ہدایت نامہ کے قبول کر سکتا ہے اور نہ برائے نام قبول کرنے والے نام کے ہم مسلمان ان کو اپنی زندگی کا عملی دستور العمل بنائے بغیر "اولئك هم المفلحون" کے قطعی و حتمی وعدے کے سزاوار بن کر کامیاب مسلمان بن سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی شرط "ایمان بالغیب" ہے۔ دین کی بنیاد ہی تمام تر اس پر ہے کہ ہماری سامنے کی محسوسات و مشاہدات کی دنیا یا عالمِ شہادت کے ماورا ایک عالم غیب بھی ہے[1]
اب کوئی خوش فہم یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہمارے حواسی ادراکات یا ان ہی پر مبنی اور اس عالم شہادت ہی سے متعلق کچھ عقلی و استدلالی معلومات کے علاوہ ماضی اور مستقبل کے غیب میں سرے سے کچھ ہے ہی نہیں، یا ہم کو اس سے کوئی سروکار نہیں تو اس غیب یا اندھیرے میں کسی روشنی یا ہدایت کی ضرورت و طلب کا سوال ہی کیا رہا۔

۲۔ البتہ جو اس اندھیرے اور غیب کو محسوس کرتا ہے وہ اس کے کم از کم احتمالی خطرات سے بھی ڈرے گا اور ان سے بچنے کے لئے آپ سے آپ روشنی کا بھی طالب ہوگا۔ متقی کے لفظی معنی ہی ہیں "ڈرنے اور بچنے والے" کے۔ یعنی جو کسی خطرہ کو محسوس اور اس سے ڈر کر بچاؤ کی احتیاطی و اختیاری فکر و تدبیر کرتا ہے ——— ایسا متقی و محتاط ذہن لازماً اپنے کو انکار و استکبار سے محفوظ اور قبول حق کے لئے کھلا رکھے گا۔ یہی اس کے حق میں

---

[1] اس پر مفصلاً گفتگو ضمیمہ کے عنوان سے آخر کتاب میں ملے گی اور "مذہب و عملیات" کے نام سے ایک پرانے لکچر میں بھی۔ (شائع کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)

صلاحیتی ذہنیت ہوگی جو اس کو حق یابی کا طالب و ساعی بھی بنا دے گی۔ پھر ان شاء اللہ "الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" کا وہ خدائی وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ جو خدا کی طرف ایک بالشت بڑھتا ہے خدا اس کی طرف دو بالشت بڑھتا ہے۔ حد یہ کہ جو اس کی طرف چل کر جاتا ہے اس کی طرف وہ دوڑ کر آتا ہے۔ ہم ذرا اس کی طرف قدم اٹھا کر تو دیکھیں۔

۳ — اس قدم کا بڑا بلکہ کہنا چاہیئے کہ سب سے بڑا ثبوت انفاق یا انفاقی ذہنیت ہوگی، جو شخص بھی کسی خطرہ و ضرر سے بچنا یا کسی نفع و مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اس نفع و ضرر کی اہمیت کے مناسب اس کی راہ میں اپنی بساط بھر جان و مال وقت و قوت وغیرہ کسی قربانی کا کوئی قدم پیچھے کیسے ہٹا لے گا۔

۴ — اور راہ کی رہنمائی کرنے والے کو کیسے خود ہی تلاش نہ کرے گا چہ جائیکہ اُلٹے اس راہ کی طرف کوئی پکار رہا ہو "سمعنا منادیا ینادی للایمان ان اٰمنوا بربکم" تو وہ کیسے آمنا کہہ کر نہ دوڑ پڑے گا یہی "غیب" کے اندھیرے میں "بما انزل الیک وما انزل من قبلك" کی روشنی یا مکمل نظام رسالت پر اور لازماً رسول اسلام پر ایمان ہوگا۔

۵ — بالآخر "غیب" کے اس اندھیرے میں سب سے زیادہ نفع و ضرر اور خوف و خطر کا اندھیرا موت یا مستقبل و آخرت کا ہے اسلئے ہدایت طلب زندگی کیلئے آخرت پر ایمان سے بھی بڑھ کر ایقان کی شرط کا مطالبہ کیا گیا — وبالاٰخرۃ ھم یوقنون۔

ہدایت یابی کی ان ہی شرائط یا مقدمات خمسہ کو ایماناً و عملاً قبول و اختیار کرنے والوں کو اپنے رب کی راہ پر چلنے والا اور اس کے نتیجہ میں دین و دنیا کی فلاح و کامیابی کا حتمی یقین و اطمینان دلایا گیا۔ اولٰئك علی ھدی من ربھم واولٰئك ھم المفلحون۔

یاد رہے کہ جس طرح "ایمان بالغیب" کے جامع مطالبہ میں تمام ایمانی و اعتقادی

غیوب داخل ہیں اسی طرح "اقامت صلوٰۃ" اور "انفاق" کی شرط خدا اور بندہ کے عملی حقوق۔ عبادات و معاملات واخلاق اور معاشرت ـــ سب کو حاوی ہے۔ پھر پورے قرآن میں جگہ جگہ خالق و مخلوق کے ان عملی حقوق وفرائض کو عمل صالح سے تعبیر فرمایا گیا اور ہر جگہ ایمان کو عمل صالح کے ساتھ غیر منفک طور پر مقید یا لازم وملزوم قرار دیکر صرف دین و آخرت ہی کی کامل و یقینی نجات و فلاح کو اس پر منحصر نہیں ٹھیرایا گیا بلکہ دنیا کی انفرادی واجتماعی کامیابیوں کو بھی ایمان وعمل صالح کی جامع و توام زندگی ہی پر موعود و مرتب فرمایا گیا ہے۔ اور اس راقم نابکار کے نزدیک عین کتاب اللہ ہی کی نصوص وقطعیات کی روسے "مسلمان کیا کریں؟" کا جواب، اسلام کی طرف سے صرف ایک ہی ہے کہ یہ اکثریت و اقلیت، حاکمیت و محکومیت، غلبہ ومغلوبیت کے جس زمان ومکان میں جب جہاں کہیں ہوں، اس حال وماحول کے مطابق اپنے اختیار و وسعت بھر شخصی وانفرادی خانگی (گھریلو) واجتماعی "ایمان وعمل صالح" کی زندگی کا حق ادا کرتے رہیں، اسی سے اللہ تعالیٰ کی رضا و نصرت حاصل ہوگی۔ پھر یہی خدائی رضا و نصرت ہر حال و ماحول کے مناسب ہمارے مسائل و مشکلات کو حل کرنے والے ظاہری اسباب و وسائل بھی پیدا کرے گی نہ کہ غیروں کی بلکہ ان ہی کی بوزدنہ وار نقالی میں سارا زور محض ظاہری و مادی مساعی و تدابیر پر لگا دینا یہ تو سرے سے خدا چھوڑی اور توحید الٰہ کے بالکل بنیادی و ابتدائی مطالبہ کے منافی سراسر غیر اسلامی راہ و روشنی ہوگی۔ گویا خدا کی خدائی صرف آسمان تک محدود ہے۔ زمین یا دنیا کے نیک و بد میں اس کو کوئی دخل نہیں۔ تو مسلمان کو بھولنا نہ چاہئے (حالانکہ ہماری سب سے بڑی بھول یہی ہے) کہ اسلام وقرآن کا خدا آسمان ہی کا نہیں آسمان و زمین اور ان کے بیچ میں جو کچھ بھی ہے سب ہی کا وہی اور وہی خدا یا "الٰہ واحد" اور رب سب ہی کچھ ہے ـــ ان الٰھکم لواحد رب السمٰوٰت والارض وما بینھما ـــ وہی

اپنی حکمت و علم کے مطابق آسمان سے لے کر زمین تک کی پوری کائنات و کارخانہ کے پورے کاروبار کو چلاتا ہے ــــ ھوالذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ وھوالحکیم العلیم ـــــ یدبرالامر من السماء الی الارض۔

ہدایت یابی کی نفسیات و منطق کے ان پانچ اصول و مقدمات میں اصل الاصول و مقدم ترین "متقیانہ ایمان بالغیب" ہی ہے، اگر کوئی شخص اس عالم شہادت کے انتہائی ماضی و مستقبل میں سرے سے غیب ہی کا شعور و ادراک نہیں رکھتا یا دیدہ دانستہ اس سے اعراض و انکار ہے یا قولاً منکر نہ سہی عملاً اس غیب اور اندھیرے کے خطرات سے کسی موثر و معتد بہ احتمال کے درجہ میں بھی قطعاً بے پرواہ ہے تو اس نے تو اپنی انسانی فطرت ہی کا انکار اور اس کو مسخ کر کے اپنے دل و دماغ آنکھ کان سب پر ہدایت و حق کی طلب و یافت کے دروازے بند کر لئے اور "ختم اللہ علی قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ" کی خدائی "مغضوبیت" کا سزا یافتہ بن گیا ہے۔ یعنی جس طرح کسی غیب کے اندھیرے میں روشنی یا ہدایت کی جستجو اسی وقت ہوگی جبکہ ہم اس کو اس اندھیرے کے احساس کے ساتھ اس کے امکانی و احتمالی خطرات کا خوف اور ان سے بچاؤ کی فکر بھی ہو۔ "یومنون بالغیب" کے ساتھ "المتقین" کی قید کا مطلب یہی ہے۔ علیٰ ہذا "اولئک ھم المفلحون" کی ہدایت یاب اور لازماً فلاح یاب جماعت کے برعکس ہدایت و فلاح سے لابد محرومی بھی ایسی جماعت نے خود ہی اپنی قسمت بنالی ہے جو ہدایت یابی کے پہلے ہی قدم عالم شہادت پیچھے کسی عالم غیب کے وجود کا قولاً و عملاً کفر و انکار کر چکی اور ھم المفلحون کے وعدہ کے بجائے "لھم عذاب عظیم" کی مستحق بن گئی۔

ہدایت و ضلالت کے لحاظ سے کھلے کفر و ایمان والوں کی ان دو جماعتوں یا

تقسیموں کے علاوہ ایک تیسری تقسیم ایسے لوگوں کی نکلتی ہے جو دنیا ہی کے شخصی و قومی مفاد و مصلحت
یا محض کسی خاندانی و رسمی روایت و عادت کی بنا پر زبان سے تو اپنے کو خدا و آخرت سب ایمان
رکھنے والا کہتے جاتے ہیں لیکن دل یا عمل سے اس کی تصدیق کیا تکذیب و انکار ہی کرتے رہتے ہیں
ظاہر ہے کہ وہ بھی قطعاً مومن نہیں بلکہ اس دو رخے پن سے بندوں ہی کو نہیں گویا خدا کو بھی
دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر خود فریبی یا اپنے ہی کو دھوکا دینا ہے جس کو یہ بد عقل محسوس
تک نہیں کرتے۔ یہ حقیقت میں کھلے کفر کے مرض سے بھی بڑھ کر فساد پھیلانے والا مرض ہے
اس زمانہ میں خصوصاً یہ دورخی منافقانہ سیاست و صحافت سب ہی افساد فی الارض کی
سب سے بڑی وبا ہے ایسی وبا کہ اسلئے اسی کے عین اصلاح ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔
اس مرض نفاق کا ساتویں صدی میں جو نقشہ قرآن مجید نے دوسرے ہی رکوع میں کھینچا ہے
وہ آج بیسویں صدی میں کیسا آنکھوں کے سامنے ہے کہ جب ان نفاق کے مریضوں سے
کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ کہتے ہیں کہ واہ ہم
ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں، یاد رکھو کہ یہ درحقیقت
صلاح کے نام سے فساد ہی پھیلانے والے ہیں (لیکن اپنی منافقانہ
ذہنیت کی بدولت سمجھتے ہی نہیں بلکہ الٹے سچے ایمان والوں
ہی کو احمق بتاتے ہیں۔ حالانکہ خود ہی اتنے بڑے احمق ہیں
کہ اپنی حماقت کو محسوس بھی نہیں کرتے (اور یہ نفاق ان کی
اس حرکت ہی سے ظاہر ہے کہ) جیسے اہل ایمان سے ملتے
ہیں تو ایمان کی باتیں کرتے ہیں پھر جب اپنے شیطانی
لیڈروں کے پاس تخلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں

واذا قیل لهم لا تفسدوا فی
الارض قالوا انما نحن مصلحون
الا انهم هم المفسدون ولکن لا
یشعرون ۝ واذا قیل لهم امنوا
کما امن الناس قالوا انؤمن
کما امن السفهاء الا انهم هم
السفهاء ولکن لا یعلمون ۝ واذا
لقوا الذین امنوا قالوا امنا
واذا خلوا الی شیطینهم

قالوا انا معکم انما نحن	تو ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں باقی ان سے محض مذاق
مستھزؤن ٥ الله یستھزئ	کرتے ہیں (وہ کیا مذاق کرتے دراصل) اللہ تعالیٰ ہی
بھم و یمدھم فی طغیانھم	ان سے مذاق فرماتے اور ان کی سرکشی کی بدولت ڈھیل
یعمھون۔	دیتے چلے جاتے ہیں کہ وہ اسی میں سرگرداں رہیں۔

ان کی اس منافقانہ راہ وروش کا حاصل خود ان کے حق میں اس کے سوا کیا رہا کہ زبان وظاہر کی حد تک ہدایت کو قبول کر کے بھی اس کے بدلے میں ضلالت ہی کو خرید لیا۔ ایسا سودا نہ حقیقۃً ان کے حق میں سود مند رہا اور نہ وہ ہدایت یاب رہے

اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین۔

بس ہدایت وضلالت کے باب میں **کتابِ ہدایت** ہی کے خصوصاً ان نشان زد نشانیوں کے آئینہ میں آگے ذرا ہم مسلمان نام اس "بہترین امت" (خیر امۃ) کے اسلامی سراپا کا جائزہ لینا ہے جس کو تمام عالم کی ہدایت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور پھر اس کتابِ ہدایت ہی کے عطا فرمائے ہوئے نظامِ صلاح واصلاح کی روشنی ورہنمائی میں مسلمانوں کے مسلمان یا خیر امۃ بننے بنانے کی کچھ تفصیل پیش ہوگی۔

واللہ الموفق والمستعان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

"وَالْعَصْرِ ۝"

'عصر' کے معنی اور اس کا مفہوم

"عصر" کے معنی زمانہ یا وقت کے ہیں، عربی محاورہ میں اس کا مفہوم و تصور مرور و گذران یا چل چلاؤ کا ہے۔ گویا زمانہ خود اپنی اس داخلی حقیقت و تصور اور دن رات کے خارجی تجربات و مشاہدات ہی کی رو سے اس بات کی سراپا شہادت و ثبوت ہے کہ زمانہ کی کسی چیز میں ٹھہراؤ یا بقا و ثبات قطعاً نہیں، ہر شے پا در ہوا، آنی جانی اور فانی ہے، لہٰذا اُس انسان سے بڑھ کر کون نادان و خاسر اور زیان کار ہو گا جو اپنی زندگی جیسی بے بہا دولت اور اس کی ساری فرصت و قوت، صحت و طاقت، مال و ثروت کو ایسے چل چلاؤ والے ناپائیدار مقاصد و مشاغل میں لگا دے، جن کا نہ اس غیر یقینی زندگی میں حصول یقینی، اور کسی درجہ میں اگر حاصل

ہو بھی جائیں تو زندگی بھر ان کا بقا یقینی ہے، بفرض باقی بھی رہیں تو بیماری آزاری وغیرہ بیسیوں عوارض و موانع ایسے لگے رہتے ہیں کہ جی بھر کر ان سے متمتع و لطف اندوز نہیں ہونے دیتے، ہونے بھی دیں تو لطف اندوز ہونے والی یہ زندگی ہی اتنی ناپائیدار اور غیر یقینی ہے کہ یقین پل بھر کا نہیں۔

غلط نظریۂ حیات | اُن دانشمندوں کا کہنا ہی کیا جو کھُلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ موت مُنہ پھاڑے دانت نکالے ہر آن سامنے کھڑی ہے پھر بھی ان کے علم و دانش کا فتویٰ یہی ہو چکا ہے کہ زندگی بس یہی گنی چنی آنے جانے والی چند سانسوں کا نام ہے اور موت کے مُنہ میں چلے جانے کے بعد نہ اس زندگی کا کوئی انجام حاصل ہے نہ مطلب و مصرف؛ اس لئے اِن گنی چنی سانسوں ہی کو غنیمت جان کر جو کچھ سامنے دسترخوان پر آجائے جلدی جلدی ہاتھ مار کر پیٹ تک پہنچا دو یعنی وہی جو شیخ شیراز کے الفاظ میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ "خوردن برائے زیستن" کے آگے جب "زیستن" یا نفس زندگی کا کوئی مطلب و مدعا معلوم و متعین نہیں تو اس دور تسلسل کی منطق پر ایمان لانے سے چارہ ہی کیا کہ "کھانا جینے کے لئے ہے اور جینا پھر الٹ کر کھانے کے لئے" اور اسی اُلٹ پھیر میں پلٹے کھاتے کھاتے بالآخر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے جانوروں ہی کی طرح دیر سویر انسان نام "اعلیٰ درجہ کا حیوان" یا بڑھیا جانور (HIGHER ANIMAL) کا بھی مرتے چلے جانا۔

جانور تو غریب جانور رہے ہی اس کے اندر مستقبل کا کوئی شعوری سوال

ہی کہاں، غیر شعوری جبلی مشاغل کی زنجیروں میں بندھا کھاتا پیتا، جنتا جناتا، مرجاتا ہے لیکن انسان جس کی انسانی فطرت و نفس ہی میں حاضر و حال سے زیادہ مستقبل و مآل پر نظر اتنی جمادی گئی ہے کہ اس چند روزہ زندگی کو چند روز جان کر بھی اس کے "آج" سے زیادہ "کل" ہی کی فکر میں مرتا کھپتا رہتا ہے تو اس پوری زندگی کی "آج" کے "کل" یا انجام و عاقبت کے سوال سے غفلت و بے فکری کی "خود فراموشی" کو "خدا فراموشی" کی بالکل قدرتی و واجبی سزا کے سوا کیا کہا جائے، "نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ"، اور یہ بے فکری و بے حسی بلکہ سچ پوچھئے تو بے حیائی کی کچھ ایسی ہی ذہنیت ہے کہ ایک شخص جس کو پھانسی کا قطعی حکم ہو چکا ہے صرف دن اور وقت مقرر نہیں ہوا وہ اسی مہلت کو غنیمت پا کر جو کچھ کھانے پہننے نام و نمود کا جا و بیجا موقع مل رہا ہے، جلدی جلدی اس سے فائدہ اٹھا لینے کے سوا کچھ اور اس کو سوجھائی ہی نہیں دیتا، دل و دماغ ہے مگر اس سے سمجھتے نہیں، کان ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں، لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (۷، ۱۷۸)

اس اندھی بہری منطق و فلسفہ والی ذہنیت سے حجت کرنا تو بھینس کے آگے بین بجانا ہوگا البتہ سوال ان سے ہے جن کی انجام بین و دور اندیش انسانی فطرت کے اندر اس پوری زندگی کے مآل و مستقبل کا سوال کچھ زندہ ہے اور اُن سے بھی بڑھ کر اُن سے جن کے کان اور آنکھیں ایمان نے کھول دی ہیں اور جو اس سوال کے قطعی و

آخری جواب کو پا اور پا چکے ہیں کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی نقصان و خسران یا ٹوٹے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے کہ ایسی فانی اور بے ثبات زندگی کے بدلے جس کے بقا و ثبات کی ضمانت ایک لمحہ اور پل بھر کی بھی نہیں کی اور دی جا سکتی غیر فانی اور ابدی انجام و آخرت کی صلاح و فلاح کو دھڑا دھڑ بیچتے رہیں۔

صحیح تصورِ حیات | جس کو دنیا بھر کے سچوں سے سچا جان کر ہم آخرت کی ابدی زندگی کو مان چکے ہیں، اسی کو کس شد و مد سے سورۂ کہف کے آخر میں خصوصیت سے ان ہی اندھوں بہروں توحید و آخرت کے منکروں (اَلَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ وَکَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا (۱۰۱)) کو تنبہ و آگاہ کر دینے کا حکم ہوتا ہے کہ تم کو بتائیں ہم کہ زندگی کے سارے مشاغل و اعمال میں سب سے بڑھ کر زیان کا یا خسارہ اور گھاٹا اٹھانے والے کون ہیں؟ وہی جنھوں نے اپنی ساری جد و جہد اور سرگرمیوں کو اس ذلیل و حقیر زندگی میں گنوا دیا اور (خوش فہمی سے اُلٹے) سمجھتے رہے کہ بڑا پالا مارا، یہی تو ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں اور (قیامت) کے دن اس کا سامنا ہونے سے انکار کیا، جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ (آخرت کے لحاظ سے) اس دنیا کے ان کے کئے دھرے سارے کام غارت ہو کر رہ گئے، لہٰذا قیامت کے دن اُن کے لئے ان کاموں کی کوئی قیمت یا وزن ہمارے ہاں نہ ہوگا۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸: ۱۰۳ تا ۱۰۵)

مسلمان نام ہی "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" کے اسی اخروی انسانی خسران سے بچنے والے استثنائی سوداگر کا ہے یعنی اس سودے میں ہمہ گیر انسانی زیان و خسران گھاٹے اور نقصان سے بچ صرف وہی فرد و جماعت معاشرہ و ملت سکتی ہے جو ایمان و صلاح کی فکری و عملی زندگی قبول و اختیار کرلے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

انسانی خسران

توحید الٰہ اور ایقان آخرت کے انکار سے رونما ہوتا ہے!

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝

توحید اور ایقانِ آخرت ایمانوں کی اساس ہے

ایمان کی بڑی جڑ توحیدِ الٰہ اور ایقانِ آخرت ہے، رسالت وغیرہ کے ایمانیات انھیں دو کے لوازم و توابع ہیں، پھر انہی ایمانیات کی جڑوں سے اعمالِ صالحہ کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کے برگ و بار پھوٹتے اور پروان چڑھتے ہیں۔

لیکن توحید کی حقیقت کو ایسا گم کیا گیا ہے کہ جہلا و عوام بلکہ بہتیرے اچھے خاصے علما و خواص تک یہ سمجھتے سمجھاتے ہیں کہ خدا یا خالق عالم ایک ہی ہے، اس توحید کے مدعی تو قرآنی دعوتِ توحید کے اولین مخاطب عرب کے کٹر مشرکین تک تھے اُن سے

پوچھا جاتا کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ تو پورے یقین و قوت سے یہی کہتے تھے کہ اللہ (لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہ) اور بھی دنیا کی مشرک سے مشرک قوموں میں توحیدِ ذات کے منکر کم ہی ملیں گے، خود ہمارے ہندوستان میں جہاں الٰہ یا دیبی دیوتاؤں کی تعداد کروڑوں تک جاتی ہے توحیدِ ذات کے کیسے اونچے سے اونچے فلسفے موجود ہیں لیکن زندگی کا تعلق قدم قدم پر غیر اللہ ہی سے ہے۔

اسلام کے دعوتی کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے اقرار اور اس پر ایمان کا بالکل لفظی مطالبہ اللہ کے نہیں الٰہ کے واحد جاننے ماننے کا ہے کہ اللہ کے سوا الٰہ قطعاً کوئی دوسرا نہیں "لَآ اِلٰہَ" کے لفظی معنی جن و انس ملائکہ و انبیا حیوانات و جمادات زمین و آسمان کی ساری مخلوقات سے بلا استثنا کسی جاندار و بے جان فرد کے اِلٰہ ہونے کی کلیتہً نفی اور اِلَّا اللّٰہ کے معنی ایک اللہ ہی کے لئے "الٰہ" یا صفت "الٰہیت" کا بالکلیہ اثبات ہے۔

دو چار جگہ نہیں قرآن بھر میں بیسیوں جگہ بار بار اور مختلف عنوانات سے بہ تکرار اس دعوے اور دعوت پر اصرار ہے کہ الٰہ صرف ایک اللہ ہی ہے (اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ) ایک کے سوا کوئی بھی دوسرا الٰہ نہیں، وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اِلٰہٌ وَّاحِدٌ تمہارا الٰہ بالکلیہ بس ایک ہی ہے اِنَّمَا اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ زمین و آسمان وغیرہ ہر جگہ الٰہ وہی ہے، ھُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ۔ اور وہ تو اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وَھُوَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ سو جان رکھو اللہ کے

سوا کوئی بھی اِلٰہ نہیں، فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اللہ کے ساتھ کسی بھی دوسرے کو الٰہ مت بناؤ، لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ۔ اللہ کے سوا کون الٰہ ہے مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ متکلم مخاطب غائب ہر صیغہ میں اس توحید الٰہ کی حقیقت و دعوت کو دہرایا گیا ہے، یقیناً کوئی بھی اللہ نہیں، مگر میں ہی اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنَا، نہیں ہے کوئی بھی الٰہ مگر "تو" ہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ "ہرگز نہیں کوئی الٰہ نہیں مگر وہی" اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، سورۂ اعراف میں مختلف انبیاء علیہم السلام کی زبان سے فرداً فرداً اسی دعوے و دعوت کو دہرایا گیا کہ "اے میری قوم بندگی و پرستش بس صرف اللہ ہی کی کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا الٰہ نہیں، یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ اور سورہ کہف میں تو نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے کہلایا گیا کہ "یقیناً میں تمہارا جیسا بشر ہی ہوں البتہ مجھکو وحی کے ذریعے یہ علم و پیام ملتا ہے کہ تمہارا اِلٰہ صرف ایک ہی الٰہ ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ یعنی وحی و نبوت کا عطر و جوہر ہی توحید الٰہ کی تعلیم و تبلیغ ہے۔

اِلٰہ کا عرب میں بالکل وہی مفہوم و تصور تھا جو ہمارے ہندوستان میں دیوی دیوتا کا ہے یعنی ہر وہ جاندار اور بے جان چیز جس سے آدمی پوجا و پرستش یا بندگی و عبادت کا کوئی تعلق پیدا کرلیتا ہے اور عام طور پر "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا ترجمہ بھی یہی کیا جاتا ہے کہ "نہیں ہے کوئی معبود (یعنی پوجنے کے لائق) مگر اللہ" پھر بھی بزرگوں ان کی قبروں، تعزیوں وغیرہ سے مسلمان وہی تعلق و معاملہ رکھ کر جو غیر مسلم دیبی دیوتاؤں سے

رکھتے ہیں کہے اور سمجھے اپنے کو موحد ہی جانتے ہیں!

عبادت و پرستش کی حقیقت کسی کے سامنے اپنی انتہائی کمتری و ذلت یا بندگی و عبدیت کا اظہار ہے، یہ اظہار فطری طور پر بالعموم اسی کی عظمت کے سامنے کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں آدمی کوئی اپنا سود و زیاں فلاح و خسران یا نفع و ضرر دیکھتا ہے غیر اللہ کی "معبودیت" کے ابطال و نفی میں بندگی و پرستش کی اسی حقیقت کو ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے قرآن توحید کی مستقل دلیل قرار دیتا ہے:۔

کیا تم اللہ کے سوا ایسوں کی پوجا پرستش کرتے ہو	اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا
جو تم کو نہ کوئی ذرہ بھر نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔	يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ؕ اُفٍّ
تف ہے تم پر بھی اور ان پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ	لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
کے سوا، کیا اتنی (موٹی) بات بھی نہیں سمجھتے۔	اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۱ / ۶۶، ۶۷)

علت و معلول کے لزوم کا فلسفہ ختم ہو چکا

کچھ انتظامی اسباب و وسائط البتہ نفع و ضرر کے ظہور کے لئے بنا دیئے گئے ہیں جن کی تعبیر خود قرآن نے آیات یا علامات سے کی ہے یعنی یہ اسباب و وسائل بالذات مؤثر و علت نہیں بلکہ محض انتظامی علامات ہیں جس طرح ریل کا ہتھا (سگنل) گاڑی کے آنے جانے کی خالی انتظامی نشانی ہوتا ہے، اور گاڑی کا چلنا یا رکنا ڈرائیور کے ارادہ کے تابع ہوتا ہے، علت و معلول کے وجوب و لزوم یا جبر و ضرورت کا فلسفہ کی دنیا میں ہیوم و کانٹ کے ہاتھوں کہنا چاہیے کہ اٹھارہویں صدی ہی میں جنازہ نکل چکا تھا اور اب بیسویں صدی کے ربع اول میں

آئنسٹائن وغیرہ کے بعد سے سائنس کی دنیا میں بھی اس کو دفن ہی سمجھا جا رہا ہے۔ سر
آرتھر ایڈنگٹن جیسے اکابر سائنس کے الفاظ میں "علت و معلول کی قطعیت و کلیت کو
مادی دنیا سے ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا پڑا ہے" یعنی سائنس یا مادیت کی دنیا میں
ہزاروں سال سے جو یہ مسلم چلا آرہا تھا کہ اشیا یا علت میں بالذات کوئی نہ کوئی ایسی
قوت و خاصیت پائی جاتی ہے جس سے معلول کو لزوماً دواماً غیر منفک طور پر پیدا و
ظاہر ہوتا ہی چاہیئے یہ مسلمہ اب خود مادی و سائنسی تجربات کی رو سے غیر مسلم بن چکا ہے۔

ہر فعل واثر بالذات اور بلا شرکتِ غیر خدا ہی کے قبضہ میں ہے

لیکن مسلمان نہ فلسفہ و سائنس پر ایمان لانے والے کا
نام ہے نہ ہیوم وار ایڈنگٹن پر وہ تو اٹھارہویں صدی سے
بھی ہزار سال پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے جس قرآن پر ایمان لا چکا ہے
اور جس ایمان پر اس کو رہتی دنیا تک رہنا اور اسی پر مرنا ہے، اس کی رو سے مادی اور غیر
مادی کائنات سموات و ارض میں کہیں بھی کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اپنے کسی بھی فعل
اثر یا نفع و ضرر میں آزاد و مختار ہو، جس خالق نے اس کو پیدا کیا ہے وہی بالذات و
براہِ راست اس کی ہر ہر حرکت و سکون کا بھی خالق ہے اور یہ خالق جس طرح نئے
پرانے مادہ پرستوں کا اندھا بہرہ مردہ مادہ نہیں، اسی طرح فلسفیوں اور بہت سے
فلسفیانہ مذہبوں کا خدا یا انگلستان کا بے دست و پا بادشاہ بھی نہیں جس نے اپنی
مخلوق یا رعایا کو آزادی و خود مختاری دیکر خود کو معزول و معطل کر لیا ہو۔

غرض قرآن یا اسلام کی ابتدائی و بنیادی دعوت ہی کا یہ بالکل ابتدائی و

بنیادی لازمہ و مطالبہ ہے کہ ہم ہر چھوٹی بڑی چیز اور اس کے ہر چھوٹے بڑے فعل و اثر کو بالذات اور بلا شرکتِ غیرے تمام تر خدا ہی کے قبضہ و اختیار میں جانیں اور دیکھیں اور ظاہری اسباب و وسائل کو بس ظاہری یا انتظامی وسائط ہی یقین کرتے رہیں کسی غیر کو مالک و مختار متصرف ہرگز قرار نہ دیں مالکانہ اختیار جس کی شان یہ ہے کہ اس کے استعمال میں کوئی بھی دوسرا قطعاً کسی درجہ میں بھی مانع و مزاحم نہ ہو سکے، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل اور اسی کا حق ہے، اللہ کے سوا کوئی بڑے سے بڑا دوسرا مالکانہ اختیار و اقتدار کے ساتھ نہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے نہ ضرر۔

"بعد از خدا بزرگ توئی" علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر اسلام اور مسلمان کی نظر میں کون بڑا ہوگا مگر خود اپنی ذات تک کی نسبت خود آپ ہی سے اعلان کرایا گیا کہ "کہدو کہ میں خود اپنے لئے بھی کسی نفع و ضرر کا کوئی مالکانہ اختیار مطلق نہیں رکھتا (لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا) تا بدیگراں چہ رسد" تاہم دوسری جگہ دوسروں کے معاملہ میں بھی اسی قوت کے ساتھ اور آپ ہی کی زبان سے اقرار کرایا گیا کہ "کہدو تمہارے لئے بھی میں کسی برائی بھلائی کا مالک مطلقاً نہیں (لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا) رشد و ہدایت گمراہی و ضلالت سے بڑھ کر کون سا نفع و ضرر ہوگا کہ اسی پر بالکلیہ آخرت کی نہ ختم ہونے والی ابدی زندگی کی فلاح و خسران کا انحصار ہے پھر آپ کی بعثت تمام تر ہدایت کا نفع پہنچانے اور ضلالت کے ضرر سے بچانے ہی کے لئے تھی اور اب قیامت تک آپ ہی کی دعوت کے

ردو قبول یا آپ ہی کے تعلق و نسبت سے ہدایت و ضلالت کے سب سے بڑے نفع و ضرر کا ظہور ہوتا رہے گا، بااین ہمہ خود اس سرچشمۂ رشد و ہدایت کو مخاطب فرما کر کس قوت و شدت کے ساتھ آگاہ فرمایا جارہا ہے کہ "تمہارے اختیار میں بالکل نہیں کہ جس کو چاہو ہدایت دیدو یہ تو بس اللہ ہی کا کام ہے کہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۲۸/۵۶)

سورۂ یونس کے آخری رکوع میں دین کی اسی جوہری و بنیادی غیر مشکوک حقیقت کی خود حضور ہی کی زبانِ مبارک سے تفصیل فرمائی گئی ہے، بندگی و عبادت اور نفع و ضرر کے معاملہ میں استعانت کا تعلق کسی غیر اللہ سے قطعاً نہ رکھو، ارشاد ہے کہ کہدو اے لوگو اگر تم کو اس بارے میں کچھ شک و شبہ ہے کہ جو دین میں لایا ہوں اس کی حقیقت کیا ہے (یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ) تو سن لو کہ تم خدا کے سوا جن کی پرستش و بندگی یا پوجا کرتے ہو میں نہیں کرتا . . . . مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (۱۰/۱۰۷)

اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہ پکارو کہ وہ نہ تو تم کو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ ضرر، اگر تم نے ایسا کیا تو ایسی صورت میں تم یقیناً ظالموں میں سے ہوگے اگر خدا تم کو کوئی ضرر پہنچائے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اس کو دور کرنے والا ہرگز نہیں اور اگر وہ تمہارے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی اس مہربانی سے اس کو روکنے والا نہیں۔

پھر ذرا آگے :-

کہدو لوگوں سے کہ بس یہی (وہ غیر مشکوک دین) حق ہے	قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ
جو تمہارے پاس خود تمہارے پروردگار کے پاس سے	الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى
آگیا لہذا اب جو سیدھی راہ اختیار کریگا اپنے ہی	فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ
بھلے کیلئے کریگا جو گمراہی میں پڑے گا وہ بھی خود ہی	ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا
بھٹکے گا میں (یہ غیر مشکوک دین پیام پہنچانے کے بعد)	اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؀ (۱۰/۱۰۸)
بالکل ہی بری الذمہ ہوں۔	

سوچنے کی بات ہے کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا صرف چار لفظی جملہ کیا کوئی منتر ہے کہ ابھی منٹ بھر پہلے جو کافر ناری یعنی ابدی عذاب و جہنم کا مستوجب تھا وہ اس کے پڑھتے ہی مومن و ناجی یا ابدی نجات و جنت کا مستحق ہو گیا ضرور ہے کہ چار لفظوں سے مرکب اسلام کے اس دعوئ کلمہ کے اندر انسان سے اپنی ذہنیت یا فکر و نظر میں کسی بہت بڑے انقلاب کا مطالبہ کیا گیا ہو۔

انسان کی ساری زندگی جلب منفعت اور دفع مضرت کے درمیان متحرک ہے

آدمی کی ساری چھوٹی بڑی حرکات و سکنات دن رات کی ساری سرگرمیوں اور مشاغل کو جس طرح اور جس طرف سے چاہو الٹ پلٹ کر دیکھ لو اس کی پوری زندگی کے رقاص (پنڈلم) کو جلب منفعت اور دفع مضرت کے دو ہی لفظوں کے درمیان متحرک پاؤگے اور اس نفع و ضرر کو وہ اپنے جیسے انسانوں یا دوسری مردہ زندہ مخلوقات کی طرف منسوب کرتا کیا کھلی

آنکھوں اُن ہی کا فعل و اثر دیکھنا رہتا ہے، اسلام کی توحیدی دعوت کا اس کے بالکل برعکس مطالبہ ہے کہ جو تم دیکھتے ہو وہ سراسر باطل و غلط ہے اور صحیح و حق وہ ہے جو تم نہیں دیکھتے، یعنی ہر ادنیٰ و اعلیٰ مخلوق بذاتِ خود بالکل بے بس و بے اختیار ہے، ہر مخلوق کے فعل و اثر یا نفع و ضرر کا بھی واقعی خالق و فاعل وہی ذات و ارادہ ہے جو خود اس مخلوق کا کوئی شے بھی اپنے فعل و اثر میں بذاتِ خود علت ہرگز نہیں محض اس کے ظہور کا محل یا ظاہری و انتظامی واسطہ و علامت ہے اس کی ایک بہت اچھی مثال و نظیر خود عالمِ شہادت بلکہ خود ہماری ذات میں موجود ہے، تم اپنے ہاتھ سے کسی فقیر و سائل کو جب کچھ دیتے ہو تو دیکھتا تو وہ تمہارے ظاہر جسم یا ہاتھ کو ہے لیکن جانتا یہ ہے کہ دراصل دینے والے تم یا تمہارا ارادہ ہے جس نے اس ہاتھ کو حرکت دی اور جس کو براہِ راست آنکھوں سے وہ قطعاً نہیں دیکھ رہا ہے اگر یہ ارادہ جیب تک ہاتھ نہ لیجائے اور اس میں سے روپیہ پیسہ نکال کر فقیر تک ہاتھ کی حرکت کے ذریعہ پہنچانے کا ارادہ نہ ہو تو ہاتھ جیب اور پیسہ روپیہ کے سارے دکھائی دینے والے وسائل و اسباب موجود ہونے پر بھی کیا ایک پیسہ بھی فقیر یا حاجتمند تک پہنچ سکتا ہے، بس تمہارے دکھائی دینے والے ہاتھ کی محکومی کا جو تعلق تمہارے نہ دکھائی دینے یا چھپے ہوئے غیبی ارادہ سے ہے جو وہی مطالبہ اسلامی توحید اللہ کا ہے، کائنات کے سارے ظاہری واسطوں کو محض ظاہری اور محض انتظامی واسطہ جانو اور حقیقی فاعل یا نافع و ضار صرف اللہ تعالیٰ کے فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ اور يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ کے ارادہ و مشیت کو جانو۔

لا الٰہ کے اقرار کا ذہنی و خارجی اثر!

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ دراصل عہد و اقرار ہے اسی حقیقت کا کہ زمین و آسمان کے یہ سارے انتظامی وسائط و اسباب انسان کی خدمت و غلامی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ یہ کہ انہیں کو اُلٹے آقا و مخدوم معبود و مقصود بنا کر ان کی بندگی اور ان کے آگے سرافگندی میں لگ جائے، بندگی اور سرافگندی، طاعت و فرماں برداری، یا عبادت و عبدیت اسی ایک اور صرف ایک ذات الا اللہ کا حق ہے جو خود ہماری اور زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کی ذات و صفات افعال و آثار کی بلا شرکت غیرے بالذات خالق و مالک ہے۔

اس توحید الٰہ کا لازمہ ہے کہ آدمی کا ذہنی و خارجی فکری و عملی رویہ انفرادی و اجتماعی، معاشی و سیاسی زندگی کے ہر ہر شعبہ و زاویہ، کلیہ و جزئیہ میں یکسر منقلب اور مخلوق سے ہٹ اور کٹ کر بالکلیہ خالق سے مربوط و وابستہ ہو جائے، موت و زندگی بیماری و تندرستی، رزق و روزی، رنج و راحت، عزت و ذلت، فقر و غنا، ملک و مال، کسی چھوٹے بڑے معاملہ، کسی چھوٹے بڑے ضرر و نفع و منع و عطا کا مالک مختار یا دینے لینے بنانے بگاڑنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، لا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت۔

اس اقرار کی قوت

شجر و حجر، دریا و پہاڑ، آگ اور پانی، چاند اور سورج، زمین سے لیکر آسمان تک کونسی جاندار بے جان چھوٹی بڑی مخلوق ہے جس کے فعل و اثر میں آدمی اپنے لئے فائدہ و نقصان، نفع و ضرر کا کوئی نہ کوئی پہلو خود اپنے حواس سے علانیہ

محسوس و مشاہدہ نہیں کرتا رہتا اس لئے "لا الہ الا اللہ" کی توحید کی دعوت خالی کوئی لفظی منتر نہیں بلکہ دن رات کی گویا عینی یا حواسی شہادت کی یکسر تکذیب سے فکری و عملی انقلابِ عظیم کا مطالبہ ہے جس کا قدرتی و لازمی نتیجہ یہ ہوتا چاہیے کہ امید و بیم خوف و ہراس کا ہر قلبی و قالبی تعلق ہر مخلوق سے کٹ کر ہر ذات و صفت ہر فعل و اثر کے ایک اور صرف ایک خالق (اللہ خالق کل شیئ) سے جڑ جائے یہی توحید لا الہ الا اللہ کی بنیاد ہے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش | چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس | ہمیں است بنیاد توحید و بس

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے واقعات ہیں جو ہم یہ سنتے پڑھتے ہیں کہ نہ ان پر بڑے بڑے شاہوں اور شہنشاہوں کے جاہ و جلال کا رعب پڑتا تھا، نہ غنیم کی کثرت تعداد اور اسلحہ و آلات کی برتری سے ان کو ہراس ہوتا تھا نہ وہ دریا اور پہاڑ کے موانع کو خاطر میں لاتے تھے تو کیا ان کی یہ جرءت و بےباکی وقت کی بڑی بڑی فوجی و مادی طاقتوں سے مقابلہ میں توحید الٰہی کی ایمانی و روحانی طاقت کے سوا کسی اور چیز کا کرشمہ تھی انھوں نے لا الہ کا اقرار کر کے صرف خانہ کعبہ کا نہیں اس سے پہلے خانۂ دل یا ذہن و دماغ کے گھر سے خوف و رجا، ہوا و ہوس کے سارے "غیر اللہی" بتوں کو ایک ایک کر کے نکال باہر کیا تھا اور الا اللہ کے ایمان و اذعان کو ظاہر و باطن کے پورے وجود میں رچا، اللہ کے سوا کسی غیر کے ہاتھ میں کسی حقیر سے حقیر نفع و ضرر کو جان

اور دیکھ کر نہ استعانت وسوال کا ہاتھ اٹھتا تھا نہ بندگی و عبادت کا سر جھکتا تھا۔

کیسا کڑا ایمان و امتحان کہ ایک طرف ظاہری و تکوینی تدابیر و اسباب کو اختیار کرنے کا بھی امر و اجازت کہ ان کو عبث اور بے حکمت نہیں پیدا کیا گیا، دوسری طرف الا اللہ کا مطالبہ یہ کہ نظر اسباب پر نہیں مسبب الاسباب پر ہو اور دل کا شغلی و مستقل تعلق غیر اللہ سے نہیں، فقط ایک اللہ سے ہو "دل بیار و دست بکار" اب ہمارا عام حال بالکل برعکس، نظر تمام تر اسباب پر، دل دن رات الجھا ہوا خالی تدابیر میں اللہ کا نام محض زبان پر اور بہتوں کے وہ بھی نہیں اور بہتوں کا یہ حال کہ گویا

"وہ ایمان کے بالکل کنارے کھڑے رہ کر اس طرح خدا کی پرستش و عبادت کرتے ہیں کہ اگر کوئی دنیوی بھلائی یا نفع پہنچا تو اسی (ایمان پر) دل ٹھہرا یا مطمئن رہا اور اگر کوئی آزمائش پڑ گئی تو الٹے منہ پھر گئے (جس کی بدولت) دنیا و آخرت دونوں ہی کا خسارہ ہی خسارہ رہا۔ یہی کھلا ہوا خسارہ ہے کہ اب گھبرا کر اور اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکارنے (یا عملاً معبود بنانے) لگ جاتا ہے جو نہ کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ یہی تو انتہائی گمراہی کی بات ہے۔" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝

(الحج ۲)

ہمارے اہلِ علم و زہد بھی توحید کے معاملہ میں عملاً کمزور ہی ہیں	ان جاہلوں بدعتیوں کا ذکر نہیں جو پیر پرستی قبر پرستی وغیرہ کے کھلے کھلے بت پرستانہ و مشرکانہ حرکات و خرافات میں گرفتار

ہیں، ان کو بھی چھوڑیئے جو نماز روزہ تک کا بھول کر نام نہیں لیتے، ہم میں سے اچھے اچھے اہلِ علم صوم و صلوٰۃ ہی کے پابند نہیں، تہجد و اشراق اور اوراد و وظائف تک ہیں جن کے فرق نہیں آتا، وہ بھی مسجد و مصلّی سے باہر زندگی کے ہنگاموں اور جھمیلوں میں اپنے دلوں کو ذرا ٹٹول کر دیکھیں کہ دنیوی کاروبار، مالی و معاشی معاملات میں جو کمزوریاں دانستہ و علانیہ ہم سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں کیا اس کا منشا توحید اللہ کی اس کمزوری کے سوا کوئی دوسری چیز ہوتی ہے کہ "دست بکار" کے وقت "دل بیار" بہت کم کسی کا رہتا ہے۔ کہاں ربانی ایمان والوں کی یہ شان کہ عین میدان کارزار اور اُن کے گھمسان میں بھی اُن کے اندر کوئی کمزوری و بزدلی راہ نہیں پا سکتی (وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا) چہ جائیکہ عام دنیوی معاشی کاروبار یا تجارت وغیرہ کے ہنگاموں اور جھمیلوں میں "دل بیار" کے بجائے ۔ تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (۲۴ــــ۳۷) یادِ یار سے ایسی بے توجہی اور لاپرواہی ہو کہ وہ یار کی ناراضی و نافرمانی کو جان بوجھ کر بھرے بازار میں خریدتے ہوں۔

ہا! ہمارا روزہ نماز بھی کیسا بے جان ہو کر رہ گیا ہے کہ نہ روزہ سے روزمرہ کے معاملات میں تقویٰ پرہیزگاری کی زندگی پیدا ہوتی ہے اور نہ نماز فواحش و منکرات (تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ) سے باز رکھتی ہے۔ باز تو جب رکھے کہ وہ صحیح معنی میں

اللہ کی ایسی بڑی یاد ہو (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) جو زندگی کے ہنگاموں میں بھی قدم قدم پر اس کی رضا کی جویاں اور اس کی ناراضی سے ترساں رکھے، نہ کہ مالی وجاہی نفع وضرر کے ذرا ذرا سے مواقع وخطرات پر ہمارے دل دھڑکتے اور قدم پھسلتے رہیں، کہا کرتا ہوں کہ پورے اسلام اور اس کی پوری کتاب قرآن کا پورا جامع ومانع ایسا اعجازی خلاصہ جو کہ کلام الٰہی ہونے کے سوا اور کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، وہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور ان سات آیتوں کا بھی جان وجوہر درمیانی آیت (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) ہے، باقی سیاق وسباق سب اسی کی تمہید وتتمہ ہے اور اس ایک آیت کا مطلب عبادت واستعانت کے توحیدی انحصار واقرار یا وہی توحید اللہ کے سوا اور کیا ہے کہ ہم ہر طرح کے نفع وضرر کو بالکلیہ تیرے ہی قبضہ واقتدار میں جان کر صرف تیرے ہی آگے بندگی وعبادت کا سر جھکاتے اور سوال ومدد کا ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ نماز نماز نہیں (لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ) جب تک اس توحید کا دن میں ایک آدھ بار نہیں بیسیوں بار اقرار نہ کیا جائے۔ کیا یہ اقرار وتکرار صبح اٹھنے سے لیکر رات کے سونے تک جو ہم پر اس طرح فرض ہے کہ ہوش وحواس کے بقا کے ساتھ زندگی کے آخری لمحہ تک ایک دن کے لئے مہلت نہیں، محض اسی لئے ہے کہ مقررہ اوقات میں بس منتر کی طرح اس کو دہرا لیا جائے یا یہ بار بار کی تذکیر ویاددہانی کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کی جاہی ومالی معاشی اور کاروباری مشغولیتوں میں بھی ہم اپنے اس پیہم عہد واقرار کے تقاضوں کو نفع وضرر کے تمام موقعوں پر پورا کرتے رہیں؟ اور کیا ایسے لوگوں کی حکایت محض

حکایت اور قصہ گوئی کے لئے پیش کی گئی ہے جن کو بازار یا کاروبار کا انہماک بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتا؟ اور کیا حکایتی تعبیر کے علاوہ صاف صاف حکم و امر بھی سورۂ منافقون میں اسی کا نہیں دیا گیا کہ ایمان لانے والو (دیکھو ایمان لانے کا مطلب ولازمہ یہ ہے کہ) تم کو اموال واولاد وغیرہ کے دنیوی مشاغل خدا کی یاد (و اطاعت) سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو بھی ایسی غفلت میں پڑے گا (بالآخر) وہ سب کے سب خسارہ (یا ٹوٹے میں) پڑکر رہیں گے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹ع۱۳)

مفسر تھانوی علیہ الرحمہ نے بھی اس آیت کی تفسیر ہی نہیں تفسیری ترجمہ تک میں اموال واولاد سے پوری زندگی کے دنیوی مشاغل مراد لئے ہیں اور ذکر اللہ یا یادِ خدا سے خالی زبانی ذکر و یاد نہیں بلکہ ان دنیوی مشاغل میں خدا کے اوامر ونواہی کی فرمانبرداری یا اطاعت کی تصریح قوسین ہی میں فرمادی ہے۔ مطلب وہی کہ انسان کے دنیا و آخرت دونوں ہی میں زیان و خسران سے بچاؤ کی سب سے مقدم شرط تو ایمان ہی ہے۔

(اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اور ایمان بھی وہ زندہ ایمان جس کا شعور و احساس زندگی کے تمام فکری و عملی جزی و کلی ظاہری و باطنی انفرادی و اجتماعی معاملات میں اپنے تقاضوں کو پورا کراتا رہتا ہے۔

اس ایمان کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے جز توحید اللہ کی ایمانی

حقیقت اور پھر اس کے مقابلہ میں ہمارے اسی ایمان کے نیم جان و بے جان ہونے کی کچھ سرسری کیفیت اوپر مذکور ہو چکی اب آگے خسران سے بچانے والے اسی ایمان کے سب سے اہم جزء **ایمان بالآخرہ** کی حقیقت و کیفیت کا ذرا جائزہ لے دیکھئے!

خدا کا سائنسی اور فلسفیانہ تصور | خدا کا ایک تصور تو یہ ہے کہ کائنات اندھے بہرے مادے کی پیداوار نہیں اس کی خالق ایک دانا بینا ذات ہے لیکن اس کا کام بس پیدا کر کے ختم ہو گیا اس کے بعد کائنات اور انسان کے کاروبار سے پیدا کرنے والے کو کوئی سروکار نہیں، نہ تکوینی نہ تشریعی، سارا کارخانہ اپنے طبعی افعال و خواص کے تحت آپ ہی آپ چلتا رہتا ہے خدا کے اس تصور تک عقل و فلسفہ کے "استدلالیوں" اور وحی و نبوت کے منکروں (DIEST) کا پائے چوبیں بھی گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح بالعموم پہنچ ہی جاتا ہے، سائنس جس کی بنیاد ہی تمامتر مادہ و مادیت پہ تھی اس کی نظریں بھی بیسویں صدی تک آتے آتے خود مادہ ہی اتنا غیر مادی ہو چکا ہے کہ اب مشاہیر سائنس کو بھی یہی ماننا پڑ رہا جا رہا ہے کہ کائنات کا سرچشمہ بے ذہن و بے شعور مادہ نہیں بلکہ شعور و ادراک والی کوئی ذہنی ذات (MIND) ہے۔

اس تصور کے نقائص | لیکن خدا کا یہ فلسفیانہ یا سائنسی تصور حقیقت میں ذات بلا صفات کا تصور ہے یعنی نہ ہم کو یہ معلوم کہ اس ذاتِ خالق کی علاوہ خالق ہونے کے اور کیا صفات ہیں، یا جب کائنات کو اس نے جان بوجھ کر علم و ارادہ سے پیدا کیا ہے تو آخر اس سے اس کی معلوم متعین مراد کیا ہے، بے ذہن و بے شعور مادہ کو مبدأ تخلیق مان لینے

ہیں اور جو بھی اشکالات ہوں لیکن یہ سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا کہ پیدا کرنے والے کا مقصد کیا ہے۔

ایک اور نیم عقلی اور نیم مذہبی تصور

دوسرا نیم عقلی و نیم مذہبی تصور یہ ہے کہ نہیں خدا خالق ہونے کے علاوہ علم و قدرت ارادہ و مشیت وغیرہ دوسرے صفات و کمالات سے بھی متصف ہے اور کائنات و انسان کو اس نے جانے بوجھے یا معلوم و مخصوص مقصد و مدعا کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اپنی قدرت و مشیئت ہی سے اس نے مخلوقات کو ایسے طبعی خواص و قوی عطا کر دیئے ہیں کہ اب اس کو بالذات و براہِ راست مداخلت و نگرانی کی ضرورت نہیں، اسی طرح انسان کو عقل و اختیار عطا کرکے آزاد کر دیا ہے کہ اپنے اختیار تمیزی سے کام لیکر اپنے معاملات کو معقول و مناسب تدابیر سے جس طرح چاہے چلاتا رہے بلکہ اسی عقل و فکر یا بعض اور کشف وغیرہ کے روحانی و باطنی فطری و خلقی قوتوں ہی سے کام لیکر خود خدا کی ذات و صفات کی معرفت اور نیکی و بدی کا علم بھی وحی و نبوت کے واسطے کے بغیر ہی انسان حاصل کر سکتا ہے۔

مشرکانہ تصور

اسی سے ملتا جلتا تیسرا مشرکانہ تصور ہے جس میں بجائے طبعی خواص و قوی کے یا ان کے ساتھ ساتھ خود خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے ایسے نیم خدا درمیانی کارندے اور ایجنٹ لاتعداد دیبی دیوتا یا الدمان لئے گئے ہیں جو خالق و مخلوق کے مابین مؤثر وسائط و وسائل کا کام دیتے ہیں اور انسان نے اعتقاداً یا عملاً خدا سے ٹوٹ کر اپنے نفع و ضرر کا سارا رابطہ و رشتہ انھیں نیم خداؤں سے جوڑ لیا اور لازماً انھیں کی پوجا پاٹ یا عبادت و پرستش میں لگ گیا۔

خدا کا کامل و جامع تصوّر

خالقیت، ربوبیت اور قیومیت کی یک جہتی!

غرض یہ اور اسی طرح کے جتنے بھی خدا کے تصورات عقل یا وہم نے گڑھ رکھے ہیں لَآ اِلٰہَ کی اس کامل اسلامی توحید کے سب ہی منافی ہیں جس میں زمین و آسمان کی ہر مادی و روحانی جان دار و بے جان مخلوق سے اللہ بالفاظِ دیگر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نفع یا ضرر یا فعل و اثر کے مالک ہونے کی یک قلم نفی فرما کر اِلَّا اللّٰہ سے اس کا اثبات بالکلیہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے فرما دیا گیا جس کی رو سے کائنات اور انسان اپنے وجود اور پیدائش ہی میں نہیں بلکہ اپنے بقا و قیام کے ہر ہر کام میں اپنے خالق ہی نہیں اپنے رب و قیوم خدا کا ہر ہر آن دست نگر و محتاج ہے یہی وہ مختصراً توحید الٰہ ہے جس کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے اور جس پر ایمان و عمل ہر غیر اللہ کے آستانے سے اس کی امید و بیم بندگی و نیازمندی کا سر اٹھا کر ایک اور صرف ایک در کا دریوزہ گر یا بھکاری بنا دیتی ہے۔

علم و حکمتِ کاملہ

اس کے بعد انسان کے لئے سب سے بڑھ کر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس کی اور کائنات کی پیدا کرنے والی یہ کامل الصفات علیم و حکیم ذات عبث کار بہرحال نہیں تصور کی جا سکتی نہ اس نے زمین و آسمان کی اَن گنت گوناگوں موجودات اور انسان جیسی ذہنی کمالات والی ذات کو بیکار و بے نتیجہ پیدا فرمایا ہوگا نہ ایک مرتبہ کور و کر مادہ کے بجائے کسی علم و ارادہ والی ذات کو خالقِ عالم تسلیم کر لینے کی منطق میں یہ بات

کس طرح سما سکتی ہے کہ علم وارادہ سے وجود میں آنے والی کسی حقیر سے حقیر چیز کی بھی کوئی متعین ومعلوم مراد نہ ہو، پاگلوں کے سوا کسی معمولی عقل والے انسان سے بھی بے معنیٰ فضول کاری کو عقل جائز نہیں رکھتی، چہ جائیکہ جس کی قدرت وحکمت علم وارادہ نے اتنی عظیم الشان کائنات اور ایسی عجیب وغریب صفات وکمالات والے انسان کو پیدا فرمایا اس نے اس کائنات کے اس عظیم الشان کارخانے کو فضول وعبث یا لہو ولعب کے طور پر برپا کر رکھا ہو۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ (۲۱/۱۶) ہم نے زمین وآسمان کو کھیل کود کے طور پر نہیں پیدا کیا ہے۔

زمین وآسمان اور خود اپنی پیدائش پر غور کرنے والا انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ نہیں

"ہمارے پروردگار تونے یہ سب باطل وبیکار ہرگز نہیں پیدا فرمایا ہے (تیری پروردگاری یا ربوبیت کے یہ کیسے شایانِ شان ہوگا کہ کوئی چیز بھی مہمل پیدا فرمائے) سو ہم کو بچا کہ (ایسے احمقانہ خیال میں پڑ کر ہم) جہنم کی سزا کے سزاوار ہو جائیں۔"

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (۳/۱۹۱)

اور ایسے ہی احمقوں کو دوسری جگہ متنبہ فرمایا:۔

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل وفضول پیدا کر دیا ہے جس میں کوئی حکمت نہیں اور ہمارے پاس تم کو لوٹ کر آنا نہیں سو (خوب جان لو) کہ بادشاہِ

حق و حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی ذات اس سے اعلیٰ و ارفع ہے (کہ کوئی لا یعنی یا بے حکمت کام کرے)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى

اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۔ (۲۳ / ۱۱۵، ۱۱۶)

کائنات کا ماضی و مستقبل دونوں حکمت و مشیتِ الٰہی کے ماتحت ہیں

جس طرح ماضی کی طرف کائنات و انسان کی ابتدائی ایجاد و تخلیق ایک سراپا علم و حکمت ارادہ و مشیت کے تحت ہوئی ہے اسی طرح ضرور ہے کہ مستقبل کی طرف بھی اسی حکیمانہ علم و ارادہ ہی کے موافق اس ایجاد و آفرینش کی کوئی انتہائی حکیمانہ غرض و غایت بھی ہو اور انسان کو کائنات میں تصرف کی جو قوت و اختیار عطا کیا گیا ہے اس کا مقصد آفرینش کے نقطۂ نظر سے جا و بیجا استعمال کرنے پر، عطا کرنے والے کی طرف سے بازپرس یا حساب و کتاب بھی ہو اور اس حساب و کتاب کے موافق جزا و سزا کا کوئی انجام بھی انسان و انسانیت کے اسی انجام کار کو کتاب اسلام میں یوم دین (بدلہ کا دن) یوم الفصل یوم آخرت وغیرہ کی مختلف حیثیات و عنوانات سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس یوم دین کو ملائے بغیر نہ خدا کی ذات و صفات ہی کا تصور صحیح یا کامل رہتا ہے نہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانے کی موجودات اور اس کے اندر انسان کے وجود ہی کے کوئی معنی نکلتے ہیں، نہ خالق و مخلوق میں کوئی تعلق پیدا ہوتا ہے اور نہ دنیا پرستی کے مقابلہ میں خدا پرستی یا دینداری کی کوئی زندگی رونما ہو سکتی ہے اگر خدا اپنی جگہ پر ہے بھی اور اس دنیا اور ہم کو پیدا بھی اسی نے کیا ہے لیکن نہ دنیا کی اس زندگی کے دوران میں

خدا کی مرضی و مشیت کو ہمارے کاروبار میں کوئی دخل ہے اور نہ مستقبل میں ہماری اس زندگی کا کوئی مآل کار یا انجام و آخرت ہے اور سب سے اول و آخر یہ کہ نہ اس انجام و آخرت کے نیک و بد ہونے کے لئے ہم کو موجودہ زندگی میں نیک و بد افکار و عقائد افعال و اعمال کا خدا کی طرف سے کوئی محفوظ و مستند دستور و نظام دیا گیا ہے (جس کا نام ایمان بالرسالت ہے) نہ خدا کی طرف سے اس نظام و دستور کے مطابق زندگی گذارنے کا کوئی مطالبہ ہے اور نہ اس مطالبہ کی بنا پر آئندہ کوئی مواخذہ، تو ظاہر ہے کہ ایسے بڑے خالق خدا سے دنیا کی زندگی و معاملات میں کوئی خدا پرستانہ تعلق یا وابستگی رکھنے کا کوئی محرک و مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے زیادہ سے زیادہ خود اپنے ذہن و دماغ کی مخلوق ایسے خالق خدا کے فلسفیانہ تصور سے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے بس کچھ فلسفیانہ یا ذہنی و دماغی لذت و عیاشی کا کام لے سکتے ہیں جو آرام کرسی سے اٹھتے اور عملی زندگی میں داخل ہوتے ہی کافور ہو جاتی ہے۔

عاقبت اندیشی انسانی عقل و طبیعت کا لازمہ ہے آدمی طبعاً و عقلاً عاقبت اندیش واقع ہوا ہے وہ اپنی زندگی کے آج سے زیادہ کل میں اور حاضر کے واقعات سے زیادہ مستقبل کی امیدوں اور تمناؤں میں گذارتا ہے، حال سے زیادہ اس کی نظر مآل پر رہتی ہے، دیرپا و دوررس حقیقی نفع و ضرر سے جاہل و غافل ہونا یا وقتی جذبات سے مغلوب ہو جانا اور بات ہے ورنہ انسان کی عقلی فطرت ہمیشہ عاجل یا گریز پا رنج و راحت نفع و ضرر کا آجل یا دیرپا سے مقابلہ و موازنہ کر کے ہی عملی زندگی کا کوئی قدم اٹھاتی ہے، یہ خردمندی نہیں محض

شاعری ہے کہ "نقد را بہ نسیہ گزاشتن کار خردمنداں نیست" جس کا جی چاہے اپنے آج یا حاضر کے اعمال و مشاغل کا جائزہ لے کر دیکھ لے کہ وہ کتنے اس اجتماعی مستقبل یا کل کے نسیہ کے لئے ہوتے ہیں جس کے آنے تک خود ہمارا رہنا بھی یقینی نہیں ہوتا اور کتنے آج کے "نقد" کے لئے ہوتے ہیں جس میں ہم بہت زیادہ پریشانیاں کل ہی کی فکر کے لئے اٹھاتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کے ذہنی بہی کھاتے میں نقد سے زیادہ نسیہ یا ادھار ہی کا حساب کتاب ملے گا۔

اسی لئے دینِ فطرت میں "آج" سے زیادہ "کل" کے ایقان کا مطالبہ ہے	تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ اس پوری دنیوی زندگی کے آج کے مقابل میں جس اخروی زندگی

یا کل پر اسلام کا دعویٰ کرنے والوں سے کتاب اسلام کی ابتدا ہی میں ایمان ہی نہیں ایقان کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ "وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ" اس کا اگر احتمال بھی کسی معتد بہ درجہ میں ہمارے اندر زندہ و تازہ رہے تو اس خدا سے ہمارے تعلق کا کیا عالم ہوگا جس کی اس دنیا کے نفع و ضرر میں مالکانہ کارفرمائی کے درمیان تو کچھ نہ کچھ ظاہری درمیانی حجابات حائل بھی ہیں لیکن آخرت کا جو دن آنے والا ہے اس میں تو یہ سارے درمیانی حجابات ایک ایک اٹھ کر اس سوال کا کہ "آج" کھلی آنکھوں کے سامنے ملک و مالکیت کا بلا شرکتِ غیرے پورا کا پورا اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ (لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ) کا ہر مومن و منکر کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوگا کہ اکیلے ایک اور صرف خدائے قاہر و غالب ہی کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہے (لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ)

"وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ" والے کامل ایقان واذعان کو جانے دیجیے معتدبہ احتمال صورت ہی میں اس "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" والے دیرپا ہی نہیں ابدی دن کے نفع وضرر بناؤ بگاڑ کو مدنظر رکھے بغیر دنیوی زندگی کے کسی انفرادی واجتماعی شعبہ کا کوئی قدم اٹھانا بھی دانشمندانہ یا آسان ہوگا؟ معتدبہ یا قوی احتمال بھی الگ رہا کسی شدید خطرہ کے خفیف سے خفیف اندیشہ کو بھی کون دانشمند خوشی خوشی خریدنے کو تیار ہوگا۔ مفدور بھر بچنے ہی کی کوشش کرے گا۔

اب ہم مسلمان جن کی خصوصیت یوم آخرت پر ایمان ہی نہیں "ایقان" قرار دی گئی ہے ذرا اپنی اپنی زندگیوں اور مصروفیتوں کو ٹٹول اور کرید کر خود ہی دیکھ لیں کہ ان کی نہ بیں آخرت کی نجات وخسران عذاب و ثواب اتنا بھی کتنوں کے اندر زندہ وبیدار ہے جو ہمارے روزانہ صبح وشام اور رات تک کے مشاغل پر کچھ بھی اثر انداز ہو۔ ہاں الحمدللہ صریح انکار نہیں، یا زیادہ سے زیادہ ایک بھولا ہوا اقرار ہے جو کسی وقت وقتی طور پر یاد آکر یا یاد دلایا جاکر بھی مشکل ہی سے عمل پر کوئی نمایاں اثر ڈالتا ہے۔

سو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ توحید الٰہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر جیسا کہ خود "بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ" سے ظاہر ہے جب تک آخرت پر ہمارے یقین کو یا کم از کم کسی مؤثر درجہ تک قوی احتمال کو از سر نو بیدار نہ کیا جائے گا محض عدم انکار یا بھولا ہوا خفتہ اقرار عملی زندگی کے حق میں بے اثر و بیکار ہی رہے گا۔ زندگی کے عملی میدان میں سویا ہوا ایمان، اسی طرح کوئی حصہ نہیں لے سکتا جس طرح

سویا ہوا انسان۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ انسانی زندگی کو حرکت و عمل میں لانے والے دو ہی بڑے محرک ہیں (۱) ایک طلب راحت و منفعت اور دفع اذیت و مضرت۔ (۲) دوسرے اعلیٰ و دیرپا راحت و منفعت کی ادنیٰ و گریزپا پر ترجیح اور چھوٹی یا عارضی مضرت و اذیت کو بڑی اور مستقل کے مقابلہ میں گوارا کر لینا۔ دین ہی نہیں دنیا میں بھی آدمی جتنی بے عنوانیاں کرتا ہے سب کا منشا بھی دو باتیں ہوتی ہیں ایک طرف ظاہری اسباب و تدابیر کو وہ بالذات نفع کے حصول اور ضرر کے دفع کرنے میں دخیل و مؤثر یقین کرتا ہے، دوسری طرف چھوٹے نفع و ضرر کے مقابلے میں بڑے نفع و ضرر پر نظر نہیں ہوتی غیر مسلموں میں تو ان دونوں کا منشا سرے سے خدا و آخرت کا انکار یا کفر و شرک یقینی دونوں کے متعلق صحیح تصور و ایمان کا فقدان ہے اور مسلمانوں میں اس کا سبب، توحید الٰہ اور یوم آخرت پر ایمان و ایقان کی کمزوری وہ بھی اس انتہا کی کمزوری کہ عملاً فقدان کے برابر یعنی عملی زندگی میں نماز روزہ والے مسلمانوں کا بھی ظاہری تدابیر و اسباب ہی پر اتنا بھروسہ کہ مسبب الاسباب تک بھول کر کسی کی نظر کسی معاملہ میں جاتی یا دنیا کے نفع و ضرر کے مقابلہ میں آخرت کے بناؤ بگاڑ پر پڑتی ہو گی، حالانکہ ایمان کی جان، ایمان بالغیب کا مطلب یہی ہے کہ جو تم کو جسم کی ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا رسول کو سچا جان کر ایمان کی آنکھوں سے وہی دیکھنے لگو۔

٭

مسلمانوں میں دینی انقلاب بپا کرنے کیلئے ایمان باللہ سے بھی زیادہ ایقانِ آخرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ایمانیات کا تعلق ہے مسلمانوں میں اسلامی زندگی کا کوئی نمایاں اور اجتماعی انقلاب رونما ہونے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ ایمان باللہ (توحید الٰہ) اور ایمان بالآخرۃ دونوں کو خصوصاً اور دوسرے کو پہلے سے بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ جگایا اور جھنجھوڑا جائے، کوئی تو بات ہے کہ ایمانیات کی فہرست میں ایقان کا مطالبہ صاف طور سے شروع ہی میں آخرت کی نسبت فرمایا گیا، تب جا کر ربانی ہدایت یابی اور فلاح پانے کا یقین دلایا گیا "أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" اور پھر آخر تک اسلام کی پوری کتاب میں شاید ہی کسی ایک مضمون پر آخرت اور احوالِ آخرت سے زیادہ آیات ملتی ہوں، یہاں تک کہ آخر قرآن میں تو سورتیں کی سورتیں اسی موضوع سے شروع اور اسی پر ختم ہونے لگتی ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ دین کی نظر میں دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا انفرادی واجتماعی معاشی وسیاسی تمدنی وثقافتی نفع وضرر یوم دین یا آخرت کے بناؤ بگاڑ کے سود وزیاں فلاح وخسران کے مقابلہ میں نہ فلاح فلاح ہے نہ خسران خسران، بس

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم - (پ ۸ ع ۹)

آخرت ہی کے دن جس کا پلڑا بھاری رہا وہی فلاح یاب ہیں اور جو میزانِ آخرت میں ہلکا ثابت ہوا وہی پورا خاسر وزیاں کار ہے۔

سورۂ زمر میں حضورؐ کو حکم و ارشاد ہے کہ جتلا کر

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۳۹/۱۵)

کہدو کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ زیاں کار یا خسارہ میں پڑنے والے درحقیقت وہی ہیں جنھوں نے خود اپنے اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن خسارہ میں ڈالا یہی تو کھلا ہوا زیان و خسران ہے

اور یہی سورۂ شوریٰ میں ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر :-

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ (۴۲/۴۵)

مومن کہیں گے کہ سراپا خسارہ میں پڑنے والے وہی لوگ ہیں جنھوں نے خود اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آج قیامت کے دن خسارہ میں ڈالا کہ اب ان ظالموں کو ہمیشہ اسی عذاب میں گرفتار رہنا ہے

بات وہی ہے کہ آخرت کی ابدی زندگی کے سامنے دنیا کی چند روزہ زندگی کی بساط ہی کیا ہے، چند دن بھی کیا، حشر کے دن لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ ایک دن کی بھی گویا ایک گھڑی سے زیادہ دنیا میں ٹھہرنا نہیں ہوا تھا باہم ایک دوسرے کو پہچان کر کہیں گے کہ واقعی خسارہ میں تو وہی لوگ رہے (جنھوں نے آج حشر کے دن) خدا کا سامنا ہونے کو جھٹلایا تھا اور اس دن کی فلاح کے لئے خدائی بالفاظِ (نبیائی) ہدایت کو قبول نہ کیا تھا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۔ (۱۰/۴۵)

اور بھی قرآن مجید میں خسران کا جہاں جہاں ذکر ہے اس کا تعلق زیادہ تر آخرت ہی کے زیان و خسران سے ہے، مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم کو ضرور جمع کرکے رہے گا اس میں کوئی شک نہیں پس (اصلی) خسارہ میں اپنی جانوں کو انھوں نے ڈال رکھا ہے جو (اس دن پر) ایمان نہیں لائے۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔ (۶/۱۲)

اسی طرح آگے ہی ہے کہ بیشک (سخت) خسارہ میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کا سامنا ہونے کی تکذیب کی، یہاں تک کہ جب دفعۃً قیامت کا وقت آپہنچا تو کہنے لگیں گے ہائے ہماری اس کوتاہی پر جو اس وقت کے معاملہ میں ہم نے کی۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا۔ (۶/۳۱)

یہ "وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ" کے اس انسانی خسران یا زیان کی کچھ تفصیل و تفہیم تھی جو توحید الٰہ اور یوم آخرت کے کفر و انکار یا ایمانی خامیوں کمزوریوں اور مشرکانہ آلائشوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس سے بچنے والے توحید و آخرت پر خصوصیت سے سچا کھرا ایمان رکھنے والے ہی ہو سکتے ہیں، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا۔

ایمان اور عمل صالح

(اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ)

ایمان اور عملِ صالح میں صرف ایک حرفِ عطف کا فرق ہے

ایمان کے بعد ہی بلکہ اسی کے ساتھ ہی دوسرا درجہ "اعمالِ صالحہ" کا ہے اور معنًا یہ بعدیت یا ثانویت اتنی ہی سمجھنا چاہیے جتنی لفظاً خود اللہ تعالیٰ نے "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے درمیان صرف ایک حرفِ عطف کی رکھی ہے، ورنہ مطلوب و ماموردر اصل دونوں کی معیت ہی ہے، اور صحیح اسلامی زندگی تو بہرحال ان دونوں پہیوں کو ساتھ ساتھ چلائے بغیر کسی طرح چل ہی نہیں سکتی خواہ لگے بائسکل کے دو پہیوں کی طرح آگے پیچھے ہی ہوں اور مسلمان جہاں کتاب و سنت کی صراطِ مستقیم یا میزانِ اعتدال سے ہٹ کر ایمانی مرجیّت یا "عملی خارجیت" کی افراط و تفریط میں جا پڑا کہ اسلامی زندگی کا توازن بگڑا۔

کوئی نظریۂ دعوت اپنے عملی ظہور و طاقت کے بغیر موثر نہیں ہو سکتا

جس طرح دنیا کے ہر عمل کی قدر و قیمت اس نظر و نظریہ یا آئیڈیالوجی کے تابع ہوتی ہے جس پر وہ مبنی ہو، اسی طرح دین بھی ان اعمال کی کوئی قیمت نہیں لگاتا جن کی بنیاد صحیح ایمان و عقیدہ پر نہ ہو، ساتھ ہی جس طرح دنیا کا کوئی اصول و نظریہ دعوت و دعویٰ عمل میں لائے اور آئے بغیر کوئی محسوس و موثر حقیقت نہیں بنتا، اسی طرح دین کا کوئی

ایمان و عقیدہ بھی اپنے عملی ظہور و طاقت کے بغیر نہ دنیوی زندگی کے حقائق و واقعات میں جگہ پاتا ہے نہ اُخروی زندگی کی کامل نجات و فلاح کی ضمانت دیتا ہے، دین و دنیا دونوں کی پوری پوری برکات و ثمرات کا حصول و ظہور ایمان و عمل صالح دونوں کی پوری پوری ہم آہنگی ہی پر موقوف و موعود ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸/۲۹) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۱۸/۱۰۷) یہ تو آخرت کی مغفرت و جنت کے ایمان اور عمل صالح دونوں ہی کی جامع زندگی پر دعوے کی مثال ہے دنیا میں بھی مرد و عورت جو فرد بشر بھی ایمان و عمل صالح دونوں کی زندگی اختیار کرے (مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ) اس کے لئے بھی کیسا حتمی وعدہ ہے کہ ہم اس کو قطعاً مزیدار انفرادی زندگی عطا کر کے رہیں گے (فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً) پھر اجتماعی زندگی میں بھی خصوصاً آج کل سب سے بڑی کامیابی و کامرانی کسی قوم کے سیاسی اقتدار و حکومت کو جانا جاتا ہے، نمرودی و فرعونی حکومت کو (خواہ اس کا نام جمہوریت ہو یا اشتراکیت) تو اسلام دنیا کے حق میں بھی سراسر لعنت ہی جانتا ہے اور جو حکومت حاکم و محکوم سب کے لئے رحمت ہی رحمت ہے کہ انسان اپنے کو آمر و حاکم نہیں نما نندۂ احکم الحاکمین کے احکام و اوامر کا محکوم و مامور بندہ و کارندہ یا نمائندہ و خلیفہ جانے اس کا قطعی وعدہ بھی بالکلیہ پہلے ایمان و عمل صالح کی توام زندگی اختیار کرنے ہی پر ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (نور ۵۵)

ایمان سے عمل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور عمل سے ایمان میں قوت آتی ہے!۔

یہی نہیں کہ اسلام کی دعوت ایمان کے سارے دینی و دنیوی انفرادی و اجتماعی ثمرات و برکات ایمان کے ساتھ اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے ہی پر موعود ہیں، بلکہ ان عملی لوازم سے خالی ایمان بجائے خود بھی بیجان ہی رہتا ہے، جس طرح اگر ہم اپنے کسی عضو کو معطل و بیکار رکھیں تو بالآخر وہ مفلوج و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے، اسی طرح جس ایمان سے کام نہ لیا جائے وہ بھی مضمحل و مردہ ہو کر رہ جاتا ہے، دونوں میں جان و تن سے زیادہ کی دوئی و دوری نہیں، بلکہ دونوں ایک ہی حقیقت کے ظاہری و باطنی یا ذہنی و خارجی دو رخ ہیں، ظاہر اگر اپنے وجود میں باطن کے تابع ہے تو باطن اپنی نمود میں ظاہر کا محتاج ہے، عمل کا اگر بلا ایمان کے اعتبار نہیں تو ایمان کا بھی بلا عمل کے اتمام نہیں ہوتا، ایمان سے عمل میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو عمل سے ایمان میں قوت آتی ہے دینی زندگی کی توانائی کارکردگی دونوں کی رگڑ فعل و انفعال یا عمل اور رد عمل ہی سے وجود پاتی ہے۔

حدیثوں میں بھی ایمان و عمل کی اس پیوستگی کی انتہائی اہمیت کو ظاہر کرنے کیلئے عمل کو جا بجا ایمان کا مرادف ہی نہیں عدم عمل کو عدم ایمان تک کا مرادف ٹھہرایا گیا ہے مثلاً جس میں امانت نہیں، ایمان بھی نہیں (لا ایمان لمن لا امانۃ لہ) مشہور حدیث

جس میں ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے ٹھہرائے گئے ہیں، اس میں اقرار لا الہ الا اللہ کے ایمانی فضل و تقدم کے ساتھ راستہ سے کسی اذیت کی چیز کو ہٹا دینے کے حقیر سے حقیر عمل کو بھی ایمان ہی کا شعبہ ٹھہرایا گیا ہے، پھر تدبر و تحقیق سے اہلِ علم نے ان شعبوں کے سات اوپر ستر یا ستتر تک کی جو فہرست مرتب کی ہے، ظاہر ہے کہ اس میں گنے چنے خالص ایمانیات و عقائد سے بہت زیادہ تعداد اعمالِ صالحہ ہی کی ہے، جن میں حق امانت ادا کرنا، قرض ادا کرنا، حاجتمند کو قرض دینا، پڑوسی کے کام آنا، سلام اور چھینک کا جواب دینا جیسی بظاہر چھوٹی سی چھوٹی عملی نیکیاں و نفع رسانیاں تک شمار کی گئی ہیں۔

ایمان و عمل کے باہمی رابطہ و رشتہ پر محدثین و فقہا اور متکلمین کی عالمانہ و اصطلاحی بحثوں کو چھوڑ رہیئے نفس قرآن و حدیث کے سرسری مطالعہ سے اتنی بات بے تکلف سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام کی طرف سے دراصل مطالبہ ایمان و عمل دونوں کے جمع کرنے ہی کا ہے، البتہ ارجاء و اعتزال یا مرجئیت و خارجیت کے نئے پرانے فتنوں سے بچنے بچانے اور عمل کے مقابلے میں ایمان کی بنیادی قدر و قیمت یا افضلیت کو ذہن نشین کرنے کرانے کے لئے بس ایک مثال کافی ہوگی جو مثالوں کے بادشاہ حضرت حکیم الامتؒ اپنی تحریروں میں دیا کرتے ہیں "بے عمل ایمان ایسا ہی ہے جیسے لنگڑا، لنجا، اندھا، بہرا، اپاہج آدمی، آدمی کہلایا جاتا ہے، سب جانتے ہیں کہ ایسا آدمی کس درجہ کا آدمی ہوتا ہے" فروع الایمان نام جو رسالہ کچھ اوپر ایمان کے ستر شعبوں والی حدیث ہی کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے اس کی چند تمہیدی سطروں میں صدیوں کے نزاعی مسئلہ کا کیسا صاف بے لاگ فیصلہ مل جاتا ہے۔

"ان سب شعبوں کو اپنے ہم وطن اسلامی بھائیوں کی آگاہی کے واسطے عام فہم اردو میں لکھتا ہوں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ جس ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں اس کے اس قدر شعبے ہیں اور غور کریں کہ ہم میں کتنی باتیں ہیں اور کتنی نہیں ہیں تاکہ اس سے اپنے ایمان کے نقصان و کمال کا اندازہ کر سکیں اور بدون تکمیل (اپنے ایمان کے) دعوے سے شرمائیں، گو اصولِ دین کے مان لینے سے ادنیٰ درجہ کا ایمان میسر آجاتا ہے مگر وہ ایمان ایسا ہی ہے جیسے لنگڑا، لُنجا، اندھا، بہرا، اپاہج آدمی آدمی کہلاتا ہے، سب جانتے ہیں کہ ایسا آدمی کس درجہ کا آدمی ہوتا ہے۔"

بس ایمان و عمل کے تعلق کی عقلی و نقلی بحثوں میں پڑے بغیر کام کی فیصلہ کن بات یہی ہے کہ خالی اسلام کا نام اور لیبل لگا کر جو ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ دعویٰ کیسا شرمناک اور خود ہمارے ہاتھوں اسلام کی رسوائی کا کیسا سامان ہے تاہم اہلِ انصاف کو چاہیئے یہی کہ اسلام کے متعلق رائے ہم رسوا کن مسلمانوں کے اعمال سے نہیں بلکہ خود اسلام کے اوصافِ کمال سے قائم کریں۔ لہٰذا

"دوسری غرض ان شعبوں کے بتلانے کی یہ بھی ہے کہ غیر قوموں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اسلام کی تعلیم بجائے خود کافی و وافی کامل و تام ہے اور اسلام اسی کو پورا مسلمان جانتا ہے جس میں یہ سب خصائلِ خیر و اوصافِ کمال ہوں، ناقص مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام کی تعلیم کو (ناقص) بے وقعت نہ سمجھیں کیونکہ اسلام کا کام بتلا دینا ہے نہ ویسا ہی زبردستی کسی کو بنا دینا، یہ قصور ہم لوگوں کا ہے اسلام پر کوئی الزام نہیں۔"

دینی غفلت کا روگ | **ہماری اصل غفلت یہ ہے کہ ہم دین کے معاملہ میں محض دعوئ ایمان پر مطمئن ہیں**

ہم مسلمانوں کو سب سے بڑا یہی لگ گیا ہے کہ دنیا کے تو ادنیٰ سے ادنیٰ کاموں اور معاملوں میں بھی خالی خیالی پلاؤ پکاتے رہنے پر ہم بس نہیں کرتے، چٹنی روٹی کھانے والا بھی اس کا نمک مرچ ٹھیک اور کچی پکی دیکھ کر ہی کھاتا ہے، حالانکہ نفسِ بری بھلی زندگی کے لئے بری بھلی چٹنی روٹی بلکہ روکھی سوکھی روٹی بھی کافی ہے لیکن دین کے معاملہ میں ہماری بہت بڑی، شاید ہزار میں نو سو ننانوے کی اکثریت محض اسلام کے ٹھپہ یا زبانی دعوئ ایمان اور خالی باتوں پر قانع و مطمئن ہو کر رہ گئی ہے جس کی نوعیت بڑی حد تک نری سلبی (NEGATIVE) ہے یعنی کوئی مسلمان اپنے کو کافر و مشرک یا ہندو، سکھ، یا عیسائی وغیرہ کہنے کہلانے پر راضی نہ ہوگا اس سلب و نفی سے آگے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی ایجابی و اثباتی تصور اُن کے ذہن میں اس سے زیادہ مشکل ہی سے کچھ ہو سکتا ہے کہ مسلمان نام گھر گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں شادی غمی وغیرہ کی کچھ رسمیں، عید و بقر عید، شب برات و محرم، میلاد و مجلس وغیرہ کے کچھ تہوار یا تقریبیں غیر مسلموں کی ہولی دیوالی، دسہرا جنم اشٹمی اور کرسمس وغیرہ سے الگ رکھتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ اس درجہ میں بھی جو خود اپنے کو کہتا سمجھتا بہرحال مسلمان ہی ہے دوسروں کو بھی اس کو کہنا سمجھنا مسلمان ہی پڑے گا، جیسا کہ لنگڑا لولا اندھا بہرا ہر طرح ناکارہ آدمی سمجھا بہرحال آدمی ہی جاتا ہے، اسی طرح بے عمل سے بے عمل مسلمان بھی رہتا مسلمان ہی ہے کافر نہیں ہو جاتا اور آخرت میں بھی بالآخر اس کے ساتھ

اسلام سے صریح کفر وانکار کرنے والوں کا معاملہ کسی طرح جائز و منصفانہ نہ ہوگا۔ تاہم نہ دنیا میں خالی اس سلبی یا بے عمل ایمان کے زبانی جمع خرچ سے ایجابی و عملی ایمان و اسلام کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ایسے ایمان پر دین اسلام نجات کامل کی ضمانت دیتا ہے، یہ تو قریب قریب صد فی صد عوام و جہلا کے "لنگڑے لنجے اندھے بہرے، معطل و مفلوج" ایمان کا حال ہے۔

ہمارے خواص کی حالت بھی حیرت و عبرت کا مجموعہ ہے	خواص و علماء کی یہ حالت اور بھی حیرت و عبرت کا مجموعہ ہے کہ انھوں نے ایمانی شعبوں کی فہرست کو نرے عقائد و ایمانیات

سے ایک قدم بڑھ کر عبادات اور ان میں بھی زیادہ تر صرف نماز روزہ کی بدنی عبادت تک محدود کر لیا ہے۔ زکوٰۃ کی مالی عبادت تک کا بہتوں کو اہتمام نہیں اور بعض انتہائی عبرت کی مثالیں تو یہاں تک نظر آئیں کہ "علم" کے زور سے زکوٰۃ و سود تک کی حقیقت ہی ایسی بدل دی کہ نہ ہر سال زکوٰۃ واجب ہو اور نہ وہ سود جس کو ساری دنیا سود ہی جانتی ہو حرام رہے، رہی دوسرے عام مالی حقوق و معاملات میں احتیاط تو اس میں طرح طرح کی کوتاہیاں عام علما میں بھی قریب قریب عام مسلمانوں ہی کی طرح عام ہیں۔ دیانات و معاملات کے بعد اخلاق کو لیجئے تو یہ اب ان **مکارم اخلاق** کے بجائے جن کی تکمیل و اتمام کے لئے حضور نبی الاسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص طور پر بعثت ہی ہوئی تھی (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) اخلاق نام رہ گیا ہے کچھ ظاہری تعظیم و تکریم تواضع و تکلف وغیرہ کی رسمی و مصنوعی باتوں کی خوش اخلاقی کا،

ورنہ کذب وفریب، مکرودغا، خیانت وخود غرضی، عہد شکنی ومحسن کشی، سازباز، ضد وانتقام حرص وہوس، ریاونفاق، کبروغرور، جاہ وشہرت، بغض وحسد، غیبت وبدگوئی، فخرو خودستائی، بدبینی وخودبینی، بدزبانی وبدنگاہی، تملق وچاپلوسی شاید ہی کوئی چھوٹا بڑا ظاہری وباطنی اخلاقی مرض وفساد ہو جو الا ماشاء اللہ قریب قریب ہم سب چھوٹے بڑے اس میں مبتلا وگرفتار نہ ہوں، اور کیوں نہ ہوں؟ کہ ان سارے اخلاقی مفاسد و امراض کی جڑ یا ام الامراض تو قلب کی خرابی اور نفس کی بیماری ہے اور ساری دنیا کو سب سے زیادہ بے فکری انفرادی واجتماعی سیاسی وسماجی قومی وبین الاقوامی تمام تباہیوں بربادیوں کے اسی سرچشمہ سے ہے اور بالواسطہ ان تمام بربادیوں کی ذمہ داری اس خیر امۃ پر ہے جس کے ہاتھ میں ختم نبوت کے بعد پوری انسانیت کی اصلاح ونگرانی دی گئی تھی (اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) سو خود اسی امت کے علماء ومصلحین نگران وقائدین ہی میں دوسروں کی اصلاح سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ ہی خود اپنے قلب کی صلاح وسلامتی اور نفس کے تزکیہ وصفائی کی فکر کتنوں کو ہوتی ہے، افسوس وحیرت کی بات ہے کہ جو لوگ پورے دین کی اقامت کے مدعی ہیں ان کو بھی سب سے زیادہ چڑھ قلب ونفس کی اصلاح وتزکیہ کے خصوصی خادمانِ دین (صوفیا ومشائخ) ہی سے ہے۔[1]

---

[1] حالانکہ خود اس دین ہی کے نظام وکتاب ہدایت میں فلاح وخسران کا مدار نفس کے تزکیہ کو ٹھہرایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (پ ۳۰، ۹ و ۱۰) اور جس ہدایت نامہ نے بار بار بتایا ہے کہ اصلی زیان وخسران دنیا کی زندگی کا نہیں آخرت کے دن کا ہے، اسی نے بتایا کہ اس دن قلب کی صحت و سلامتی کے سوا مال واولاد کوئی چیز بھی (اس خسران سے بچانے اور) کام آنے والی نہ ہوگی" (باقی برصفحہ آئندہ)

زندگی کے سوشل پہلو کی اہمیت اور اس سے عمومی غفلت!

زندگی کا ایک اور شعبہ مجلسی و معاشرتی (سوشل) تعلقات کا ہے جن کو زندگی کے بناؤ و سنوار میں غیر اہم دخل نہیں، جامع و کامل دین ان تعلقات کے حقوق و آداب سے بھی کیسے قطع نظر کر سکتا تھا ایسے جزئیات تک کا امر و نہی فرما کر حسن معاشرت کی اہمیت ہی پر متوجہ فرمایا ہے کہ مثلاً "اے ایمان والو، جب مجلس میں کہا جائے کہ ذرا جگہ کھول دو تو کھول دیا کرو کہ دوسرا بھی بیٹھ جایا کرے اس سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا و آخرت میں کشادگی فرمائے گا اور جب کسی ضرورت سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو اس سے اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان و اہلِ علم کے درجات بلند فرمائے گا" [1] دیکھئے بظاہر کیسی حقیر ذرا سی بات لیکن کیسے اہتمام سے اس کا امر و حکم اور ساتھ ہی کیسے عظیم اجر و جزا کا وعدہ، اس حکم سے تو ممکن ہے کہ کم ہی لوگ واقف ہوں لیکن یہ نہی و ممانعت خود قرآن کی مشہور ہے کہ بلا اسلام کئے اور بلا اجازت لئے دوسرے کے گھر میں نہ داخل ہونا چاہئے [2]۔ اور اگر وہ کہے کہ لوٹ جاؤ [3]، تو

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۲۶/۸۸)

نیز دین اور اقامتِ دین کی بھی کتاب جس پر نازل ہوئی اس نے قلب ہی کے صلاح و فساد پر کس قوت و شدت کے ساتھ متنبہ فرمایا کہ جس کے بناؤ بگاڑ پر سارا بناؤ بگاڑ موقوف و منحصر ہے آگاہ رہو کہ وہ قلب ہی ہے۔ الا وھی القلب۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۵۸/۱۱) [2] يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ (۲۴/۲۷)

[3] وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (۲۴/۲۸)

لوٹ جانا چاہیے۔ باقی حدیثوں میں تو حسنِ اخلاق وحسنِ معاشرت کے احکام وجزئیات کا شمار ہی کہاں تک ہو سکتا ہے[عه] اور ان جزئیات کی تعلیم کا جیسا اہتمام تھا اس کا ایک ہی جزیہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک صحابی بلا سلام کئے حضورؐ کی خدمت میں چلے آئے تو حکم دیا کہ واپس جاؤ اور السلام علیکم کہہ کر پھر آؤ۔"

ساتھ ہی ان آداب معاشرت سے ہمارے اُس بُعد واجنبیت کا بھی اندازہ کیجئے کہ اگر اب کوئی مجلس سے اُٹھ جانے یا دروازہ سے لوٹ جانے کو کہدے یا بلا سلام آجانے والے کو لوٹا دے تو اس سے بڑا بد اخلاق کون ہوگا۔[له]

غرض جہاں تک دنیوی ومادی زندگی کا تعلق ہے ہم پاؤں کی جوتی تک اپنی بساط بھر بہتر سے بہتر ہی پہننا چاہتے ہیں اور پیر کی ایک انگلی بھی ہنسی خوشی کاٹنے کٹوانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے لیکن دین وایمان ظاہری وباطنی زندگی کے عقائد وعبادات معاملات واخلاق اور معاشرت سب ہی میں اوامر ونواہی واجبات ومستحبات کے اعتبار سے "لنگڑے لولے، اندھے بہرے" سرتاپا مفلوج ومعطل بن کر اس طرح بےغم ہیں کہ گویا ہمارے دینی جسم کا کوئی رُواں بھی میلا نہیں ——

[له] خود اپنا حال تو یہ ہے کہ آستانۂ تھانوی میں بار پانے سے پہلے شاید ہی ایسی باتوں کے دین ہونے کا کبھی وہم بھی ہوا ہو اور وقت کے مجدد حرف حرف یہی فرمایا کرتے تھے کہ "دین میں کسی اور چیز کا مجدد ہوں یا نہ ہوں لیکن معاشرت کا ضرور ہوں" بلکہ حسن معاشرت کے اہتمام وتعلیم ہی کو انسانیت قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ "ولی وبزرگ تو نہیں ہوں نہ بناتا ہوں لیکن اگر کوئی ٹھہر جائے تو آدمی بنا دیتا ہوں" غالب نے بالکل سچ کہا ہے کہ "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" حتیٰ کہ خود حضرت علیہ الرحمۃ کے حلقہ بگوشوں میں آدمی گنے چنے ہی ملتے ہیں۔

[عه] امام بخاریؒ نے الادب المفرد کے زیرعنوان [illegible] ایک باب [illegible] ہے (ع۔م)

امت کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ طبقہ کی بھی انتہائی غفلت و بطالت ہماری اسلامی زندگی کے حق میں زہرِ قاتل اور سب سے مہلک بیماری ہے تاہم جب تک ہمارا بے حس و حرکت ایمان بھی سانس لے رہا ہے مرض لا علاج ہرگز نہیں۔

مگر ایک ہی علاج ہے کہ ایمان و عمل صالح دونوں کی توام ضرورت ہے کہ توحید الٰہ اور ایقانِ آخرت کا عملی ظہور ہو! تبلیغی و اصلاحی جدوجہد کو فرنگی نقالیوں کے بجائے خود اسلام ہی کی کتابِ ہدایت ہمہ گیر نظامِ ہدایت کے تحت برپا کیا جائے جس میں کمیت یا طول و عرض سے اگر مقدم و زائد نہیں تو کم از کم اس کے ساتھ ساتھ اور برابر ہی کیفیت یا عمق پر بھی زور و توجہ ہو اور اس اصلاحی جدوجہد میں قلب و نفس کی باطنی اصلاح یا تہذیب و تزکیہ کا حق جسم و جوارح کے ظاہری اعمال سے بھی اہم و اقدم ہو ظاہر و باطن دونوں کی تیز گام اصلاح کے لئے جس طرح ایک طرف یہ لازم ہے کہ توحیدِ الٰہ اور یومِ آخرت پر ایمان کو خصوصاً خالی اقراری و قولی لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ والے ایمان سے بڑھا کر قلب میں داخل و راسخ یا دل میں گھر کر جانے والا زندہ و بیدار ایمان بنایا جائے جس سے عملی جسم میں حیات و حرکت رونما ہو اسی طرح دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ عملی حیات و حرکت کو پورے دینی قالب میں اسی طرح دوڑانے کی فکر و سعی ہو کہ ظاہری و باطنی کوئی عضو مفلوج و معطل نہ رہنے پائے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے عضو کی بیماری و ناکارگی کا اثر کم یا زیادہ دوسرے اعضا اور جوارح پر بھی خراب ہی نہیں پڑتا بلکہ خود روح و ایمان کو مضمحل کرنے والا ہوتا ہے جس طرح

داڑھ کا درد بھی جسم و جان دونوں کو بے چین و بے قرار کر دیتا ہے۔

ایمان اور عمل پر متوازی توجہ ہی خسران کا واحد علاج ہے!

غرض ایمان و عمل دونوں کی طرف متوازی توجہ اور دونوں کے رسوخ و قوت اور باہمی عمل اور ردعمل تاثیر و تأثر ہی سے انشاء اللہ دونوں کی صحتمند و متوازن زندگی حاصل ہوگی اور اسلامی عضویہ (ORGANISM) اور مشین کا ہر ہر عضو اور پرزہ ظاہری و باطنی انفرادی و اجتماعی طور پر مؤثر و ہم آہنگ کارکردگی کے حقوق ادا کر سکے گا مسلمان ہی نہیں "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" والے انسان یا پوری انسانیت کو زیان و خسران سے بچانے کا بس یہ ایک ہی علاج ہے۔

صلاح کے ساتھ اصلاح کی ضرورت و اہمیت

(وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ)

خسران سے کامل بچاؤ کے لئے کل انسانیت پر تبلیغ ضروری ہے

آگے بڑا اہم سوال یہ ہے کہ یہ ایک ہی علاج ہو کیسے؟ اور کرے کون؟ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اسی مشکل کا دو لفظوں میں حل ہے، انسان کو بحیثیتِ مجموعی خسران سے بچانے کے لئے صرف کچھ افراد کا اپنی اپنی جگہ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا حق ادا کر کے مومن صالح بن جانا کافی نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح کی اس حقانی زندگی کو پوری نوعِ انسان میں پھیلانے اور پیدا کرنے کے لئے آپس میں ایک دوسرے کو اس کی فہمائش و تاکید کرتے رہنا بھی لازم ہے

اور اس تاکید یا تعلیم و تبلیغ کی راہ میں جو مشکلات و موانع پیش آئیں ان پر صبر و تحمل کی بھی باہم تاکید ضروری ہے یعنی پوری انسانیت کو خسران سے بے اس کے نہیں بچایا جاسکتا کہ اپنے کو بچانے والے افراد ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بھی بچانے کی اپنی والی پوری جدو جہد میں لگے رہیں۔

اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح کی فکر و تدبیر یا تواصی بالحق و تواصی بالصبر کے بعد بجز مشیتِ حق کے عالمِ اسباب میں اور تیسری چیز رہ ہی کیا جاتی ہے جو انسان کے کسی فرد و جماعت معاشرہ و ملت کی صلاح و فلاح یا اس کو خسران سے بچانے کا راستہ روک سکے "تواصی بالحق" کے اس اصول و تعلیم کے لئے قرآن مجید کی عام اصطلاح "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے یعنی اسلام نے مسلمان پر صرف اپنی برائی بھلائی کی ذمہ داری عائد نہیں کی ہے بلکہ اس کے اسلامی فرائض ہی میں، دوسروں کو بھلائی کا حکم و تاکید اور برائی پر روک ٹوک بھی داخل ہے۔ اس اصول پر عمل کی اصولی تفصیلات بھی خود قرآن ہی پر ذرا فکر و تدبر سے پوری طرح معلوم و متعین ہوجاتی ہیں۔

ختم نبوت کے بعد اب صلاح و اصلاح کی ذمہ داری امتِ محمدیہ پر عائد ہوتی ہے

صلاح و اصلاح کا کامل ترین نمونہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں ایک طرف ان کی ذات بجائے خود "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" یا ایمان و عمل صالح کا اسوۂ کاملہ ہوتی ہے اور دوسری طرف دوسروں کو "تواصی بالحق و تواصی بالصبر" یعنی اسی ایمان و

عمل صالح کی زندگی کے تمام معروفات کا امر اور منکرات سے نہی تو ان کی پوری زندگی کا مقصد اور مشن ہوتا ہے جس کے لئے وہ خاص طور پر مبعوث ہی ہوتے ہیں۔ ختم نبوت کے بعد اس مشن اور مقصد کی تکمیل کے لئے بہ حیثیت مجموعی پوری امتِ مسلمہ کو "امتِ مبعوثہ" یا "امتِ مخرجہ" قرار دیا گیا ہے کہ وہ من حیث امت اٹھائی اور نکالی ہی اس غرض سے گئی ہے کہ ایمان و عمل صالح کا خود بہترین نمونہ "خیر امۃ" بن کر پوری انسانیت (للناس) کے حق میں حق و صبر کی تواصی یا معروف کے امر اور منکر سے نہی کے انبیائی فرض کا حق ادا کرے۔ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی دہری ذمہ داری کو دوسری جگہ بجائے "خیر امت" کے ہر پہلو سے کامل توازن و اعتدال والی امت یا "امت وسطہ" ٹھہرا کر ایک دوسرے عنوان سے اسی طرح واضح فرمایا کہ تم کو پوری انسانیت کے لئے زندگی کی عملی شہادت بنے رہنا اور خود اپنے حق میں یہ شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنائے رہنا ہے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)

مثال و نمونہ یا شہادتِ عمل ہے ہی ایسی زبردست طاقت کہ اس سے حق ہی نہیں، حق و باطل خیر و شر سب ہی کو خوب فروغ ہوتا ہے بلکہ باطل و شر کو اور زیادہ اس لئے کہ اس کو اندر سے نفسانی میلانات اور باہر سے دنیا کی ظاہری زندگی

(ظاہرا من الحیوٰۃ الدنیا) کی برابر شہ ملتی رہتی ہے، اس کی بہترین مثال تاریخ کی سب سے مفسدانہ تحریک فلسفۂ اشتراکیت و معیشت ہے جو فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی حیثیت ہی سے نہایت بودا نظریہ و نظام نہیں ہے بلکہ خالص معاشی لحاظ سے بھی نہایت غیر فطری غیر متوازن اور گوناگوں بے اعتدالیوں کے ملغوبہ کے سوا کچھ نہیں مگر صدیوں سے سرمایہ داروں جاگیرداروں کی جو بے اعتدالیاں زر و زمین کی بد استعمالیوں کی راہ سے چلی جارہی تھیں ایک طرف انھوں نے اس تحریک کے لئے میدان صاف کر رکھا تھا دوسری طرف اس کے حامیوں کو انقلاب کی راہ سے اس کی عظیم الشان حکومت پر قبضہ پاکر اس نظام و نظریہ کو پوری طرح دل کھول کر عمل میں لانے کا موقع مل گیا پھر کیا تھا کہ عمل و نمونہ کی یہ شہادت پروپگنڈہ اور حکومت کے بل پر آندھی کی آگ کی طرح دیکھتے دیکھتے ساری دنیا میں پھیل گئی حتیٰ کہ اشتراکیت دشمن کیمپ مدعیانِ جمہوریت اور شخصی و انفرادی آزادی کا دعویٰ کرنے والوں تک میں سرمایہ داری و جاگیرداری کیا سرے سے ذاتی و انفرادی ملکیت ہی کو مٹانے کے اشتراکی نعروں ہی کا روز افزوں بول بالا ہو رہا ہے۔

جس طرح فرد کی صحبت پر انفرادی زندگی کا بناؤ اور بگاڑ منحصر ہے اسی طرح انسانیت کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمہ داری مستقل امت پر عائد ہوتی ہے!

غرض انسان کی سرشت ہی یہ ہے کہ وہ کان کے بجائے آنکھ یا قول کے بجائے عمل کی شہادت سے زیادہ قائل و متاثر ہوتا ہے اور جس طرح فرد کے لئے فرد کی نیک و بد صحبت خالی نصیحت سے

زیادہ کارگر ہوتی ہے اسی طرح جماعت و معاشرہ کے لئے جماعت و معاشرہ کی یا پوری انسانیت کے لئے کسی ایسی مستقل بین اقوامی ملت و امت کی ضرورت ہے جو نسلی و جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہو کر مختلف قوموں اور ملکوں میں رہتے بستے ہوئے بھی ایمان و عمل صالح کی زندگی پر مستقیم رہ کر دوسروں کے لئے اس مثالی عملی شہادت کا کام دیتی رہے اور پھر اس شہادت عمل کے ساتھ ساتھ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" یا "تواصی بالحق" کا بھی حق کما حقہ ادا کرتی رہے۔

قرآن یہ ذمہ داری امتِ محمدیہ پر عائد کرتا ہے!

قرآن مجید نے اسی بین اقوامی قوم کو "بہترین قوم" خیرِ امت کا لقب دیا ہے اور "شہادت علی الناس" کا فرض ادا کرنے کے لئے اس امت کی خاص خصوصیت اس کا "امت وسط" یا اعتدال پسند قوم ہونا ٹھہرایا ہے، دیکھا جائے تو دنیا کے ہر قسم کے انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی شر و فساد کا سرچشمہ اعتدال و توسط سے تجاوز یا افراط و تفریط کی گمراہیاں ہی ہوتی ہیں، اسلامی تعلیمات کا سب سے زیادہ نمایاں وصف زندگی کے ہر دینی و دنیوی شعبہ میں توسط و توازن کی "صراطِ مستقیم" ہے اس ناقص و محدود عالم کون و فساد کی ہر چیز کم و بیش خیر و شر کا مجموعہ ہے نہ کوئی خیر بالکلیہ شر سے پاک اور نہ کوئی شر بالکلیہ خیر سے خالی۔ اسلام کی صراطِ مستقیم یا سیدھی راہ کا اس بہر حال خیر و شر آمیز زندگی کی ہر راہ میں کمال توازن و توسط یہی ہے کہ وہ نسبتہً خیر کے پہلوؤں کی زیادہ سے زیادہ جامع ہے اور شر کے پہلوؤں کی زیادہ سے زیادہ مانع

ہوتی ہے، اسی جامع ومانع توازن واعتدال کا لازمہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کم وبیش ہر معاملہ میں جامع اضداد معلوم ہوتی ہیں اور لوگ اپنے محدود وناقص علم ونظر کی بنا پر کسی ایک ہی پہلو پر زور دے کر اسلامی اعتدال وتواسط کے سارے حسن وکمال کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔

مثلاً اسلام نہ دنیا پرستی کا معلم ہے اور نہ دنیا بیزاری کا، مگر آج کل کے مادہ پرست غوغائیوں سے مرعوب اور خود اپنی حرص وہوس سے مغلوب مسلمان پورے اسلام کو ایسے قالب میں ڈھال دینا چاہتے ہیں کہ گویا اسلام کی نظر میں بھی نہ اس دنیا کی زندگی سے ماورا کوئی زندگی ہے اور نہ اس کی صلاح وفلاح کی کوئی تعلیم و دعوت، اسی طرح سیاسیات ومعاشیات کو لیجئے کہ کسی کو اسلامی سیاست ومعیشت تمام تر روسی اشتراکیت واشتمالیت نظر آتی ہے جس میں انفرادی آزادی وملکیت تک کی سرے سے گنجائش نہیں اور کسی کو سرشماری والی جمہوریت اور بے قید وبند والی ملکیت وملوکیت اور جب ہٹلر کا زور تھا تو اسلامی امارت آمریت بنائی جانے لگی تھی اور کہیں ہٹلر کامیاب ہوجاتا تو یقیناً دنیا میں آج اشتراکیت وجمہوریت سب کے بجائے آمریت ہی کے گُن گائے جاتے ہوتے لیکن اسلام کے تمام جامع و مانع عناصر کو مد نظر رکھا جائے تو نہ وہ روس کی اشتراکیت ہے نہ امریکہ وانگلستان کی جمہوریت اور نہ ہٹلر مسولینی کی آمریت وفسطائیت بلکہ اشتراکیت وجمہوریت انفرادیت واجتماعیت سب کے فوائد ومنافع کی جامع اور سب کے نقائص ومضار کی مانع،

آج مسلمانوں کی حکومتیں تو ہیں مگر ایک بھی اپنی ذمہ داری سے آگاہ نہیں!

آج بھی مسلمانوں کی چھوٹی بڑی بری بھلی بیسیوں حکومتیں موجود ہیں لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک بھی اسلام کے جامع و مانع نظام سیاست و معیشت کی نمایندہ "امنہ وسطہ" بن کر دنیا کے دوسرے سیاسی و معاشی نظامات کے بالمقابل "شہادت علی الناس" کا حق ادا کر رہی یا اسلامی سیاسیات و معاشیات کی عملی گواہی دے رہی ہے، صد فی صد کا کیا کہنا اگر یہ عملی شہادت کسی محسوس و معتد بہ درجہ میں بھی کہیں کارفرما ہوتی تو وہ اپنی ذات میں انسان کی انفرادی و اجتماعی فطرت کے مختلف و متضاد عناصر و مطالبات کی ایسی متوازن جامعیت و مصالحت کی حامل ہوتی کہ نام نہاد اشتراکیت و جمہوریت کے ہنگاموں میں بھی اس کو مسلسل و مستقل طور پر نظر انداز کرتے رہنا انسانیت کیلئے عملاً ناممکن ہی ہوتا۔

خود محکوم مسلمان بھی حاکم قوم پر اپنی ایمانی سیرت سے اثر انداز ہو سکتے ہیں

اسی طرح کم و بیش تمام چھوٹے بڑے غیر مسلم ملکوں اور حکومتوں میں مسلمان ایک بین اقوامی قوم کی حیثیت میں اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ محکومی کی معذوریوں کے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ اسلام کے خدا پرستانہ انفرادی و معاشرتی معاملات و اخلاق کا حق ادا کر کے نہ صرف خود حاکموں کے لئے اسلامی تفوق و برتری کے عملی گواہ بن سکتے تھے بلکہ دنیوی زندگی کے اعتبار سے بھی ہر جگہ ذلت و کمتری کے بجائے خود حکومت و حاکم قوم کے دلوں میں عزت و وقعت کی جگہ حاصل کر سکتے ہیں؛ ہو نہیں سکتا کہ بڑی سے بڑی

اکثریت وحکومت میں پھنس کر بھی مسلمان اگر مفرد رہ کر اپنی انفرادی و جماعتی یا سماجی زندگی میں خدا و آخرت کے ایمان پر مبنی صالح زندگی کے معاملات و اخلاق اور معاشرت میں عملاً اسی طرح گواہی دیتے رہیں کہ گھر میں بھی **مومن صالح** ہوں اور باہر بھی' اپنوں میں بھی' پرایوں میں بھی' دوستوں میں بھی' دشمنوں میں بھی' کچہری میں بھی' دفتر میں بھی' اسکول و کالج میں بھی' دکان و بازار میں بھی' تو کیا کوئی متعصب سے متعصب اکثریت وحکومت بھی اُن سے مسلسل غیر متاثر رہ سکتی یا اُن کو مستقلاً نظر انداز کر سکتی ہے، جس قوم و ملک کے لوگوں کو بھی دن رات یہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ مسلمان نام ہی اس کا ہے جو دنیا کے نفع وضرر سود و زیاں سے کہیں زیادہ اپنی زندگی خدا کی رضا و ناراضی یا آخرت کی فلاح و خسران کے ماتحت بسر کرتا ہے اور اس لئے اس کو دنیا کی حکومت اس کے قانون و عدالت فوج و پولیس' قید و بند کا خوف ہو نہ ہو وہ کھلے چھپے' اندھیرے اجالے، شہر ویرانے کہیں کسی حال میں بھی راستی و راست بازی' حق پسندی و فرض شناسی کی راہ سے منحرف ہونا گوارا نہ کرے گا، اُن کو چار و ناچار مسلمانوں پر اعتماد و اعتبار اور لازماً خود ان کی اور ان کے دین دونوں کی عزت و رعایت کرنے پر دیر و سویر مجبور ہونا پڑے گا۔

اس کی چند تاریخی مثالیں | یہ نری قیاسی و فرضی بات نہیں، ماضی کے آئینہ میں اب بھی کہیں کہیں ایسے مسلمانوں کی صاف و شفاف صورت دیکھی جا سکتی ہے، چوتھی صدی ہجری کا ابن حوقل نامی ایک سیاح بہت سے ایسے ملکوں اور علاقوں کا

جہاں غیر مسلموں کی اکثریت وغلبہ ہے چشم دید تجربہ لکھتا ہے کہ

"ان ہی علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی جن کی پارسائی اور اخلاقی برتری کا حال یہ ہے کہ اپنے مقدمات میں غیر مسلم طبقات کے افراد بھی عموماً ان کو اپنا گواہ مقرر کرکے حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور مقدمہ کا فریق ثانی بھی ان کی شہادت کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے کبھی کسی خاص گواہ کی گواہی پر فریق ثانی کو اگر اعتراض بھی ہوتا ہے تو اس کی جگہ گواہی میں پھر مسلمان ہی کو پیش کیا جاتا ہے اور اسی کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔"

دیکھا آپ نے یہ "شہادت علی الناس" کی کیسی لفظی ومعنوی **شہادت** ہے پھر جس امت یا جماعت کے متعلق بھی لوگوں کو علانیہ دن رات کے معاملات میں یہ تجربات ہوتے رہتے ہوں کہ وہ خدا وآخرت کے ایمان پر مبنی تقوی یا "پارسائی اور اخلاقی برتری" والی زندگی میں اپنی والی کوئی کوتاہی روا نہیں رکھتے خواہ اس کی قیمت ان کو دنیا کے جان ومال ضرر ونقصان ہی کی چھوٹی بڑی صورتوں میں ادا کرنی پڑتی رہے تو بالآخر اُن کے اس دین وایمان کی رعایت ہر اس حکومت واکثریت کو بھی کرنا پڑے گی جس میں انسانیت یا انسانی شرافت کی کوئی رمق زندہ ہے، ابن حوقل ہی کا بیان ہے کہ

"ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم وفیصلہ کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہوں ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں

خواہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔"

خود ہندوستان کے کسی ساحلی علاقہ بلہرا کے متعلق بیان کیا ہے کہ "اس علاقہ میں کچھ مسلمان بھی آباد ہیں ان مسلمانوں پر بلہرا کی طرف سے وہی آدمی حاکم ہو سکتا ہے جو مسلمان ہو، بلہرا کا وہ ان مسلمانوں پر نمائندہ ہوتا ہے[1]۔"

دیکھنے کی بات وہی ہے کہ خالق و مخلوق خدا و انسان دونوں کی طرف سے یہ معاملہ ہمارے جیسے نام کے خالی نسلی و قومی یا نرے بے جان نماز روزہ والے مسلمانوں کے ساتھ نہ تھا، بلکہ ان کے ساتھ جو دوست و دشمن مسلمان و غیر مسلمان سب کے ساتھ فلاح و تقویٰ یا پارسائی اور اخلاقی برتری" کی عملی شہادت مسجد و مصلی سے باہر زندگی کے دنیوی معاملات میں دیتے پائے جاتے تھے اور سچ پوچھئے تو ایسے ہی مسلمانوں کو اس دعوی کا حق تھا کہ وہ کسی حکم و فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم نہ کرنے "جب تک وہ ان کی خدا دا آخرت والی زندگی کو فساد و خسران سے بچانے والا نہ ہو، یہ تو ماضی میں خیر امتہ کے شہداء علی الناس ہونے کے ثمرات کی ایک جھلک تھی، اب ذرا اس کے بالمقابل حاضر کے آئینہ میں ہم اپنی صورت دیکھیں اور پہچانیں۔

---

[1] یہ تینوں اقتباسات مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رح کی مختصر مگر بڑی سبق آموز کتاب "ہزار سال پہلے" سے منقول ہیں۔

البتہ چند صالح افراد سے ساری امت «خیر امت» نہیں بن سکتی!

مستثنیات کا ذکر نہیں، کہ بُرے بھلے مستثنیٰ افراد سے
نہ کوئی جماعت یا امت خیر امۃ بنتی ہے نہ شرّ امۃ
بہتر سے بہتر جماعت و معاشرہ میں بدتر سے بدتر، اور بدتر سے بدتر سوسائٹی میں بہتر
سے بہتر کچھ نہ کچھ اشخاص پائے جا سکتے بلکہ ضرور پائے جاتے ہیں، مگر سیکڑوں
ہزاروں میں دو چار بُروں کی برائیاں مجموعی سماج کے دباؤ میں سر اٹھا پاتی ہیں اور نہ دو
چار بھلوں کی بھلائیاں کسی سماج کو دوسرے سماج والوں کی نظر میں کوئی موثر سبق آموز
مثال و نمونہ بنا سکتی ہیں؛ امت من حیث الامت کی خیریت و شریت کا مدار اس میں
خیر یا شر کے کمًّا و کیفًا محسوس و مشاہد غلبہ ہی پر ہوتا ہے۔

«امتِ مبعوثہ» کی موجودہ زبوں حالی

جس امت پر ساری امتوں اور قوموں کی فلاح و اصلاح کے
لئے خیر امت بننے اور بنے رہنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس نے
ایمان و عمل صالح کی پوری ظاہری و باطنی زندگی میں کیف و کم ہر اعتبار سے اپنی
ایمانیت و صالحیت دونوں کو اس طرح مسخ و پامال کیا ہے کہ ایمانیات میں
کھلی کھلی کافرانہ و مشرکانہ باتوں سے لیکر اعمال خصوصًا معاملات و اخلاق اور معاشرت
کا شاید ہی کوئی فساد و گندگی ہو جس میں ہمارے عوام ہی نہیں خواص تک دوسری
امتوں یا قوموں سے زیادہ ہی لت پت نہ ملتے ہوں۔ توحید جو سارے ایمانیات کا
جوہر اور ساری طاعات و حسنات کی جڑ (راس الطاعات و ملاک الحسنات) ہے
اور جس سے مراد توحید الٰہی ہے یعنی وہی زندگی کے پورے کاروبار اور تمام انفرادی

واجتماعی شعبوں میں ہر نفع وضرر، سود وزیاں کو تدابیر واسباب سے نظر بلند کرکے بالکلیہ وفی الواقع صرف مسبب الاسباب خدائے واحد کے ہاتھ میں شعوری طور پر دیکھنا کتنے ہم میں ہوں گے جن کی نظر اسباب سے آگے جاتی ہو یا جو جائز وناجائز کی بحث کے بغیر اسباب پرستی کی دوڑ میں مسبب الاسباب کے قطعی منکرین سے پیچھے رہتے ہوں، اسی طرح ہمارا ایمان بالآخرت کتنوں کو اس پر آمادہ کر پاتا ہے کہ وہ آخرت کے نفع وضرر کو دنیا کے نفع وضرر پر مقدم رکھتے ہوں اور کیسے رکھ سکتے ہیں جب ہمارے علم وشعور پر بھی دنیا کی ظاہری زندگی منکرین آخرت ہی کی طرح اس درجہ چھائی ہوئی ہے کہ کسی دوسری زندگی کا خیال کسی کو بھولے ہی سے آتا ہوگا۔

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰)

مسلمان ہونا الگ رہا میں تو کہا کرتا ہوں کہ توحید وآخرۃ کو بھول بھلا کر انسان بجز درندہ وحیوان کے کچھ رہ ہی نہیں جا سکتا، اس کا ثبوت بے خدا وآخرت کی روز افزوں ماڈرن زندگی کی روز افزوں درندگی وحیوانیت سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ فرد فرد جماعت جماعت قوم قوم سب ہی ایک دوسرے کو کھا اور نگل جانے کے تاک میں لگی ہیں۔ یہاں تک کہ "پرامن بقائے باہم" کی دعوت بھی سچ پوچھئے تو کمزوروں کی طرف سے اسی ڈر میں ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے زور آزماؤں کی زور آزمائی میں ہماری خیریت نہیں خود اپنے گھر میں اپنے سے کمزوروں کو دبانے اور نگلنے میں یہ بھی کب کس سے پیچھے ہیں وہ تو کہئے کہ انبیائی تعلیم کی بچی کھچی اخلاقی قدریں اب

بھی کچھ نہ کچھ افراد و اقوام سب کے دلوں میں ظلم و زیادتی حق و انصاف امن و امان کی تھوڑی بہت بھلائی برائی جانے ہوئے ہر ملک و معاشرہ میں کچھ نہ کچھ انفرادی و اجتماعی درندگیوں کے مقابلے میں سپر بنی ہوئی ہیں، نہیں تو خدا و آخرت سے انکار و غفلت کی بدولت انسانی بستیوں کے اشتراکیت وجمہوریت کی چکی کے پاٹوں کے درمیان پس جانے کے سامانوں میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے، بلکہ اشتراکیت وجمہوریت کا حاصل ہی اس کے سوا کیا ہے کہ جس جتھے کے ہاتھ میں حکومت واکثریت کی لاٹھی آجائے ہر محکوم اور بڑی سے بڑی اقلیت کی بھینس بھی اسی کی ہے، یا پھر وہی اجتماع و شورش ہنگامہ پسندی و بدامنی کا زور دباؤ (خواہ وہ نام نہاد ستیہ گرہ اور مرن برت ہی کی انفعالی صورت میں ہو) لاٹھی والوں کو بھی حق و انصاف کی نہیں موقع و مصلحت کی خاطر تھوڑا بہت قبول ہی کرنا پڑتا ہے، جب انسان کی شخصی یا جماعتی من مانی رائے وخواہش کے ماوراء حق و انصاف کا کوئی اور برتر معیار ہی نہیں تو اس سے چارہ ہی کیا ہے کہ جو شخص یا جماعت غالب آجائے وہ اپنی رائے وخیال کو حق و انصاف قرار دیکر مغلوبوں سے منواتی رہے اور خالی حق و انصاف کی دہائی خواہ وہ زبان و کلچر ہی کے نام سے اور ساڑھے بیس لاکھ دستخطوں کی عرضداشت ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو اس کی صحیح جگہ ردی کی ٹوکری کے سوا کہاں ہو سکتی ہے۔

اس زبوں حالی کے اسباب کا اجمالی جائزہ | یہ تو موقع آجانے پر اپنی پھر اس کا ایک جملہ معترضہ تھا کہ خدا و آخرت کا ایمان نکل جانے کے بعد دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اصل ذکر اس امت کا

تھا جس کے سپرد اس ایمان کی دعوت اور اسی پر عمل کی شہادت کی گئی ہے کہ یہ ایمان خود ہمارے اندر کس درجہ بے جان ہو کر رہ گیا ہے لازماً "عمل صالح" کی عملی شہادت کا بھی جو حشر ہونا تھا وہ سامنے ہے ایمان باللہ کا اہم و اقدم مطالبہ حقوق اللہ یا نماز روزہ وغیرہ کے عبادتی اعمال صالحہ ہیں ان میں بھی سب سے مقدم نماز کو پورے دین کا ستون ٹھہرایا گیا ہے اس کا کمی یا عددی حال یہ ہے کہ شاید فی صد دو چار سے زیادہ نمازیوں کی تعداد نہ ہو اور کیفی اعتبار سے یہ نماز کی صرف ویسی ہی صورت ہوتی ہے جو مسجد و مصلی سے فواحش و منکرات سے باز رکھنے والی سیکڑوں کیا ہزاروں میں ایک آدھ کی ہوتی ہو گی خصوصاً اخلاق و معاملات کی زندگی میں تو تہجد گذاروں کو بھی بالعموم بے نمازیوں کے دوش بدوش ہی پائیے گا۔ بلا شبہ مامور و مطلوب چونکہ نماز کی صورت بھی ہے اس لئے صوری فرض ضرور اتر جاتا ہے لیکن صورت بے حقیقت کے حقیقی دینی و دنیوی ثمرات سے تو بہر حال محروم ہی رہنا پڑے گا، یہی حال روزہ داروں کے روزوں کا عام طور سے ملے گا کہ وہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ والے تقویٰ کے اثرات سے عین روزہ کی حالت میں بھی خالی اور محض فاقہ کی صورت ہوتا ہے، اس کے بعد زکوٰۃ کو لیجئے تو اس کے ادا کرنے والے تو صوم و صلوٰۃ کے پابندوں میں بھی شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں البتہ یہ عجیب انمل بات ہے کہ حج کا شوق نسبتہً کچھ زیادہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے خواص تک میں پایا جاتا ہے یا ایسے عوام ہیں جو استطاعت اور زاد راہ کے حدود و احکام کا بھی پوری طرح خیال نہیں رکھتے، باقی آداب حج کا لحاظ یا "فسوق و جدال" سے بچنے کا اہتمام تو کچھ خاص خاص اللہ کے

بندے ہی کرتے ہوں گے، نذر و نیاز سجدہ و طواف بھی خالص اللہ ہی کے حقوق ہیں ان
میں مزاروں تعزیوں وغیرہ کے ساتھ عوام اور جہلا ہی نے شرک کا معاملہ نہیں کر رکھا ہے
علما تک کی پوری پوری جماعتوں نے ان مشرکانہ اعمال و افعال کو اپنا مستقل علمی و دعوتی
مسلک بنا رکھا ہے۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

حقوق اللہ کے بعد حقوقِ عباد کے اعمالِ صالحہ پر آیئے تو یہاں میدان اور
بھی صاف، قدم قدم پر یہی مجدد وقت حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ ہی کا قول سامنے آتا
رہتا ہے کہ نماز روزہ کی بچی کھچی عبادات کے علاوہ زندگی کے تمام دوسرے شعبوں کو تو
مسلمانوں کے کم و بیش تمام طبقوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال چھوڑا ہے،
کہا تو بالکل بجا طور پر جاتا ہے کہ اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کا دین و قانون
ہے، بلکہ دین و دنیا کی دوئی قطعاً غیر اسلامی تصور ہے لیکن حقیقت حال یہ اپنوں
پرایوں کسی سے مخفی نہیں ہے کہ خود قرآن نے عین نزول کے وقت مسلمانوں کی جن
دو قسموں کی نشان دہی فرمائی تھی، ہمہ پردنیا اور مریدِ آخرت مِنكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (۳/۱۵۲) اب ہمارے اندر دنیا کی زندگی اور معاملات
میں آخرت کی زندگی و فلاح کا ارادہ کرنے والے کتنے ہیں۔

گھر ہو کہ باہر، کچہری ہو کہ دفتر، کارخانہ ہو کہ بازار، اسکول ہو کہ کالج، ملازمت
ہو کہ تجارت، وکالت ہو کہ ڈاکٹری و طبابت، استاد ہوں کہ طالب علم کہیں کسی
جگہ کسی طبقہ و پیشہ والوں میں آپ بتا دے سکتے ہیں کہ مسلمان بحیثیت امت و

جماعت دوسروں کے مقابلہ میں اپنی زندگی اور معاملات میں دنیا کے نفع و نقصان سے رتی بھر بھی زیادہ خدا کی رضا و ناراضی یا آخرت کے سود و زیاں فلاح و خسراں کی پرواہ کرتے نظر آتے یا دیکھنے والوں کو دکھاتے ہوں کہ ان کی نظر حقوق و فرائض کی ادائی میں تنخواہ و اجرت پولیس و عدالت افسروں و عدالت کی نگرانی یا بازپرس سب سے کہیں بڑھ چڑھ کر احکم الحاکمین کی نگرانی اور آخرت کی جواب دہی پر ہے۔

اگر یہ کچھ نہیں تو پھر للہ کوئی بتائے کہ مسلمانوں کی خیر امۃ ہونے کو دوسری امتوں یا قوموں والے کس طرح پہچانیں؟ نت نئی انجمنوں اداروں سے؟ اسکولوں کالجوں یا ان میں تعلیم پانے والوں کی کثرت سے؟ تقریروں تحریروں کی بھرمار سے' خطابتوں انشاپردازیوں کی زور آزمائیوں سے؟ تالیف و تصنیفات کے انباروں سے؟ اخباروں و رسالوں کی بے شمار تعدادوں سے؟ خصوصی چمک بھڑک والے نمبروں سے؟ آئے دن کے جلسے جلوسوں سے؟ اپنی پرائی حکومتوں کے خلاف احتجاجوں شورشوں سے؟ مرن برتوں ستیہ گرہوں سے؟ نوکریوں چاکریوں میں عددی مطالبوں سے؟ سو ان چیزوں کی دوسروں کے ہاں کیا کمی ہے؟ ان میدانوں میں وہ پہلے بھی آپ سے آگے تھے آج بھی اور غالباً آئندہ بھی رہیں گے۔

اس سے بڑھ کر غیروں ہی کی نقل و نقالی میں خود دین و مذہب کا نام اور ٹھپہ لگا لگا کر کم و بیش سال کے تین سو ساٹھ (۳۶۰) دن چھوٹے بڑے عرسوں، عرسی میلوں ٹھیلوں، نیازوں، فاتحوں من گھڑت تہواروں اور اب روز افزوں میلادی

جشنوں کا جو دور دورہ ہے، ذرا ہم اپنے گریبانوں میں سر ڈال کر سوچیں کہ ان سے دوسروں کو ہماری اسلامیت کی اس کے سوا کیا شہادت ملتی ہے کہ ان کے یہاں دسہرہ ہے تو ہمارے ہاں محرم، ان کے ہاں دیوالی ہے تو ہمارے ہاں شب برات، ان کے ہاں جنم اسٹمی ہے تو ہمارے ہاں میلاد، اُن کے ہاں آئے دن نہان اور نہانی میلے ٹھیلے ہیں تو ہمارے ہاں عرس و عرسی میلے ٹھیلے، حد یہ کہ وہ جو کچھ مندروں میں کرتے ہیں وہی ہم کو مزاروں میں کرتا دیکھتے ہیں، ہماری اس اسلامیت کو دیکھ کر دوسرے کیا ایسی انوکھی بات دیکھتے اور پاتے ہیں جس بنا پر ان کے اندر اسلام کی طرف کوئی کشش یا اس کی تعلیمات کی تحقیق و تجسس کے لئے کوئی چونک پیدا ہو۔

رہا محض طلبِ حق کا سوال تو کتنوں کو اس کی اتنی لگن ہوتی اور عملاً اتنی فرصت ہو سکتی ہے کہ وہ سارے دھندوں کو چھوڑ کر خالص حق جوئی کی نیت سے بیسیوں مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کرے اور پھر اسلامی ایمان اور عمل صالح کی برتری کو پا کر اس کی طرف جھکے، اس کے علاوہ آدمی کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ زبان و قلم سے کم اور مثال و نمونہ سے زیادہ سیکھتا اور متاثر ہوتا ہے۔

ننگوں کی نو آبادی یا کلب میں جب سب ننگے ہی ننگے ہوتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے کسی شرم و لحاظ یا کسی بدنامی و رسوائی کا سوال ہی کیا تاہم ظاہری معاملات میں کھلے خزانے بدمعاملگیوں اور علانیہ فسق و فجور کی باتوں میں بہتوں کا اب بھی کچھ نہ کچھ بدنامی و رسوائی کا خیال ہاتھ پکڑ لیتا ہے لیکن بداخلاقیوں میں

غصہ، گرمی، بدگوئی وبدزبانی، سب وشتم کھلی کھلی شیخی وفخاری، خوشامد وچاپلوسی، وغیرہ کے علاوہ ریاو نفاق، بغض وحسد، نفس ونفسانیت، حرص وہوس، خودغرضی ودنیا پرستی وغیرہ جن اخلاقی بیماریوں کا تعلق قلب ونیت کے باطنی محرکات سے زیادہ ہے، ان میں عوام تو عوام نمبر شاید خواص ہی کا زیادہ بڑھا ہوگا، ان سے بھی زیادہ قلبی وخفی معاملہ خالص دینی وروحانی فضائل اخلاق، اخلاص وللّٰہیت، خوف وخشیت، صبر وشکر، تسلیم ورضا، توکل واستغنار، اللہ کی اور اللہ ہی کے لئے محبت وعداوت وغیرہ کا ہے کہ ان کا خفا تو اب فنا وفقدان کی اس انتہا تک جا پہنچا ہے کہ خانقاہیں جو اخلاق کے ان باطنی فضائل وکمالات ہی کی خصوصی تربیت گاہیں تھیں وہاں بھی مشکل ہی سے کہیں کوئی نشان ملتا ہوگا۔

اسلام کی تبلیغ وتفہیم میں عقائد وعبادات سے کہیں زیادہ اہم معاملات واخلاق ہیں

عقائد وایمانیات بُرے ہوں یا بھلے اسلامی ہوں یا غیر اسلامی ان کا تعلق تمامتر قلب و باطن سے رہتا ہے عبادات کی صورت میں ان کا جو کچھ یا جس طرح ظہور ہوتا ہے اس کا بھی تعلق عام مخلوق کے بجائے زیادہ تر عبد ومعبود یا بندہ وخدا کے درمیان محدود رہتا ہے اور مذہب کے متعلق جو یہ مشہور کردیا گیا ہے کہ وہ آدمی کا اپنا ذاتی وشخصی یا نجی معاملہ ہے یہ بھی انھیں مذاہب وادیان والوں کی نسبت درست ہے جنھوں نے غلط یا صحیح طور پر اپنے دین ومذہب کے تصور کو کچھ خاص عقیدوں اور ان کے مناسب پوجا پاٹ یا پرستش کی خاص خاص عبادتی رسموں کے اندر محدود کر رکھا ہے، باقی

اسلام جس کے دینی احکام نے انسان کی انفرادی اجتماعی تمدنی وتہذیبی اخلاقی ومعاشرتی، سیاسی ومعاشی پوری دنیوی زندگی کو گھیر رکھا ہے وہ نہ کسی فرد کا کوئی انفرادی وذاتی معاملہ ہوسکتا ہے اور نہ زندگی کے دنیوی معاملات سے الگ کرکے علماً وعملاً اس کے تصور ونمایندگی کا صحیح حق ادا ہوسکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اسلام کو سمجھنے سمجھانے پہچاننے پہچنوانے دونوں کے لئے عقائد وعبادات دونوں سے کہیں اہم واقدم مسئلہ معاملات واخلاق اور معاشرت ہی کا ہوجاتا ہے، بلکہ معاشرت کا معاملات واخلاق سے بڑھ چڑھ کر، اس لئے کہ لین دین وغیرہ کے معاملات تو ہر روز ملنے جلنے والے سے پیش نہیں آتے اخلاق میں بھی بُرے بھلے باطنی اخلاق یا دل کی خوبیوں خرابیوں کا تجربہ زیادہ طویل سابقہ ہی سے ہوتا ہے بخلاف معاشرت کے کہ گھر باہر سفر وحضر جہاں کہیں جب جس حیثیت میں بھی آدمی آدمی سے ملتا ہے تو میل جول یا نفس آدمیت کی برائی بھلائی سے، تو کہنا چاہیئے کہ ہر آن ہی سامنے آتی رہتی ہے جس میں مذہب وملت رشتہ وقرابت، ذات پات، دوستی ومحبت وغیرہ کے تمام تعلقات سے قطع نظر کرکے انسان کا صرف انسان کی حیثیت میں تجربہ ہوتا رہتا ہے اسی کا نام انسانیت یا آدمیت ہے۔

اس انسانیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کیا حیوان کو بھی ہماری ذات یا کسی چھوٹی بڑی حرکت سے بلا وجہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف واذیت بھی نہ پہنچے

پائے، ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ ہیں اس انسانیت کی اہمیت و وسعت کا اندازہ اسلام کی نظر میں اس سے کرو کہ راستہ سے کسی ایسی چیز کا ہٹا دینا جس سے چلنے والوں کو تکلیف کا احتمال ہو اس کو بھی خود ایمان کا ایک شعبہ یا لازمہ قرار دیا گیا ہے اور جس کا اجر بھی دنیوی نہیں خالص دینی و اخروی اتنا عظیم ہے کہ حدیث ہی میں آتا ہے کہ کسی نے راہ میں کوئی پُرخار شاخ پڑی دیکھ کر اس کو ہٹا دیا تاکہ راہ گیروں کو تکلیف نہ ہو تو اسی پر اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشدیا تکلیف سے بچانا ہی نہیں راحت پہنچانا بھی اسلامی معاشرت کا اتنا وسیع و عظیم باب ہے۔

کسی کا دل خوش کرنے کے لئے کوئی خوش کن بات کہدینا روپیہ پیسہ کی خیر و خیرات ہی کی طرح ایک کارِ خیر یا صدقہ (چیریٹی) ہے متفق علیہ حدیث ہے کہ الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ ۔ حدیث ہی میں نہیں خود کتاب اسلام میں بھی قانونِ استیذان اور مجلس میں اٹھنے بیٹھنے راستہ میں چلنے پھرنے کی بعض انتہائی جزئیات معاشرت تک کے اوامر و نواہی موجود ہیں[1]۔

---

[1] حکیم الامتؒ کا تو بلا شرکت غیرے یہ خاص و خصوصی بڑا تجدیدی کارنامہ ہے کہ معاشرت کے احکام کو بعض حیثیات سے عقائد و عبادات و معاملات سب سے اہم و اقدم قرار دیا ہے، عقائد و عبادات سے تو اس لئے کہ ان میں خلل بے اپنا ہی ضرر ہے، اور معاشرت میں خلل سے دوسروں کا اور دوسروں کو ضرر پہنچانا اشد ہے اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے۔ اور معاملات پر گو معاشرت اس حیثیت سے مقدم نہیں کہ معاملات کے خلل سے بھی دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے مگر ایک دوسری حیثیت سے معاملات سے بھی اہم ہے، وہ یہ کہ عوام نہ سہی مگر خواص معاملات کو داخل دین سمجھتے ہیں اور معاشرت کو بجز اخص خواص کے بہت سے خواص بھی داخل دین نہیں سمجھتے (باقی بر صفحہ آئندہ)

عہ جامع المجددین صفحہ ۵۰۰

غرض ذات وصفات کے اعتبار سے ہمہ گیر توحیدی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا تو یہ غیر منفک لازمہ ومطالبہ ہی ہے کہ اعمال صالحہ کے اعتبار سے بھی مسلمان کی زندگی ہمہ گیر ہو اور دوسری امتوں کے حق میں مسلمان خیرامۃ یا شہادتِ عمل

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اور بعض جو سمجھتے بھی ہیں وہ معاملات کے برابر اس کو مہتم بالشان نہیں مانتے اور اس وجہ سے عملاً اس کی پرواہ کم کرتے ہیں:-

"غرض معاشرت کا تمام اجزاے دین سے کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل الوجوہ مقدم مہتم بالشان ہونا ثابت ہے مگر اس کے باوجود عوام کا تو بکثرت اور خواص میں بھی بعض کا تو اس کی طرف خود عملاً بھی کم التفات ہے اور اگر کسی نے خود عمل کرلیا تو دوسروں کو خواہ وہ اجنبی ہو یا اپنے متعلقین ہوں ان کو روک ٹوک یا تعلیم واصلاح کرنا تو مفقود ہی ہے۔" [۱]

مفقود کیا معنی اکثر اچھے خواص واکا برتوان باتوں میں روک ٹوک سخت گیری تو کیا رواداری بلکہ اُلٹے تعلیم وتبلیغ کی نام نہاد حکمت ہی کے منافی جانتے ہیں، باقی عملاً اس پر عمل تو اخص خواص کیا صرف وقت کے مجددِ تھانوی ہی کے ہاں دیکھا فرماتے بھی تھے "احقر مدتوں سے اپنے متعلقین کو ایسے مواقع پر زبانی احتساب کرتا رہتا ہے گو اس میں اتنی خطا ضرور ہے کہ بعض وقت مزاج میں حدت پیدا ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ معاف کرے اور اکثر وعظ میں ایسے امور کی تبلیغ کرتا ہوں" [۲]

اور کیوں نہ کرتے یا محض (حدتِ مزاج) کی وجہ سے دین کے ایسے مہتم بالشان حصہ کی تجدید سے بے اعتنائی فرماتے جس کو عوام وخواص سب

"لوگوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال دیا ہے سمجھتے ہیں کہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر وشغل تلاوت قرآن نفلیں بس ان چند چیزوں کے متعلق احکام ہیں آگے جو چاہیں کرتے پھریں، جس کے معنی آجکل آزادی کے ہیں، سو خوب سمجھ لو کہ تم کو ہرگز ہرگز آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا ہے مثل بھینسے اور سانڈ کے کہ جس کے گیہوں چاہے کھالیں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

[۱] و [۲] جامع المجددین صفحہ ۵۰۱ و ۵۰۲ -

جب ہی بن سکتے ہیں جب عملی طور پر عقائد و عبادات یا دینیات سے بھی زیادہ معاملات و اخلاق اور معاشرت میں اسلام اور رسول اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی اور اسوۂ حسنہ کا کسی معتدبہ و نمایاں درجہ میں نمونہ ہوں، اس لئے کہ دیکھنے والے کو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) جس کے جتنے چاہیں کھالیں، سو ہم کو ایسا نہیں چھوڑا گیا ہے
بلکہ شریعت نے ہماری رفتار، گفتار، نشست و برخاست، لین دین، کھانے پینے
ہر چیز سے تعرض کیا، شریعت مکمل قانون ہے[1]۔

اس "مکمل قانون والی شریعت" کے مزاج شناس کی مجلس میں معاشرت کی بات بات پر احتساب اور روک ٹوک کو دیکھ کر جن لوگوں نے بزرگی نام بے حسی کا سمجھ رکھا ہے (بلکہ بہت سے بزرگوں نے خود ہی اس کو اپنا کمال سمجھ سمجھا رکھا ہے) ان کو حضرت کی مجلس میں بڑا اچنبھا ہوتا تھا کہ "ہم تو بہت بزرگوں کی مجلس میں گئے لیکن کہیں ایسی باتوں پر روک ٹوک نہیں دیکھی"۔

ایسوں کو حضرت کا جواب سنئے کہ بھائی میں تو اپنی مجلس کو بزرگوں کی مجلس نہیں بنانا چاہتا آدمیوں کی مجلس بنانا چاہتا ہوں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ شاہ صاحب بننا آسان، ملک التجار بننا آسان، بزرگ بننا آسان، قطب بننا آسان مگر انسان بننا مشکل . . . . اور یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ بزرگ بننا ہو، ولی بننا ہو، قطب و غوث بننا ہو تو کہیں اور جاؤ اور اگر انسان بننا ہو تو میرے پاس آؤ میں انسان بناتا ہوں[2]۔

اس سلسلہ میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے کہ

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند — ایں جملہ شدی و لے مسلماں نشدی

اور چونکہ مسلمان ہونا ہی عین انسان ہونا ہے بلکہ بے مسلمان ہوئے انسان ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں اسلئے دوسرے مصرع میں تصرف فرما دیتے کہ "ایں جملہ شدی ولیکن انسان نشدی" اور خود اس تھانوی "**انسان گر**" بہ "اسلامیت" والی انسانیت کا جیسا جمال دیکھا اس کو آنکھیں ڈھونڈھتی اور ترستی ہی رہیں خدا بھلا کرے ہمارے مولانا دریاآبادی سلمہ کے کمال قلم کاری کا کہ اس نے انسانیت و اسلامیت کے اس جامع مرقع کو جہاں تک کوئی قلم محفوظ کر سکتا ہے الحمد للہ کہ دوسروں کیلئے بھی حکیم الامت میں خوب ہی خوب محفوظ فرما دیا ہے۔ احسن اللہ جزاء۔

[1] جامع المجددین صفحہ ۵۰۲۔ [2] ایضاً ص ۵۰۲ [3] ایضاً ص ۳۶

ہمارے ایمانیات و عبادات سے زیادہ دکھائی زندگی کے یہی تینوں شعبے پڑتے ہیں، اپنے پرائے جانے انجانے سب کو گھر باہر سابقہ ہمارے معاملات اخلاق اور سب سے بڑھ کر معاشرت یا ہماری انسانیت سے پڑتا ہے اور ان سے چونکہ ہر شخص کا براہِ راست دنیوی نفع و ضرر مفاد و مضار وابستہ ہوتا ہے اس لئے قدرۃً وہ ہمارے تلخ و شیریں عمل کے پھلوں ہی سے ہمارے ایمان کے درخت کو پہچانتے اور اس کی طرف بڑھتے یا اس سے بھاگتے ہیں۔ اسی عظیم و اہم حقیقت کو حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے اپنی تجدیدی جامعیت کے قل و دل جامع الفاظ میں اس طرح واضح فرمایا ہے کہ

"وقوع میں اظہر و اکثر یہی تینوں (معاملات اخلاق اور معاشرت) ہیں کیونکہ عقائد کا حصہ گو الزم یا لازم زیادہ ہے مگر اظہر نہیں (یعنی دل سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہ دوسروں پر زیادہ ظاہر نہیں ہوتا) اور دیانات کا حصہ خاص خاص اوقات میں ظاہر ہوتا ہے، پس وقوع میں اکثر نہ ہوا بخلاف اس کے آخر کے تینوں اظہر بھی ہیں اور اکثر بھی۔

اس بنا پر دیکھنے والوں کو اکثر افرادِ امت میں یہ انقلاب عظیم ہر وقت ہی نظر آئے گا تو جو شخص ہر وقت یہ انقلابِ عظیم دیکھے اور پھر یہ دعویٰ سُنے کہ میں محمدؐ کی امت میں ہوں تو وہ شخص حیرت میں واقع ہو گا کہ یا اللہ یہ شخص کس بات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے جو ایسا دعویٰ کرتا ہے"[1]۔

---

[1] جامع المجددین ص ۲۶۸۔

مطلب وہی ہوا کہ جب بحیثیت امت، | جب تک امتِ مسلمہ خود کو "خیرامت" کے معیار پر نہیں پہنچائے گی انسانیت خسران سے نہیں بچ سکتی!!

امتِ محمدیہ کے وہ مرئی اعمال واخلاق جو دوسروں کو دکھائی دیتے اور جن سے ان کو زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، جب ان میں محمدی اسوۂ حسنہ یا ایمان باللہ وبالآخرت پر مبنی اسلامی اعمال صالحہ کا کوئی مرئی و محسوس مشاہدہ کیا معنی اُلٹے دن رات خلاف ہی شہادت ملتی رہتی ہے تو پھر دوسری امتوں یا قوموں کے لئے ہم مسلمانوں کے اندر خیر وفلاح کا کونسا سبق رہ جاتا ہے جس کی بنا پر اُن کو اسلام کی طرف کوئی جذب وکشش ہو، جب نمک ہی بے نمک ہو کر رہ گیا ہو تو دوسری چیزوں کو نمکین کہاں سے بنایا جا سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد خیرامت کے مقام پر جس اُمت کو کھڑا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ پوری انسانیت کے حق میں روشنی کا مینار بن کر قولاً وعملاً خیر ومعروف کا راستہ دکھاتی اور شر ومنکر کی گمراہیوں سے بچاتی رہے، جب وہی من حیث الامت کم وبیش ہر طرح عملاً "شرامۃ" بن کر رہ گئی تو پھر دنیا بھر میں اب گھٹا ٹوپ اندھیرے پر اندھیرا چھاتے جانے میں تعجب کی بات ہی کیا اور انسان کو انسان بنانے یا زیان وخسران سے بچانے کی صورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

سب سے زیادہ سوچنے سمجھنے کا سوال یہ ہے کہ جس دین کامل نے اپنے ماننے والوں پر صرف اپنے ایمان وعمل کی جوابدہی عائد نہیں کی بلکہ "خیرامت" بن کر دنیا کی تمام دوسری امتوں یا قوموں کی فلاح واصلاح کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے، اس نے کیا خیرامت بننے اور بنے رہنے کا کوئی نظم ونظام نہ عطا فرمایا ہوگا؟ آگے انشاء اللہ

اسی سوال کا جواب آتا ہے۔

یہ جواب وہی "تواصی بالحق"، یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایسا ہمہ گیر نظام وانتظام ہے کہ گویا ہر اپنا پرایا امت کا کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی طبقہ اپنے محل و مقام کے مناسب اس کے افادہ واستفادہ سے باہر اور محروم نہ رہنے پائے۔ یہ جب ممکن ہے کہ کسی بڑے چھوٹے ملکی معاشرہ میں ایک پوری کی پوری مستقل جماعت کا کام اسلامی زندگی و شریعت کے ہر شعبہ کے احکام ——— جن میں ظاہر ہے کہ خود معروف و منکر کے امر ونہی کے احکام بھی داخل ہیں ——— ان کی تحصیل و تعلّم اور پھر عمر بھر ان کی قولاً و فعلاً دعوت واشاعت اور تعلیم و تبلیغ ان کا خاص دینی و منصبی فریضہ ہو، سورۂ آل عمران کی مشہور و معروف آیت ہے کہ

"یہ امر نہایت ضروری ہے کہ تمہارے اندر ایک ایسی	وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ
جماعت موجود رہے جو لوگوں کو خیر (یا بھلائی) کی	اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
طرف بلاتی اور معروف (یا نیک کاموں) کے	وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ
کرنے کی تاکید کرتی اور منکر (یا برے کاموں)	(۳/۱۰۴)
سے روکتی رہے۔"	

یہی دعوتِ خیر اور معروف و منکر کا امر ونہی حضرات انبیاء اور نبی الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاص انبیائی و منصبی فریضہ اور ان کی بعثت کا خصوصی مقصد اور مشن تھا، اس میں وہ کامیابی و ناکامی کے نتائج سے قطع نظر کر کے بھی زندگی بھر لگے رہنے

کے لئے مامور تھے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھو کہ باوجود اور بظاہر اس انتہائی ناکامی و ہمت شکنی کے کہ لوگوں کو جتنا بلاتے ہیں اتنا ہی وہ بھاگتے ہیں (لَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآئِیْٓ اِلَّا فِرَارًا (پ ۲۹)) پھر بھی لگے سیکڑوں سال کی طویل عمر پاکر عمر بھر، دن رات بلانے (دعوت و تبلیغ) ہی میں رہے (دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا (پ ۲۹)) یہی حال تمام حضرات انبیاء کا رہا کہ ان کی زندگی کا پیش نہاد نہ کھانا کمانا ہوتا ہے، نہ اہل و عیال، نہ ملک و مال اور نہ نام و نہاد سیاسیات و معاشیات کی کوئی دعوت و رعایت بلکہ اس کے بجائے تمام تر معادیات کی فلاح و خسران کے مدنظر ایمان و عمل صالح کی ایک ہی دعوت ہے جس کی طرف بلانے کی لگن ہے، تن من دھن سب کی بازی اسی پر لگ رہی ہے، اسی سلسلہ میں کسی کسی کو استثنائی طور پر دولت و حکومت بھی کسی خاص غیبی حکمت و نصرت کے تحت عطا ہوگئی، ورنہ زیادہ اور بہت تعداد ایسے ہی انبیاء علیہم السلام کی ہے جن کو جاہ و مال، دولت و سلطنت سے دور کا بھی کوئی لگاؤ نہیں ملتا، قال و حال، علم و عمل دونوں سے اپنی والی ساری جدوجہد بس پہنچانے ہی پہنچانے یا "رسالت و پیغام بری" کا فرض ادا کرنے ہی کی رہی، خواہ کوئی سنے نہ سنے، مانے نہ مانے، ایسے بھی گذرے ہیں جن کی دعوت و پیغام کو ماننے سننے والا ایک بھی معلوم نہیں۔

علماء کی خصوصی ذمہ داری اور ان کا امتیازی مقام

اسی دعوتِ خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی انبیائی وراثت کے وارث براہِ راست امت کے علما ہوتے ہیں

العلماء ورثۃ الانبیاء ـــــ امام غزالیؒ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ "درجۂ نبوت کے زیادہ سے زیادہ قریب اہلِ علم اور اہلِ جہاد ہوتے ہیں" اہلِ علم اس لئے کہ وہ رسولوں کی لائی ہوئی باتوں کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اہلِ جہاد اس لئے کہ وہ رسولوں کی لائی ہوئی چیزوں کو قائم کرنے کے لئے تلوار سے کوشش کرتے ہیں"[۱] خصوصاً ختمِ نبوت کے بعد امتِ مسلمہ کے علماء اپنے کام و مقام کے لحاظ سے انبیاء ہی کی حیثیت رکھتے ہیں، علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ـــــ بلکہ امام غزالیؒ ہی نے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (۳/۱۸۷) کی ایک تفسیری حدیث نقل فرمائی ہے جس کی بنا پر علماء کی حیثیت انبیاء اور ان کے ورثا کی کیا معنی خود براہِ راست اللہ تعالیٰ سے انبیاء ہی کی طرح اسی میثاق و معاہدہ کی ہے کہ "جو کچھ علم انھوں نے حاصل کیا ہے اس کو چھپا کر نہ رکھیں گے بلکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و تبلیغ کرتے رہیں گے"۔[۲]

مقصود و طریق کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے | ذاتی علم و ایمان و تقوے کے اعتبار سے انبیائی حیثیت و وراثت کا مقام رکھنے والے علماء کمیاب ہونے پر بھی نایاب بحمد اللہ اب

---

[۱] اقرب الناس من درجۃ النبوۃ واھل العلم والجھاد اما اھل العلم فدلوا الناس علیٰ ماجاءت بہا الرسل واما اھل الجھاد فجاھدوا باسیافھم علی ما جاءت بہ الرسل (احیاء العلوم باب فضیلۃ العلم)

[۲] قال صلے اللہ علیہ وسلم ما اتی اللہ عالماً علماً الا واخذ علیہ من المیثاق ما اخذ علی النبیین ان یتبینوہ للناس ولا یکتمونہ۔

بھی نہیں لیکن ایک بہت بڑی غلطی یا غلط فہمی خدا جانے کیسے راہ پا گئی ہے کہ دعوتِ خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کے اصل مقصد و خدمت کے بجائے، بہت زیادہ بلکہ کہنا چاہئے سارا زور اس کے وسائل و مقدمات پر اس طرح لگایا جا رہا ہے کہ گویا وسائل ہی مقاصد ہیں۔

حضرات انبیاءؑ نہ مدرسے قائم کرنے تشریف لاتے تھے، نہ کتب خانے کھولنے نہ کتابیں لکھنے، نہ رسالے نکالنے، نہ انجمنیں اور جماعتیں بنانے، نہ جلسے اور تقریریں کرنے بلاشبہ ان چیزوں سے وسائل کا ——— بہ نظر وسائل و بقدر وسائل ——— کام لینا وقتی مصالح و حالات کے لحاظ سے ضروری ہے لیکن مرجع و منتہا تو ہر وسیلہ یا راستہ کے ہر ہر قدم کا بالذات منزل مقصود ہی رہنا چاہئے، اس منزل و مقصد ہی کے اوجھل ہو جانے کا نتیجہ ہو رہا ہے کہ مثلاً مدرسوں پر مدرسے قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں، سیکڑوں ہزاروں کی تعداد ان سے فراغت کی سندیں لے لے کر نکلتی رہتی ہیں، با ایں ہمہ خال خال ہی ان میں کسی کو اس کا شعور و احساس ہوتا ہوگا کہ یہ علم انھوں نے خود عمل کرنے اور دوسروں کو علم و عمل کے اسی خیر کی طرف بلانے یا معروف و منکر کے امر و نہی کے لئے حاصل کیا ہے، بڑا سبب اس کا وہی عام مغالطہ ہے کہ جس علم کا اصل مقصود خود عمل اور دوسروں کو دعوتِ عمل تھا وہ بطور "علم برائے علم" خود ہی مقصود و معبود بن کر رہ گیا ہے، علم بھی اس طرح کا کہ کتابوں کا ایک مقررہ نصاب پورا کر کرا کے ——— خواہ کتابی استعداد بھی پوری نہ ہو ——— جو بھی

اُلٹا سیدھا امتحان پاس کرلے اس کو عالم دین ہونے کی سند تھما دی جاتی ہے حد اس ضابطہ پرستی کی یہ ہے کہ بہتیرے اہلِ علم جو علم و دین کی خدمت ان سندی وامتحانی عالموں سے ہزاروں درجہ بڑھ چڑھ کر کررہے ہیں وہ بہتوں کی نظر میں عالم صرف اس لئے نہیں کہ نہ انھوں نے کسی دارالعلوم کی سند حاصل کی نہ کہیں دستاربندی ہوئی!

قدم قدم پر بار بار حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ کی حکیمانہ تجدیدات یاد آتی ہیں، جبتک دورانِ تعلیم میں ساتھ ہی ساتھ عمل کا بھی امتحان نہ ہوجائے محض کتابی امتحان و نتیجہ کی بنیاد پر سند عطا کردینا خیانت تصور فرماتے تھے، کیونکہ یہ سند دراصل مقتدائے دین ہونے کی سند ہوتی ہے، لہذا علم کے ساتھ مقتدا کے عمل کا بھی معتدبہ درجہ تک امتحان و لحاظ لازم ہے، بلکہ **مولوی** کی تعریف ہی "عالم باعمل" فرمائی ہے، اور یہ تجدید کوئی "ایجادِ بندہ" نہیں، ارشادِ رسولؐ کی محض تجدید و تذکیر ہی ہے، حضورؐ ہی نے فرمایا ہے کہ "آدمی اس وقت تک عالم نہیں جب تک اپنے علم پر عامل بھی نہ ہو ——— لا یکون المرء عالماً حتی یکون بعلمہ عاملاً[1] ——— ضرورت تھی کہ خالص دینی تعلیم گاہوں کے طلبا میں اس احساس وشعور کو برابر ابھارا اور جگایا جاتا رہتا کہ ان کا عمر بھر کا حقیقی کام و مقام وہی ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا تھا، اس سے نہ صرف حضرت نبی الانبیاء علیہ التسلیم

---

[1] احیاء العلوم باب ۶ جس میں علمائے آخرت اور علماء سوء کی علامات کا بیان ہے۔

والنتیجہ کے "اسوۂ حسنہ" کی اتباع کا ذوق و ولولہ پیدا ہوتا بلکہ صحیح ایمانی و اسلامی خودی و خودداری کی تربیت ہوتی۔

ہمارے دینی کام بھی انبیائی روح سے محروم ہیں

دینی مدارس ہی پر کیا موقوف، دینی تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر، مجالس و مجامع سب کی حیثیت انبیائی وراثت و نیابت کی جگہ بالعموم دنیوی پیشوں کی طرح زیادہ سے زیادہ بس دینی پیشوں کی ہو کر رہ گئی ہے، جو وسائل بھی مقاصد کی روح سے خالی ہو جائیں بے جان پیشہ و رسم ہی بن کر رہ جاتے ہیں، نتیجہ ایک ہی ہے کہ ہمارے خالص دینی دارالعلوموں کی بے جان مشینوں کے ڈھالے ہوئے علما بھی اکثر خالص دنیوی اسکولوں، کالجوں کے تعلیم یافتوں کی طرح اپنے علمِ دین سے بھی زیادہ تر دنیا ہی کے کسب و حصول کی راہیں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں یا جو تھوڑے بہت دین ہی کے نام سے تقریری و تحریری علمی و تعلیمی بلکہ دعوت و اصلاح کی بالکلیہ انبیائی خدمات میں لگ بھی جاتے ہیں وہ بھی انبیائی روح و ارادہ سے دور ہی ہوتے ہیں۔

اچھے اچھے علما و مخلصین بھی آج غیر شعوری طور پر دنیا پرستانہ دعوتوں سے مرعوب ہیں!

انبیائی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو خدا و آخرت پر غیر متزلزل ایمان و ایقان یا ان کا نہایت زندہ اور جاندار تعلق و تصور ہوتا ہے، زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام میں ان کی نظر تمام تر خلق کے بجائے خالق اور دنیا کے بجائے آخرت پر ہوتی ہے، یہی راز ہے کہ ان کی دعوت و اصلاح کا رخ براہِ راست نہ معاشیات و سیاسیات کے کسی خاص

نظریہ و نظام کی طرف ہوتا ہے، نہ کسی خاص تہذیب و تمدن یا ثقافت کے وہ داعی و مبلغ ہوتے ہیں کہ یہ دراصل ہر بہر کے دنیوی زندگی ہی کی دعوت و رعایت ہے، مگر اب ہمارے اچھے اچھے علم و اخلاص والے علما و صلحا تک مغرب اور مغرب پرستوں کی اِن دنیا پرستانہ دعوتوں سے غیر شعوری طور پر اتنا مسحور و مرعوب ہیں کہ ان کی تقریروں و تحریروں میں ثقافت و انسانیت، سیاست و معیشت کے ورد و تکرار کے مقابلہ میں خدا و آخرت کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا بھی ہے وہ اس طرح لپیٹ میں گویا (معاذ اللہ) شرما شرمی کہ دین بیزاروں کی نظر میں کہیں خدانخواستہ یہ "ملا ازم" کے مجرم نہ ہو جائیں۔

ہمارے مخلصین و صادقین کی یہ کمزوری بھی دراصل دین بیزار مغرب کے سیاسی غلبہ و پروپیگنڈہ کی ساحری ہے کہ نادانستہ خالق کے مقابلے میں خلق اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا ان کی نظروں میں بھی اتنی سما گئی ہے کہ خدا و آخرت پس پشت پڑ جاتی ہے یا پھر اس حکمت و مصلحت میں ایسا غلو ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا پرست اپنی دنیا ہی کی خاطر دین کی ضرورت کو کچھ تسلیم کر لیں، نیک نیتی کے ساتھ دنیا کے لالچیوں کے حق میں اس مصلحت کی مناسب رعایت قابل ملامت ہرگز نہیں، بشرطیکہ خدا و آخرت کے ذکر و تذکیر سے یہ مصلحت علانیہ طور پر مغلوب نہ نظر آئے۔ حضرات انبیاؑ کی خاص شان یہی ہے کہ ان کی دعوت میں خدا و آخرت کے سوا بالذات کسی دوسری شے کے مطلوب و مقصود ہونے کا شائبہ و شبہ تک راہ نہیں پاتا، نہ ان کی نظر کسی

اجر وصلہ کے لئے قطعاً غیر اللہ پر پڑتی ہے اور لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ (۱۱/۲۹) کا جو بہ تکرار مختلف انبیاءؑ سے اعلان کرایا گیا ہے سچ پوچھئے تو ان کے اس قال کا قدم قدم پر ان کے حال ہیں تجربہ ہی ان کی نبوت کی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے کہ غیر معاندانسانی فطرت کے لئے اس کا دور کرنا آسان نہیں ہوتا۔

دینی مدارس ہیں قال سے بڑھ کر حال کی تربیت ضروری ہے

ہمارے دینی مدارس اور اداروں ہیں بھی جب تک قال کی تعلیم کے ساتھ اس سے بڑھ کر حال کی اس تربیت کا پورا اہتمام نہ ہوگا اس وقت تک نہ وہاں کا علم میراث انبیاء ہوگا، نہ وہاں سے وراثتِ انبیاء کا حق ادا کرنے والے علماء پیدا ہوں گے۔ نبوت کا وارث تو وہی عالم ہے جو کتابوں سے کہیں زیادہ خود خدا کو جانتا اور اس کی ذات وصفات کا خالی کتابی نہیں حالی علم رکھتا ہو جس کی پہچان ہی ہے کہ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و خشیت اتنی غالب ہو کہ غیر اللہ سے امید وبیم اگر مفقود نہیں تو مغلوب یقیناً ہو، سرورِ انبیاءؑ (فداہ ابی وامی) کا ارشاد ہے کہ "میں تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں ——— انا اعلمکم باللہ واخشاکم اللہ ——— اسی حقیقت حال کا اظہار بلکہ خود اللہ ہی کے اس ارشاد کی ترجمانی ہے کہ اللہ سے ڈرنے کا حق تو بس اس کے جاننے والے بندے ہی ادا کرتے ہیں ——— اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸) ——— یعنی علم دین جس کی جان خدا کو جاننا پہچاننا ہی ہے وہ مرادف ہے، خدا سے ایسے تعلق کے جو زندگی کے سارے

اعمال معاملات میں خالق کی خشیت کو مخلوق و دنیا کے ہر اجر و صلہ خوف و طمع پر غالب کردے، اسی حدیث کی تفہیم میں حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے ہماری نام نہاد دینی تعلیم و تعلم اور اس کے علماء کا کیسا حسرتناک حال بیان فرمایا ہے کہ

"علم کو میراث انبیاءؑ کہا جاتا ہے، تو اب دیکھ لو کہ انبیاء کی میراث کونسا علم ہے کیا انبیاءؑ کا علم نعوذ باللہ ایسا ہی علم تھا جس میں محض مسائل و اصطلاحات کا تلفظ ہو اور خشیت کا نام نہ ہو۔ . . . . اب ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں، پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔

. . . . اس طرح تعلیم و تعلم کو مقصود سمجھ لینا حد سے تجاوز ہے۔"

غرض مطلوب شرعی (یا دینی) علم وہی ہے جو اپنے اثر کے ساتھ ہو جیسے تلوار وہی مطلوب ہے جس میں کاٹ ہو، ورنہ برائے نام تلوار ہو گی، . . . . . .

اسی کو کہتے ہیں

علم چہ بود آں کہ رہ بنما یدت	زنگ گمراہی ز دل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند	خوف و خشیت در دلت افزوں کند
تو نہ دانی جز یجوز لایجوز	خود نہ دانی تو کہ جوزی یا عجوز"[1]

قرآن محض کتاب ہدایت نہیں بلکہ نظام ہدایت ہے!	کون نہیں جانتا کہ اب ہمارے علوم دین کے بڑے بڑے دار العلوموں کے علم کا جائزہ زیادہ تر بس "یجوز و لا یجوز" کا علم ہی ہو کر

[1] تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۱۶۱-۲

رہ گیا ہے، خود اپنے قال کو حال بنانے یا ایمان و علم کو قلب و قالب کے اعمالِ صالحہ سے سنوارنے کے بعد بلکہ ساتھ ساتھ اب دیکھئے کہ اسی علم و عمل کی دعوت و اصلاح یا دوسروں تک اس علم کو پہنچانے اور ان کے عمل کو سنوارنے کے لئے خود کتاب و سنت نے کیا نظامِ عمل عطا فرمایا ہے، راقم عاجز ہمیشہ کہا کرتا ہے کہ کتابِ اسلام صرف "کتابِ ہدایت" نہیں، **نظامِ ہدایت** بھی ہے، یہ نظام کیا ہے؟ اور اس کو وقت کے زمانی و مکانی احوال و ظروف خصوصاً ہندوستان و پاکستان میں کیونکر بروئے کار لایا جاسکتا ہے، اس کا ایک پورا خاکہ تو ایک مستقل کتاب — تجدید تعلیم و تبلیغ — میں پیش کیا جا چکا ہے، یہاں اس نظام کے ایک بڑے اور اہم جزو پر خصوصیت سے توجہ دلانی ہے کہ اصلاح و ہدایت کا سب سے مؤثر و کارگر جزو وہی ہے اور اسی سے سب سے زیادہ غفلت ہے۔

سورۂ والعصر میں اس کی خاص تعبیر

سورۂ والعصر میں اسی کی خاص تعبیر "تواصی بالحق و تواصی بالصبر" ہے اور کتاب و سنت کی عام اصطلاح **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** ہے یعنی ہر جانی پہچانی بھلائی کا ایک دوسرے کو حکم و تاکید کرتے رہنا اور ہر چھوٹی بڑی برائی سے باز رہنے کی کوشش کرتے رہنا، خواہ اس کا برا بھلا ہونا ہم نقل و شرع سے پہچانتے ہوں یا عقل و تجربہ سے، مسلمان جس طرح خود اس معروف کو پہچان کر اس پر چلنے اور منکر کو جان کر اس سے بچنے کا مامور و مکلف ہے اسی طرح دوسروں کو بتلانے چلانے اور بچانے کی امکانی جد و جہد کا فرض بھی اس پر

انفرادی و اجتماعی دونوں طرح عائد ہے اور جس طرح خود اپنے نیک و بد معروف و منکر کے معاملہ میں اس سے مواخذہ ہوگا، اسی طرح مقدور بھر دوسروں کو معروف پر چلانے اور منکر سے بچانے میں اس سے جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کا بھی جواب دہ ہوگا اور دنیا و آخرت دونوں ہی میں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ حضرت امام غزالیؒ کا اسی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب میں احیاء العلوم میں ارشاد ہے کہ

"دین کا یہ مدار اعظم ہے، یہی وہ مہم ہے جس کے لئے تمام انبیاءؑ بھیجے گئے، اگر اس کی بساط اُلٹ دی جائے اور اس کے علم و عمل کو ترک کر دیا جائے تو نبوت ہی معطل و بے کار ہو جائے دین مضمحل ہو جائے، سستی و گمراہی اور جہالت عام او عالمگیر ہو جائے، ملک برباد اور مخلوق تباہ ہو جائے حتیٰ کہ پھر اس تباہی کا احساس تک (انسان مرجائے کہ) قیامت تک نہ ہو۔"

اس کے بعد انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر نہایت حسرت سے فرماتے ہیں کہ جس کا ڈر تھا آخر وہ ہو کر رہا یعنی

"دین کے اس مدار اعظم کا علم و عمل جاتا رہا، حقیقت بھی بالکل مٹ گئی، اور صورت بھی، نتیجہ یہ ہے کہ دلوں پر مخلوق کی مداہنت و خوشامد چھا گئی اور خالق کا ڈر نکل گیا، لوگ نفس پرستی اور شہوت رانی میں جانوروں کی طرح آزاد ہو گئے روئے زمین پر ایسا سچا مومن ملنا دشوار ہو گیا جو خدا کے معاملہ میں بندوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔"

معروف و منکر کے قرآنی نظام کے پنجگانہ اجزار

(۱) ایک مستقل جماعت یا امت در امت کی ضرورت!

معروف و منکر کے اس قرآنی نظم و نظام کا سب سے پہلا اہم و اقدم جز یہی ہے کہ اسلامی معاشرہ و امت میں ہمیشہ ایک ایسی مستقل جماعت یا امت در امت موجود رہے جس کی زندگی کا خاص و خصوصی مقصد اور مشن ہی یہ ہو کہ سب کام چھوڑ کر لوگوں کو خیر کی طرف بلانے، معروف کا امر اور منکر سے نہی کرتی رہے۔ یہی جماعت صحیح معنی میں علماء کی جماعت ہے جیسا کہ اوپر اچھی طرح واضح ہو چکا۔ یہ جماعت جس طرح دنیوی یا معاشی علوم و فنون کے بجائے طلب علم یا طالب علمی کی پوری زندگی دینی و معادی علوم و احکام کے حصول میں صرف کرتی ہے اسی طرح فراغت کے بعد ان کی تمام عمر کا اصلی و منصبی فریضہ سارے کاموں سے بڑھ کر بلکہ ان کو چھوڑ کر انبیائی وراثت کی یہی خدمت ہو کہ ان علوم و احکام کی تعلیم و تبلیغ، اشاعت و دعوت اور امر و نہی میں لگے رہیں۔ جب ان ہی نے سب سے زیادہ دین اور دینی اوامر و نواہی کے علم کو حاصل کیا اور ان کو جانا پہچانا ہے تو قدرتاً ان ہی کو سب سے زیادہ دوسروں کو پہنچوانے یا ان تک پہنچانے کا حق بھی حاصل ہے اور لازماً ان ہی پر سب سے زیادہ امر و نہی کا فرض بھی عائد ہے اور ان ہی کے اس حق کو علماً و عملاً کما حقہ ادا کرنے اور فرض کو پوری طرح پورا کرنے سے امت کے باقی طبقات کو بھی احساس ہوگا کہ معاشی و دنیوی مشاغل

اور خود اپنے ایمان و عمل صالح کی فکر و اہتمام کے ساتھ ساتھ اپنے خاص زیر نگرانوں عزیزوں، دوستوں اور عام مسلمانوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہنا بھی ان کے ایمانی و اسلامی فرائض ہی میں داخل ہے اور اپنے محل و مقام یا حدود کے اندر کسی طرح اس فرض کو انجام دیتے رہنا چاہیئے، جب حضرات علما "مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء) کی استغنائی ہمت و عزیمت کے ساتھ بلا مداہنت اپنے اس فرض کو پاس پڑوس گاؤں، گاؤں، بستی بستی اور محلہ محلہ زیادہ تر وعظ و تقریر یا اپنی مجلسوں میں خطاب عام و خاص کے ذریعہ مسلسل فرماتے اور بار بار لوگوں کو جھنجھوڑتے رہیں گے، تب ہی جا کر پوری امت ملکی معاشرہ کے ہر ہر طبقہ اور ہر ہر فرد کو بھی اس بارے میں اپنے اپنے انفرادی واجبات کا علم و احساس ہوگا کہ جس طرح ہمارے ذمہ مثلاً اپنے بال بچوں کے کھانے پینے رہنے سہنے بیماری آزاری اور علاج وغیرہ معاشی امور کی فکر ہے اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ان کے ایمان و عقیدہ، نماز روزہ، معاملات و اخلاق، عادات و اطوار یا معاشرت کے معادی امور کی نگرانی بھی واجب ہے اور جس طرح دوستوں، عزیزوں ملنے جلنے والوں کی شادی و غمی میں شرکت و ہمدردی کے معاشرتی یا سماجی حقوق و آداب کا لحاظ ضروری ہے اسی طرح تمام چھوٹی بڑی تقریبوں مجلسوں یا یوں ہی خالی عزیزانہ دوستانہ ملاقاتوں میں موقع محل کے مناسب لوگوں کو معروف و منکر کی باتیں بتلاتے اور تعلقات و اثرات کے لحاظ سے معروف پر چلاتے اور منکر سے بچاتے رہنا

بھی لازم ہے۔

خیال کیجئے کہ جس ملک معاشرہ یا امت میں معروفات و منکرات یا معاصی و طاعات کا پورا علم رکھنے والے علماء کے پورے ایک گروہ کا یہی خاص کام ہو کہ چھوٹی بڑی تمام آبادیوں میں اس کے افراد پہنچ اور پھیل کر لوگوں کو خیر و شر کے صحیح احکام سناتے اور امر و نواہی سے خبردار کرتے، برے بھلے کاموں کا دینی و دنیوی نفع و نقصان سمجھاتے، ترغیب و ترہیب سے کام لیتے، بالفاظ دیگر معروف و منکر کے امر و نہی کا فریضہ خطاب عام سے بھی اور خطاب خاص سے بھی، اور سب سے بڑھ کر خود اپنے عمل و مثال سے انجام دیتے رہتے ہوں، اس میں ان پڑھ سے ان پڑھ اور جاہل سے جاہل بھی معروف و منکر کی باتوں سے اتنے جاہل کیسے رہ سکتے ہیں کہ ان کو روزمرہ کی اسلامی زندگی کے احکام سے واقف کرنے کے لئے رسمی یا کتابی تعلیم ناگزیر ہو۔

آج بھی چھوٹے بڑے کتنے بے شمار دینی مدارس موجود ہیں جن کو ہمارے گئے گذرے امت کے امیر و غریب عوام اپنی بری بھلی مالی خدمت و توجہ سے چلا رہے ہیں، یعنی امت کے عوام پھر بھی اس باب میں اپنا حق و فرض تھوڑا بہت ادا ہی کر رہے ہیں لیکن ان ہی مدرسوں سے سالہا سال کی محنت و مدت لگا کر خالص علوم دین حاصل کرنے والے جو علما سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں باہر آتے رہتے ہیں، ان میں سے کتنے فی صد ہوتے ہیں جو امت کے ان عوام کی دینی و اصلاحی خدمت یا معروف و منکر کے امر و نواہی و خیر کی دعوت کی خالص انبیائی وراثت کے حقوق و فرائض کے لئے اپنی

زندگیوں کو وقف رکھتے ہوں؟

خمیازہ یہ ہے کہ عوام کے جو افراد اپنی ذات کی حد تک کچھ تھوڑا بہت دین اور دینداری کا خیال و اہتمام کر بھی لیتے ہیں وہ بھی دوسرے عام مسلمانوں کے متعلق کیا خاص اپنے اہل و عیال تک کے حق میں معروف و منکر کے امر و نواہی کا کوئی دینی فرض عاید ہی اپنے اوپر نہیں جانتے، یعنی علما اگر اپنے اس فرض کو جان کر غافل ہیں تو عوام بالعموم اس سے سرے سے انجان اور جاہل ہی ہو کر رہ گئے ہیں کہ جس قرآن و حدیث میں ایمان و عمل، روزہ نماز، حلال و حرام وغیرہ کے احکام ہر فرد مسلمان کو اپنی اپنی ذات کے لئے دیئے گئے ہیں اسی میں دین و دنیا کے زیان و خسران سے بچنے بچانے کے لئے ایک دوسرے کو تواصی بالحق یا معروف و منکر کے امر و نہی کے احکام بھی تو اپنے اپنے محل و مقام کے لحاظ سے ہر فرد مسلمان کے اسلامی فرائض و واجبات ہی کی حیثیت سے ماموروں منصوص ہیں۔

(۲) سارے افراد میں ایک دوسرے کی دینی خیر طلبی کے عملی ظہور کی ضرورت

اور جس طرح **کتاب ہدایت** نے اپنے **نظام ہدایت** کو برپا کرنے کے لئے مسلمانوں کی پوری امت پر ایک طرف یہ واجب ٹھہرایا ہے کہ ان میں ہمیشہ ایک خاص و مستقل جماعت (وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ) موجود رہے جس کا خاص و مستقل کام ہی ہو کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتی اور معروف و منکر کا امر و نہی کرتی رہے، اسی طرح دوسری طرف اسی کتاب ہدایت پر ایمان لانے والوں کی نفس ایمانی ہمدردی، دوستی کے لوازم میں داخل کر دیا گیا ہے کہ بلا تخصیص مرد و عورت سارے افراد امت آپس میں ایک دوسرے کو معروف

کی تاکید اور منکر سے منع کرتے رہیں ۔۔۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹ﷺ) اور اسی کی توسیع و تعمیم متفق علیہ حدیث میں یہاں تک فرمائی گئی ہے کہ جہاں راستہ کے حقوق میں راستہ چلنے والوں کو تکلیف دینے والی چیزوں کا راستہ سے ہٹا دینا اور سلام کا جواب دینا وغیرہ ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ایک بڑا حق معروف و منکر کے امر و نہی کا بھی ہے یعنی امر و نہی کا یہ حق ایسا ہے جس کے لئے کسی خاص تعلق کیا معمولی جان پہچان تک کی قطعاً کوئی شرط نہیں، اجنبی سے اجنبی کوئی راہ چلتا بھی کسی معروف سے ناواقف یا اس کے خلاف کرتا، یا کسی منکر میں مبتلا نظر پڑ جائے تو اس کو بھی بتلانا اور روکنا چاہئیے معروف و منکر کے امر و نہی کے علاوہ اور بھی ہر طرح نفس مسلمان ہونے کی ہی حیثیت سے ہر مسلمان کی خیر خواہی (النصح لکل مسلم) کا حق و فرض ہر مسلمان پر بلا کسی دوسرے رشتہ و تعلق کے عائد ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز و زکوٰۃ کے ساتھ ہی "النصح لکل مسلم" کی بھی بیعت لیا کرتے تھے[1]۔ واضح رہے کہ ایمانی دوستی یا ولایت کا یہ فرض صرف وعظ و تقریر یا خطاب عام سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ مراد یہاں خصوصیت سے انفرادی امر و نہی ہے۔ یعنی "بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" کی نفس ایمانی ولایت و اسلامی رشتہ ہی کی بنا پر ہر فرد مسلمان پر دوسرے مسلمان کی خیر خواہی و

---

[1] مثلاً حضرت جریر بن عبد اللہ راوی کہ بایعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ اقامۃ الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والنصح لکل مسلم۔

ہمدردی کا فرض عائد ہو جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر کسی کی ہمدردی یا دوستی کیا ہوگی کہ
اس کو بھلائی برائی نیکی بدی کی ہر چھوٹی بڑی بات حسب موقع صرف بتلا ہی نہ دی جائے
بلکہ امر و نہی کی تعبیری معنویت یہ ہے کہ اپنی والی پوری کوشش نیکی کی راہ پر لگانے اور
بدی کی راہ سے ہٹانے کی کی جائے۔ صحیح مسلم کی مشہور حدیث میں اسی اپنی والی حسب
استطاعت کوشش کے تین درجے فرمائے گئے ہیں۔ سب سے پہلا یہ ہے کہ جب تم میں
سے کوئی کسی منکر یا برائی کو دیکھے تو جہاں تک بن پڑے اپنے ہاتھ یا قوت سے اس کو
مٹا یا بدل ڈالے، اگر اس کی قدرت و استطاعت نہ رکھتا ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ
زبانی ترغیب و ترہیب سے اس کی پوری کوشش کرے، بفرض اتنی بھی کسی جائز و معقول
عذر سے استطاعت و مصلحت نہ ہو تو کم سے کم آخری درجہ یہ ہے کہ دل ہی سے برائی
کو برا جانے، ساتھ ہی اس آخری درجہ کی نسبت ارشاد ہے کہ یہ ایمان کا بالکل ہی آخری
اور سب سے کمزور درجہ ہے یعنی اگر مسلمان مسلمان ہو کر دل سے بھی برائی کو پوری طرح
برا نہ جانے تو پھر اس کے ایمان ہی کی خیر نہیں، اس لئے کہ برائی کو دل سے بھی برا نہ جاننا
درحقیقت خدا کی نافرمانی کو برا نہ جاننا یا اس کو ناقابلِ اعتنا اور حقیر و خفیف جاننا ہے
جو ظاہر ہے کہ ایمان کے بجائے کفر کی شان ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

مسلم ہی کی دوسری ذرا لمبی روایت ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کوئی
نبی نہیں بھیجا مگر اس کی امت میں اس کے ایسے یار و مددگار (اصحاب و حواری) ہوتے
جو اس کے طریقہ پر چلتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے، پھر ان کے بعد ایسے ناخلف

پیدا ہو جاتے جو دوسروں سے نیکی کی بات اگر کہہ بھی دیتے تو خود نہ کرتے اور اگر کرتے تو ایسے کام کرتے جن کا ان کو اپنے نبیوں کی طرف سے حکم نہیں دیا گیا تھا، مطلب یہ کہ یہی اندیشہ مجھ کو خود اپنی امت کے معاملہ میں ہے۔" تو جو شخص ایسے نافرمانوں سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے جو (اس کی قدرت نہ رکھ کر) زبان سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہے اور جو زبان سے عاجز ہونے کی بنا پر کم از کم دل ہی سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہے لیکن جو اس سے بھی گیا گذرا ہوا، اس کے دل میں رائی بھر ایمان نہ رہا۔[1]

ان روایات سے جو دراصل معروف و منکر کے قرآنی احکام و آیات ہی کی تفصیل و تفسیر ہیں، اس کے سوا کیا ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام کا اصلی مطالبہ برائی کو دیکھ کر صرف زبانی سکوت و خاموشی ہرگز نہیں، مقدور بھر کسی نہ کسی طرح اس کو مٹانے اور بدلنے ہی کا حکم ہے اس لئے کہ برائی کو دل سے برا جاننے کے معنی یہی ہیں کہ اس سے تا بہ امکان ہر طرح دور و نفور رہے اور کسی طرح اس سے ایسا تعلق نہ رکھے جس سے اس میں کسی درجہ کی بھی شرکت و تعاون یا ہمت افزائی نکلتی ہو۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵ؐ) کے قرآنی حکم کا مدعا یہی ہے، جس معاشرہ میں لوگ برائی سے کم از کم اس حد تک بھی نفرت و بیزاری برتتے ہوں، اس میں برائی کا پھلنا پھولنا ہرگز آسان نہ ہوگا اور آپ سے آپ وہ مٹ

---

[1] فمن جاھدھم بیدہ فھو مومن ومن جاھدھم بلسانہ وھو مومن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مومن لیس وراء ذالك من الایمان حبۃ خردل۔

اور مرکر رہ جائے گی، عام طور پر خدا و آخرت قانون و حکومت سب سے زیادہ پہلا دباؤ آدمی پر سوسائٹی کا پڑتا ہے جس میں اس کو دن رات رہنا سہنا اور جس سے شادی وغمی کے تمام احوال میں براہِ راست سابقہ پڑتا ہے، اس لئے لازماً ہمارے لئے سوسائٹی کی نفرت وبیزاری کا خریدنا آسان نہیں ہوتا اور نہ ایسے سماج میں کوئی برائی سماجی یا جماعتی طور پر جڑ پکڑ سکتی ہے نہ علانیہ رائج وجاری رہ سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ کچھ افراد چوری چھپے انفرادی طور پر مبتلا و مرتکب ہو سکتے ہیں جن کا زہر پورے سماج میں پھیل کر وبا کی صورت بہرحال نہیں اختیار کر سکتا، بقول حضرت بلال بن سعدؓ کے کہ برائی جب چھپ کر کی جائے تو اس کا ضرر صرف کرنے والے تک رہتا ہے لیکن جب کھل کر ہو اور اس کو روکا نہ جائے تو اس کا ضرر پھیل جاتا ہے۔

(۳) جو جتنا قریب ہے اس کے اصلاح کی اتنی ہی زیادہ ذمہ داری!

جس دین میں محض دینی خیر خواہی یا ایمانی ولایت ہی کا یہ تقاضا ہو کہ مسلمان اپنے بے تعلق سے بے تعلق اور غیر سے غیر مسلمان بھائی کو بھی امکان بھر برائی سے روکتا اور بھلائی پر چلاتا رہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مطالبہ اس معاملہ میں تعلق والے دوستوں ملنے جلنے پاس پڑوس والوں سے حسب تعلق کیا کچھ نہ ہوگا اور ان کے متعلق معروف و منکر کے اوامر و نہی کے بارے میں مسلمان کی اسلامی و دینی ذمہ داری کتنی زیادہ ہوگی، سب سے قریب و قوی تعلق آدمی کا اپنے گھر والوں یا

سلہ احیاء العلوم ص ۲۷۳، جلد اول طبع مصر۔

بال بچوں سے ہوتا ہے ان کی نسبت خود قرآن ہی کی سورہ تحریم میں کتنا تہدیدی و ترہیبی عنوان اختیار فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو (مسلمانو) تم خود اپنے کو اپنے گھر والوں کو (دوزخ) کی اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جس پر ایسے تند خو اور مضبوط فرشتے (متعین) ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے: يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶) نبی الاسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام جو بھیجے ہی گئے تھے قیامت تک پوری انسانیت (كَآفَّةً لِّلنَّاسِ) کے لئے بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا بنا کر ان کو بھی خاص طور سے حکم تھا کہ اپنے نزدیکی کنبہ قبیلہ والوں کو ڈراؤ۔ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ (۲۶/۲۱۴) اس سے بڑھ کر خاص اہل و عیال کے معاملہ کو لیجئے جن کے رزق و نفقہ کی فکر خود شریعت نے واجب کی ہے، ان کی نسبت بھی ارشاد ہوا کہ آپ کا اصل و مقدم کام یہ ہے کہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کریں اور اس (حکم و تاکید میں اگر کچھ مشکلات پیش آئیں تو ان کے مقابلہ میں) جمے رہیں (رہا ان کے رزق کا معاملہ تو ہم آپ سے رزق (کموانا) نہیں چاہتے رزق تو آپ (اور آپ کے اہل و عیال) کو ہم خود دیں گے، آپ کو اصل فکر انجام یا عاقبت کی بھلائی کی کرنا چاہیے) اور عاقبت کا دارومدار تمام تر تقویٰ یا پرہیزگاری پر ہے ——— وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (۲۰/۱۳۲)

مفسر تھانوی علیہ الرحمۃ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے :-

"کہ ہم آپ سے اور اسی طرح دوسروں سے ایسی معاش کمانا نہیں چاہتے جو ضروری طاعات (یا نیکیوں) میں مانع ہو، روزی سب کو ہم دیں گے، غرض اصل مقصود (آج کل کی طرح پیٹ یا) کسب معاش نہیں بلکہ دین وطاعت (یعنی وہی ایمان عمل صالح کی زندگی) ہے۔ اور کسب معاش کی اسی حالت میں (اور اسی درجہ تک) اجازت یا امر ہے جبکہ اس سے ضروری طاعت میں خلل نہ ہو۔"

سورۂ لقمان میں حضرت لقمان کی زبان سے توحید، مکارم اخلاق اور حسنِ معاشرت کا جو درس قریب قریب پورے ایک رکوع میں دیا گیا ہے اس میں خصوصی خطاب خاص اپنے بیٹے ہی کی طرف کرایا گیا ہے اور اس میں خاص حکم و نصیحت اپنے بیٹے کو نماز پڑھنے کی ہے کہ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ لوگوں کو معروف و منکر کا امر و نہی بھی کرتے رہنا اور اس راہ میں جو مصائب و مشکلات آئیں ان پر حتی الامکان صبر سے کام لینا کہ یہ بڑے عزم و ہمت کا کام ہے: وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۳۱/۱۷)

یعنی خالی اپنی نماز و عبادت تقویٰ وطاعت کا حق ادا کر لینے ہی پر دین کا مطالبہ ختم نہیں ہو جاتا دوسروں کو دینداری اور نیکوکاری یا اعمال صالحہ کی راہ پر لگانا اور چلانا بھی عین دین و ایمان ہی ہے۔

حدیث میں معروف و منکر کے امر و نہی کی عام و عمومی تعلیمات کے ساتھ

خاص و خصوصی تعلقات کی بنا پر اس کی تعلیم کی سب سے "جوامع الکلم" والی تعبیر، یہ متفق علیہ روایت ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ یعنی تم سب کے سب کسی نہ کسی کے نگراں ہو اور تم سب سے اپنے اپنے زیر نگرانوں کے معاملہ میں سوال ہوگا۔ سوچا جائے تو واقعی مشکل ہی سے کوئی ایسا چھوٹا بڑا بے تعلق آدمی نکلے گا جس پر کسی نہ کسی شخص یا کسی نہ کسی شے کی کوئی نگرانی یا ذمہ داری سرے سے نہ عائد ہوتی ہو' ذمہ داری و مسئولیت کے اسی عموم و وسعت کو آگے چند مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے کہ "امام یا حاکم اپنے محکوموں کا نگراں ہے جس سے ان زیر نگرانوں کے متعلق سوال ہوگا، شوہر اپنے اہل و عیال کا نگراں ہے جس سے ان زیر نگرانوں کی نسبت سوال ہوگا، عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا، نوکر اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے اس سے اس کے معاملہ میں سوال ہوگا۔ غرض تم سب ہی کسی نہ کسی کے نگراں ہو اور سب ہی پر اپنے اپنے زیر نگرانوں کی جواب دہی عائد ہوتی ہے۔

معروف و منکر کے اس امر و نہی کے سلسلہ میں اجنبی سے اجنبی راہ چلنے تک کی جو ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی گئی ہے اس سے قطع نظر اگر ہر مسلمان اپنے ساتھ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا کے خود قرآنی حکم کے تحت صرف اپنے خاص اہل و عیال اور دوسرے زیر نگرانوں ہی کی حد تک اس ذمہ داری کو ادا کرتا رہے تو فرمائیے کہ اسلامی معاشرہ میں کونسا فرد معروف و منکر کے علم و عمل سے جاہل و غافل بے فکر و بے پرواہ رہ سکتا ہے، جو شخص کسی اعتبار سے بھی کسی کے تھوڑا بہت بھی زیر اثر ہوتا ہے' اس پر

قدرتاً زیادہ اثر اور دباؤ بھی پڑتا ہے چہ جائیکہ خود اپنے اہل و عیال، پھر اسی دباؤ اور تفہیم و ترغیب کے ساتھ حسب ضرورت ترہیب و تادیب کا بھی امر و اجازت ہے، مثلاً زبانی ترغیب و ترہیب سے کام نہ چلتا ہو تو بعض صورتوں میں بیوی کو مارنے تک کا حکم قرآن ہی میں ہے (وَاضْرِبُوْھُنَّ) اسی طرح دس سال کا بچہ اگر سمجھانے سے نماز نہ پڑھے تو اس کو بھی مارنے کا حکم حدیث میں وارد ہے۔

کتاب و سنت پر مبنی تواصی بالحق یا معروف و منکر کے اس ایک اصلاحی اصول ہی کو عوام کیا خواص بلکہ دینی اعتبار سے اخص خواص علما و مشائخ بھی اختیار فرمائیں اور اپنے زیر نگراں و زیر اثر افراد اور دینی مدارس و ادارات کے اساتذہ و طلبہ اور دیگر متعلقین پر تعلیم و تربیت کی راہ سے اس اثر کو کما حقہ استعمال کیا جائے، اور خود ان کے اندر اپنے زیر نگرانوں سے متعلق اس کی اہمیت و اقدمیت کا احساس پیدا کرایا جائے تو مستقل و مصنوعی دعوتی و اصلاحی یا تبلیغی جماعتوں، اداروں وغیرہ کے بغیر ہی یہ بالکل فطری طریق اصلاح کتنا زیادہ مؤثر و کارگر اور بالآخر ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔

ہندوستان و پاکستان اور دوسرے اسلامی و غیر اسلامی ملکوں میں آج اس گئی گذری حالت میں بھی الحمد للہ اپنی ذات کی حد تک عالم با عمل علما و مشائخ اور ان کے اثر و نگرانی میں چھوٹے بڑے سیکڑوں دینی ادارے اور تعلیم گاہیں موجود ہیں جن کے ہزاروں تعلیم یافتوں کی تعداد لاکھوں مسلمانوں میں پھیلتی رہتی ہے اگر ہمارے ان دینی تعلیم یافتوں ہی کو ایک طرف کسی معتدبہ درجہ میں کماً و کیفاً مجددِ وقت

کی تعریف والا "عالم باعمل" مولوی بنایا جائے اور دوسری طرف یہ بالکلیہ اپنے کو دینی و اصلاحی خدمت کے لئے وقف نہ بھی کردیں، بلکہ معاشی و دنیوی مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے براہ راست زیرنگران، اہل و عیال، زیراثر اعزہ و احباب، مسجد و محلہ نیز دنیوی کاروبار ہی کے سلسلہ میں دوکان و بازار، کچہری و دفتر وغیرہ میں عام ملنے جلنے والوں کو باتوں باتوں میں حسب موقع تھوڑی بہت ایمان و عمل صالح کی دعوت دینے اور ان کے تقاضوں اور حکموں سے آگاہ کرنے کو اپنا دینی و اسلامی فریضہ جانتے تو بلا انجمن بازیوں اور جماعت سازیوں ہی کے تواصی بالحق یا معروف و منکر کے امر و نہی کی خالص کتاب و سنت پر مبنی بے تکلف و بے خرچ قدرتی راہ سے لاکھوں بُرے مسلمانوں تک ایمان و عمل صالح کی پکار (یا ندائے دعوت) کس آسانی سے پہنچتی رہتی اور اوامر و نواہی سے جہالت اور ان پر عمل سے غفلت کی یہ نوبت نہ آتی کہ "یا اللہ یہ مسلمان کس بات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ ہیں جو امتِ محمدیہ میں ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں"!۔

پھر سچ پوچھئے تو کتاب و سنت کا یہی سیدھا سادا . نظامِ ہدایت ہر جگہ مسلمان معاشرہ یا امت کو خیر امۃ بنا کر پوری انسانیت کے لئے (اخرجت للناس) معروف و منکر کے امر و نہی والی (تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) (۳/۱۱) چلتی پھرتی محسوس و مشاہد دعوتی امت بنا دیتا چھوٹا منہ بڑی بات، لیکن ہے یقیناً بالکل سچی بات کہ ہمارے اخص خواص علما و مشائخ ہی کی اپنے خاص فریضہ سے

بے اعتنائی کی بدولت پورے مسلمان معاشرہ میں معروف و منکر کا احساس اتنا کند ہوگیا ہے کہ ہم اپنے اہل و عیال اعزہ و احباب ملنے جلنے والوں سب ہی کو کم و بیش ہر طرح کے فواحش و منکرات میں گرفتار دیکھتے ہیں، لیکن نہ اُن پر رحم آتا ہے نہ غصہ، نہ امر ہوتا ہے نہ نہی؛ نہ ہاتھ سے، نہ زبان سے، نہ دل سے، بلکہ سچ یہ ہے کہ کتنے معروف و منکر ہیں جن کا معروف و منکر ہونا ہی ہم بھول چکے ہیں، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کتنے منکرات کو معروف اور معروفات کو منکر جاننے لگے اور وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴) کے انتہائی **عملی خسران** — هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا (۱۸/۱۰۳) تک جا پہنچے ہیں۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر ہی گفتگو کے سلسلہ میں احیاء العلوم میں اس پیشین گوئی کی ایک حدیث میں حضورؐ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ

"اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ جب تمہاری عورتیں سرکش اور تمہارے جوان بدکار ہوجائیں گے اور تم جہاد چھوڑ دوگے! لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ کیا ایسا ہونے والا ہے، فرمایا ہاں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ہوگا، عرض کیا گیا اس سے بڑھ کر کیا ہوگا یارسول اللہ؟

آگے طویل ارشاد میں اس سے بڑھ کر جو ہونے والا تھا اور جو آج آنکھوں کے سامنے ہے وہی کان لگا کر سننے والا ہے:۔

"فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ تم نہ معروف کا حکم کروگے نہ منکر سے

منع کرو گے یہ عرض کیا کہ کیا یہ بھی ہوگا۔ یا رسول اللہ؟ فرمایا ہاں، قسم ہے اس ذات کی
جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ہوگا؟

صحابہؓ کی سمجھ میں یہی کیسے آسکتا تھا کہ کوئی زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ مسلمان معروف و منکر کے امر و نہی تک کو چھوڑ بیٹھیں گے اس لئے نہایت استعجاب سے عرض کیا کہ

"اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا یا رسول اللہ؟ فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا
جب معروف کو منکر اور منکر کو معروف جاننے لگو گے؟"

سننے والے حیران ہو کر رہ گئے اور عرض کیا کہ

یا رسول اللہ کیا یہاں تک نوبت آجائے گی؟ فرمایا ہاں قسم ہے اس ذات کی
جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور یہ کیا اس سے بھی بڑھ کر ہو کر رہے گا۔ عرض کیا
یا رسول آخر اب اس سے بڑھ کر کیا رہ گیا جو ہوگا؟

اس کا جواب کلیجہ تھام کر سنئے کہ معروف و منکر کے امر و نہی کا ابتدائی ترک بالآخر کس انجام تک پہنچا کر رہنا ہے اور رہا، فرمایا کہ

"کیا حال ہوگا تمہارا جبکہ تم (الٹ کر معروف کی جگہ) منکر کا حکم دینے اور (منکر کی
جگہ) معروف سے روکنے لگ جاؤ گے، عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ کیا اس انتہا تک
معاملہ جا کر رہے گا فرمایا ہاں قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔"

دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قسموں پر قسمیں کھا کر کس آغاز کے کس ناگزیر انجام کی خبر دے اور اس سے ڈرا رہے تھے کہ جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا تواصی بالحق سے

ابتدائی غفلت کی بدولت آخرکار نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ لوگ معروف کو منکر اور منکر کو معروف جاننے سمجھنے لگ جائیں تو انتہائی نتیجہ اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ معروف سے روکا اور منکر پر آمادہ کیا جانے لگے، کیا ہم اس انتہا کے قریب نہیں آ لگے؟ بلکہ کیا آج بھی بہت سے منکر معروف اور معروف منکر نہیں بن چکے ہیں اور کتنے منکرات ہیں جن کی بے دھڑک تمدن وتہذیب کلچر اور آرٹ کے نام سے تعلیم ودعوت نہیں دی جا رہی ہے؟ اور کتنے معروفات ہیں جن کی وحشت وبربریت، دقیانوسیت ملائیت (ملاازم) کے نام سے ہنسی نہیں اڑائی جا رہی ہے!

منکرات کا روکنا جب اسلام کی نگاہ میں اتنا ضروری ہے کہ شریعت نے بہت سی منکرات کے لئے سخت سے سخت حدود تعزیرات مقرر کر رکھی ہیں تو سوسائٹی کی پسند وناپسند رد وقبول جس کا دباؤ آدمی قانون وحکومت کی تعزیرات کیا خدا و آخرت کے خوف اور جزا وسزا سے بھی زیادہ قبول کرتا ہے، اس کو کمزور کرنے والی ادنیٰ سی ادنیٰ غفلت کو بھی کیسے روا رکھا جا سکتا تھا۔

یہ تو معروف ومنکر کے سلسلہ میں وہ تین داخلی واندرونی ستون تھے جن پر اسلامی نظامِ ہدایت کے مطابق خود امتِ مسلمہ کی اندرونی صلاح واصلاح کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور جن کے قیام وبقا ہی پر خیر امۃ کی خیریت موقوف ومنحصر ہے یعنی (۱) اولاً تو اس امت کے اندر ایک پوری امت یا جماعت (وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ) ہمیشہ ایسی موجود رہنی چاہئے جس کا خصوصی ومنصبی کام لوگوں کو

بھلائی کی طرف بلانا، نیکی پر چلانا اور بدی سے ہٹانا ہو۔ (۲) دوسرے بلا استثنا ہر مسلمان مرد، عورت کی محض ایمانی ہمدردی و خیر خواہی (وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ) (پ ۱۰) کا بلا کسی دوسرے رشتہ و تعلق یہ تقاضا ہے کہ کسی انجانے سے انجانے مسلمان کو بھی کسی منکر میں مبتلا پائے تو اس سے روکنے بچانے اور معروف کی راہ دکھانے چلانے میں اپنی والی کوئی کمی نہ کرے۔ (۳) اور محض ایمانی رشتہ کے علاوہ دوستی عزیز داری وغیرہ کا اگر کوئی مزید تعلق ہو تو اسی نسبت سے یہ ذمہ داری بھی مزید بڑھ جاتی ہے، خصوصاً اگر یہ تعلق "راعی و رعیت" یا نگران اور زیر نگرانوں کا ہو جیسا کہ سب سے بڑھ کر خود اپنے اہل و عیال کے حق میں ہوتا ہے تو پھر اس معاملہ میں مسئول عن رعیتہ والے پورے پورے مواخذہ و مسئولیت والی جوابدہی عائد ہو جاتی ہے اور جس طرح اپنے بال بچوں کے کھانے پینے و رہنے سہنے، دوا علاج وغیرہ دنیوی و جسمانی ضروریات کی پوری فکر و تدبیر آدمی کے ذمہ ہے اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر مسلمان اپنے توابع کی دینی یا ابدی و اخروی، روحانی و اخلاقی زندگی کی صلاح و اصلاح کا ذمہ دار ہے، مثلاً نابالغ اولاد پر خود نماز فرض نہیں مگر والدین یا اولیاء پر یہ فرض ہے کہ دس سال کی عمر ہی سے نماز کی عادت ڈلوانا شروع کر دیں، ضرورت ہو تو خوب تادیب سے بھی کام لیں، اسی طرح بیوی کا نان و نفقہ ہی واجب نہیں دینی و اخلاقی نگرانی و اصلاح بھی شوہر کے شوہری یا راعیانہ واجبات میں داخل ہے اور اس کے لئے بھی شوہر کو ناگزیر صورت میں ضرب و تادیب تک کا اختیار دیا گیا ہے۔

(۴) خیر امت بن کر پوری انسانیت کی ہدایت کا فریضہ	مسلمانوں کے جس ملک و معاشرہ میں بھی امر و نہی یا اصلاح و اصلاح کے یہ تینوں اندرونی یا داخلی واجبات صرف

عقائد و عبادات ہی میں نہیں، ان سے بڑھ کر اخلاق و معاملات اور معاشرت میں اپنی اپنی جگہ جاری و برپا ہوں، عملاً اس کا دوسرے معاشروں یا قوموں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر خیر امۃ اور لازماً ان کے حق میں امۃ وسطہ، یا اسلام کی اعتدالی و متوازن زندگی کی شہادت و سبق بن جانا بالکل قدرتی بات ہوگی اور ایسی صالح و متوازن زندگی والی امت کی طرف سے انبیائی زندگی کے بالکل بے غرضانہ وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ معروف و منکر کے امر و نہی سے دوسری قوموں کا مسلسل اندھا بہرا رہنا ہرگز آسان نہ ہوگا اور ہو بھی تو مسلمان کا جو اصل نصب العین اللہ تعالیٰ کی راہ و رضا کا اجر ہے (اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء) وہ تو انشاء اللہ ہر حال میں پورا ہی ہو کر رہے گا اور یہی معروف و منکر کے باب میں اسلامی نظام و ہدایت و اصلاح کا امت محمدیہ علیہ السلام والتحیۃ سے من حیث امت جو تمام مطالبہ ہے کہ اُمَّۃً وسطۃ اور خیر امۃ بن اور رہ کر پوری انسانیت (اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) کے حق میں مشعلِ راہ بنی رہے۔

(۵) پھر خلافتِ ارضی کا منصب پا کر حکومت کو شریعت کی خدمت کا ذریعہ بنائے رکھنا	پھر اسی خیر اُمّۃ یا اسلامی ایمان و عمل صالح والی امت بننے پر اسلامی حکومت یا

زمین پر خدا کی طرف سے خدائی خلافت، و جانشینی عطا ہونے کا جو حتمی وعدہ ہے

(وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیۃ (۲۴/۵۵) اس کی بھی بالذات غرض و غایت نہ نفس ملک و مال ہے نہ حکومت و تجارت، نہ کسی ملک و قوم والوں کے حلق میں اس ہی جیسے انسانوں کی بنائی ہوئی کسی سیاسی و معاشی دعوت و داعیت (آئیڈیالوجی) کو پروپیگنڈہ کے زور یا اقتدار کی قوت سے ٹھونسنا ہے بلکہ اس اسلامی یا الٰہی حکومت و خلافت کی اصل و واحد غرض و غایت بھی ایک طرف براہِ راست خود اللہ ہی کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق اللہ اور اس کے بندوں سب کے حقوق و فرائض (اقامت الصلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ) کی اور دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ ان ہی خدائی احکام کے مطابق معروف و منکر کے امر و نہی کے واجبات کی ادائی ہے۔ یہی مسلمانوں کی طرف سے اللہ یا اس کے دین کی نصرت و خدمت ہے۔ اور اسی نصرت و خدمت کے صلہ میں قوت و عزت والے اللہ کی طرف سے ہماری (مسلمانوں کی) نصرت و مدد کا قطعی وعدہ ہے: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۰-۴۱)

اسلام جس ایمان و عمل صالح کی دعوت و پیغام ہے اور جس پر مسلمانوں ہی کے خیر امۃ ہونے کا نہیں دنیا بھر کی ساری امتوں اور قوموں، تمام بنی نوعِ انسان کے زیان و خسران سے بچاؤ کا مدار ہے خود اس کے بقا و قیام، استواری و استحکام کا دارومدار تمام تر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے خود کتابِ اسلام

کے عطا کردہ مذکورالصدر پنجگانہ[1] نظام ہی پر ہے، اب آگے دیکھئے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی جگہ صحیح و سلامت رہ گیا ہے۔

نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر امت کی پرکھ

(۱) علما و خواص کی زبوں حالی

سب سے اول "خشتِ اول" کو لیجئے، یہ پہلی اینٹ وہی "منکم امۃ" والی امت در امت یا امت محمدیہ میں انبیائی مقام و منصب (علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل) رکھنے والے علماء ہیں کہ ایمان و عملِ صالح کے پورے احکام، اصول و فروع، کلیات و جزئیات کی عالم و حامل یہی جماعت ہوتی ہے، اس جماعت کا مخرج و منبع ہمارے دینی یا عربی بڑے چھوٹے مدارس ہیں۔ یہ مدرسے کہنا چاہئے کہ اپنا سارا زور مقررہ نصاب کی کتابی تعلیم، کتابوں ہی کے امتحانات اور ان کے پاس کرنے والوں کی دستاربندی یا تقسیم اسناد پر لگا دیتے ہیں، تربیت کے ذریعہ خود اُن کے قلب میں ایمان داخل کرنے لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ

---

[1] یادش بخیر۔ آج کل "پرامن بقائے باہم" کے ایک "پنج شیل" پر فخر و ناز کا بڑا غلغلہ ہے جس کی بنیاد تمامتر اس خود غرضی پر ہے کہ ہر ملک و حکومت کے حکمراں جتھے کو دوسرے حکومتی جتھوں کی مداخلت و حملہ کے خوف کے بغیر اپنی اپنی من مانی چلانے کا موقع پوری آزادی سے ملتا رہے خصوصاً ایسے کمزوروں کو جن کے پاس ابھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم نہیں جب حق و باطل کا کوئی معیار و میزان انسان کی انفرادی یا اجتماعی رائے و خواہش سے بالاتر نہ رہ جائے تو کمزوروں کے لئے بالخصوص اپنی من مانی چلانے کا سستا ہتھیار "پنج شیل" کے نام نہاد پرامن بقائے باہم" سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹/۱۴) اور ظاہری و باطنی اعمال صالحہ میں خدا سے ڈرنے والے (اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸) والے "راسخ العلم" علما پیدا کرنے کا اہتمام کم و بیش ہر جگہ ناپید ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ناپید ایمان و عمل صالح کی دعوت الی الخیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی عزیمت و ہمت پیدا کرنے کا اہتمام ہے، یعنی اپنے علم سے یہ علما نہ اپنے ہی عمل کو نمایاں طور پر سنوارتے ہیں اور نہ دوسروں تک اس کے پہنچانے کا کوئی خاص ولولہ و حوصلہ لیکر ان مدرسوں سے باہر آتے ہیں۔

اپنی حد تک بہت سے بہت بس کچھ چلتا ہوا روزہ نماز کر لیتے ہیں، نہ نماز میں خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کا پتہ، نہ اس پر "فحشاء و منکر" سے بچانے والا کوئی نمایاں اثر مرتب، روزے رکھتے ہیں، لیکن وہ بھی ایسے ہی چلتے ہوئے کہ جو مبارک مہینہ خاص طور پر تقوی کی سالانہ تربیت کے لئے مقرر کیا گیا ہے (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) کہ سالوں بھر کی زندگی پر اس کا متقیانہ اور پرہیزگارانہ اثر چھایا رہے، خود اس مہینے میں کھانے پینے کے سوا دیگر معاصی و منکرات سے بچنے والے کتنے ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی بے روح عبادات زندگی کے معاملات یا ظاہری و باطنی اخلاق و عادات پر کوئی زندہ اثر کیا ڈال سکتی ہیں اور ایسے حامل اسفار سند لے بھاگنے والے علما اپنوں پر یوں مسلمانوں اور عام انسانوں کسی کو بھی غیر اسلامی کے مقابلہ میں اسلامی زندگی کے تفوق و برتری کا کیا سبق دے سکتے ہیں، یہ جب زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو اخلاق و معاملات، معاشرت اور عادات کسی بات میں بھی بہ مشکل ہی عوام الناس سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ

پھر جو یہ علم حاصل کرتے ہیں چونکہ اس کے عملی نصب العین یا مقصد، دعوت خیر اور امرِ معروف و نہی منکر ــــــ کو علماً و عملاً اٹھتے بیٹھتے ان کے اندر طالب علمی میں رچایا بسایا نہیں جاتا اس لئے اپنے اندر غیر شعوری طور پر یہ ایک بے مقصد زندگی کا خلا پاتے ہیں جو دنیوی یا جدید تعلیم پانے والوں کے مقابلہ میں انتہائی احساسِ کمتری کی حد تک جا پہنچا ہے، یہی بڑی وجہ ہے کہ ان میں اسکول و کالج کے طلبا کی وضع قطع، طور و طریق، چال ڈھال کی نقالی و پسندیدگی کا رجحان اس درجہ بڑھتا جاتا ہے کہ اپنے مدرسہ کو دارالعلوم کہنے تک میں کمتری محسوس کرتے اور کالج کہہ کر اپنی رسوائی دور کرنا چاہتے ہیں! یعنی جو پوری امت بلکہ پوری انسانیت کی امامت و مقتدائی کا علم حاصل کرتے ہیں ان میں اُلٹے غیروں کی تقلید و نقالی پرورش پاتی ہے اور جن کا مقام آگے چلنا تھا ان کو ناموں اور لفظوں تک کے سہارے اپنی عزت ہی پیچھے چلنے میں نظر آنے لگتی ہے۔

بات یہ ہے کہ اسکولی و کالجی طلبا کے سامنے صاف صاف کھلے ہوئے دنیوی مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن کے حصول کی وہ اپنی تعلیم سے بجا طور پر توقع رکھتے ہیں۔ لازماً ان میں ایک بامقصد تعلیم کا جوش و خروش اور احساسِ برتری ہوتا ہے، بخلاف ہمارے دینی مدارس کے طلبا کے کہ وہ اپنی تعلیم سے دنیا کے میدانوں میں تو اپنی کوئی خاص جگہ دیکھتے نہیں، اور دینی مقاصد کا کوئی قوی شعور یا لگن ان کے دلوں میں پیدا نہیں کرائی جاتی۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے دین و دنیا

دونوں کے ہاتھ خالی پاکر دوسروں کے آگے پھیلانے لگتے ہیں۔

اس طرح خالی ہاتھ مدرسوں سے نکل کر جب زندگی میں شریک ہونا پڑتا ہے، تو دراصل ان کو اپنا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا بعض مدارس کے بعض طلبا اسی مصرف کی تلاش میں عالمِ دین بننے کے بعد انگریزی پڑھنے اور اس کے امتحانات پاس کرنے لگتے ہیں، بعض مولوی عالم و مولوی فاضل وغیرہ سرکاری سندوں کی فکر میں پڑ جاتے ہیں، بعض گھبرا کر طبی مدرسوں کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ کو اگر اخباری و انشائی مناسبت ہوئی تو اخباروں رسالوں میں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، یا ذرا اونچی علمی و تحریری لیاقت ہوئی تو کچھ تالیف و ترجمہ کی مزدوری و پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، کچھ پھر ان ہی چھوٹے بڑے مدرسوں میں پلٹ کر مدرسی کی نوکریاں کر لیتے ہیں، اسی طرح کسی مرکزی نصب العین سے محروم جس کے جدھر سینگ سماتے ہیں گھس جاتا ہے اور کم ہی بلکہ شاذ و نادر ہی ایسے ہوتے ہیں جو ان مشاغل کے ضمن میں بھی اپنے علم دین کے مطابق خود اپنی یا براہِ راست اپنے زیر نگراں اہل و عیال ہی کی زندگی بنانے سنوارنے کا کوئی خاص اہتمام کرتے ہوں، بدیگراں چہ رسد۔ اور ایسی مثالیں تو عنقا ہی ہوتی ہیں کہ کوئی عالمِ دین اپنے علمِ دین کا مصرف و مقصد تمامتر اپنی اہلیت و صلاحیت کے مطابق "مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ" والی انبیائی شان و استغنا کے ساتھ اس علم کے عطا کئے ہوئے اوامر و نواہی یا معروف و منکر کے احکام کو دوسروں تک پہنچانے اور امت کی دینی اصلاح یا اس میں اسلامی

روح پھونکنے کی جدوجہد میں ہمہ تن لگ جاتا ہو۔ جب فرض کا احساس و اہتمام
استادوں ہی میں اتنا کمیاب ہے کہ کتاب کا سبق پڑھا دینے کے سوا شاذونادر ہی کوئی
استاد اپنے شاگردوں کے ایمان و عمل کی خامیوں اور کوتاہیوں کا غم کھاتا یا ان پر
کچھ روک ٹوک کرتا ہوگا، پھر شاگرد غریب تو شاگرد ہی ہیں ان میں اگر گھر باہر اپنے
پرایوں کی ان خامیوں کوتاہیوں کا احساس سرے سے نایاب ہو تو کیا تعجب اور
جب احساس ہی ندارد تو اہتمام کا سوال ہی کیا!

(۲) عوام کے دینی شعور کی تباہی | جب مسلمانوں غیر مسلمانوں، پوری انسانیت کو زیان و خسران سے بچانے والے پنجگانہ نظام صلاح و اصلاح کی پہلی اینٹ
ہی اتنی ٹیڑھی رکھ گئی تو "تا ثریا می رود دیوار کج" کا نتیجہ رکھا ہی تھا۔ لاکھوں،
کروڑوں کی تعداد میں سارے مسلمان یا پوری امتِ اسلامیہ تو پورے دین کی
عالم بن یا بنائی جا نہیں سکتی۔ "مِنكُمْ أُمَّةٌ" والے خاص علمائے دین ہی کی امت
در امت کو ان دونوں فرائض میں تن من دھن سے لگنے کا حکم دیا گیا تھا، ایک دعوتِ
خیر (يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ) جو نام ہے ایمان و عمل صالح کے احکام کی دعوت یا تعلیم
و تبلیغ یعنی ایسے ضروری ضروری اوامر و نواہی سے لوگوں کو واقف و آگاہ کرنا،
جن سے روزمرہ کی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، دوسرے ان اوامر و نواہی پر عمل اور
ان میں کوتاہیوں کی نگرانی اسی کا نام معروف و منکر کا امر و نہی ہے۔

ان ہی دونوں فرائض سے غفلت نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ امت

کی بہت بڑی اکثریت کے ایمان تک کی خبر نہ رہی طرح طرح کے مشرکانہ عقائد واوہام نے دلوں ہی میں گھر کر لیا ظاہر میں بھی کروروں دیوتاؤں کے پجاری، مشرکوں کیلئے اس کی صورت کیا رہ گئی ہے کہ وہ تعزیہ پرستوں قبر پرستوں کو اپنے سے ممتاز خدائے واحد کا پرستار دیکھنے اور جاننے لگیں، غریب عوام وجہلا کا شکوہ ہی کیا، جب خود حضرات علما ہیں مستقل مسلک اور خانوادے ان مشرکانہ عقائد و اعمال کے مستقل داعی و علمبردار تک بن گئے ہیں! اسلامی توحید یا توحید الٰہ کا حقیقی علم و عمل الگ رہا لاکھوں مسلمان کلمہ توحید کے لفظی معنی کیا اس کے صحیح تلفظ تک سے عاری ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ شاید لاکھوں ہی ہوں گے جن کو غلط و صحیح کسی صورت میں بھی اس کلمہ کو سر سے عمر بھر زبان پر لانے کی نوبت نہ آتی ہو گی۔ توحید جو تمام طاعات وحسنات کا سرچشمہ راس الطاعات ملاک الحسنات تھی جب وہی اس طرح گم ہو گئی تو پھر اس پر مبنی اعمال صالحہ کا کیا رونا خصوصاً دوچار فی صد کے ٹوٹے پھوٹے روزہ نماز کے سوا، حقوق عباد یا معاملات واخلاق اور معاشرت میں شاید ہی کوئی قوم وامت اس نام کی خیر امت سے زیادہ شریعت میں پیچھے رہ گئی ہو، علما وخواص تک کی اکثریت نماز روزہ کے علاوہ باقی اعمال صالحہ کو کم وبیش دین کے دائرہ سے عملاً خارج کر چکی ہے۔

بس لے دے کر غیروں کی نظروں میں بھی ہمارے عام مسلمان بھائیوں کو دیکھکر اسلام کے معنی یہی رہ گئے ہیں کہ ان کے ہاں دسہرہ ہے تو ہمارے ہاں محرم، اُن کے

ہاں دیوالی ہے تو ہمارے ہاں شبرات، اُن کے ہاں جنم اسٹمی ہے تو ہمارے ہاں میلاد شریف" ان کے ہاں آئے دن نہان اور نہانی میلے ٹھیلے ہیں تو ہمارے ہاں قبری عرسوں اور عرسی میلوں ٹھیلوں کا کاروبار، آج یہاں تو کل وہاں سال بھر چلا جاتا ہے اور اب ان پرانے رنگ کے عرسوں میلوں اور مولودوں کے ساتھ "اغیار ہی کی ریس ہیں جو نئے ماڈرن رنگ کے میلاد ڈے یا جشن میلاد منائے جانے لگے ہیں، ان کا اثر بھی ان اغیار ـــ ہندوؤں سکھوں عیسائیوں وغیرہ ـ سب پر آخر اس کے سوا کیا پڑتا ہوگا کہ جیسے ہمارے کچھ دینی دنیوی بڑے لوگ ہیں جن کی پیدائش کی خوشی ہم مناتے اور ان کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں ویسے ہی مسلمان بھی جس کو اپنا بڑا مانتے ہیں، اس کی پیدائش کا دن دھوم دھام سے عالی شان پنڈالوں اور بجلی کے بے شمار قمقموں میں مناتے اور ان کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں۔ ان میں آخر انوکھی بات کونسی ہے جس کی بنا پر ہم اسلام کو حق و صداقت کی کوئی خاص آواز جانیں، نمک کی کان میں نمک کے سوا رکھا ہی کیا ہوگا۔" (تجدید معاشیات صفحہ ۴۹۸)

پھر ان ہی جشنوں میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ "تقریروں اور مشاعروں کی گرما گرمی میں تو پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے لیکن اسی پنڈال کے کسی گوشہ سے جب اذان کی آواز آتی ہے تو اس پر کان دھرنے والے اور نماز کا رخ کرنے والے سَو میں دس پانچ ہی ہوتے ہوں گے، ان تماشوں کو دیکھنے اور ان میں شریک ہونے والے اغیار یہی تو اثر لے سکتے ہیں کہ اصل دین مسلمانوں کا بھی روزہ نماز سے زیادہ جنم اسٹمی کی سی بہ دھوم

دھام ہی ہے۔" نئی پرانی اس طرح کی بدعات و خرافات میں مبتلا ہونے والے عام مسلمانوں کی ذہنیت ہو بھی بالکل یہی گئی ہے کہ

جب ان چیزوں کو بھی وہ نماز روزہ ہی کی طرح بلکہ عملاً اس سے بڑھ کر دین سمجھتے ہیں تو بے نماز روزہ کے بھی آخر وہ اپنے کو مسلمان بلکہ دیندار کیوں نہ جانیں زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی دین کا ایک کام کرتا ہے کوئی دوسرا، سب کون کرتا ہے کون نہیں دیکھتا کہ بہتیرے مسلمان نہ سال بھر نماز پڑھتے ہیں نہ کبھی مسجد کو جھانک کر دیکھتے ہیں نہ دن کے روزہ سے واسطہ نہ رات کی تراویح سے مطلب، لیکن جس دن مسجد میں ختم ہونا ہے چراغاں کرنے مٹھائی بانٹنے کاغذی بیلیں سجانے اور ان تماشوں میں چندہ اور وقت سب کچھ دینے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

یہ نتیجہ پرانی رسوم و بدعات ہی کو دین جاننے کا نہیں، آج بھی پرانی "مولود شریف" کے بجائے نیا "جشن میلاد" منانے والوں کی نفسیات بالکل یہی تو ہوتی ہے، دل کھول کر ان میں چندہ دینے، جوش و خروش کے ساتھ ان کا انتظام کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں رات رات بھر تقریریں سننے والے اور نعتیہ مشاعروں میں ڈٹے رہنے والے کتنے ہوتے ہیں جو سال بھر تک گھروں مسجدوں کیا سال کے اس ایک دن — یوم میلاد — میں اور جشن میلاد کے عین پنڈال کے اندر جس کی پیدائش کے نام سے یہ ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اسی کی یاد و اتباع میں خدا کے حضور اپنی پیشانی ایک ہی موقع پر ٹیک دیتے ہوں"۔ (تجدید معاشیات ۲۹۹)

عوام و جہلا کا قصور ہی کیا، جب نئے پرانے بڑے بڑے علما خود ہی ان جشنوں کو زینت بخش کر ان کے دین اور دینداری ہونے کی سند بخشتے رہتے ہیں اور شاید ہی ان میں کسی کو ان مفاسد کے مفاسد ہونے کا خطرہ بھی گذرتا ہو تو ان پر کسی روک ٹوک کا سوال ہی کیا۔ غرض علماً و جہلاً، عوام و خواص عملاً جب پورے کا پورا معاشرہ ہی ایمان و عمل کے موٹے موٹے معروفات و منکرات تک کو کم و بیش اس طرح بھول بھلا چکا ہو تو اس کی صورت ہی کیا رہی کہ سارے مسلمان بلا تفریق عورت و مرد محض اسلامی رشتہ کی خیر خواہی و ہمدردی یا وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ والے ایمانی حقِ ولایت کی بنا پر ایک دوسرے کو چھوٹے سے چھوٹے معروف و منکر کے معاملہ میں روک ٹوک کرتے رہیں، جس برائی بھلائی کو آدمی خود ہی محسوس نہ کرتا ہو، اس میں دوسروں کو مبتلا دیکھکر کہاں سے اتنا احساس ابھر سکتا ہے کہ ان کو ہاتھ زبان یا دل سے روکنے کی فکر کرے!

(۳) اعزا و اقربا سے اغماض — پھر "بعدہ درویش" کا سوال ہی کیا جب "اول خویش" ہی کے معاملہ میں عوام و جہلا نہیں اچھے اچھے دیندار خواص بلکہ مشائخ و علماء تک کو دیکھا جاتا ہے کہ شوہر بیوی کو، باپ بیٹے کو، استاد شاگرد کو، پیر مرید کو، مالک نوکر کو، اسی طرح کم و بیش ہر راعی یا نگراں اپنے زیر نگرانوں کو طرح طرح کی ایمانی و عملی کمزوریوں غفلتوں کوتاہیوں، بدعنوانیوں یا چھوٹی بڑی دینی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا دیکھتا اور بس دیکھتا رہتا ہے، خود نماز روزہ کے پابند ہیں لیکن نماز روزہ کا نام تک

نہ لینے والے اہل وعیال کی غفلت و بے فکری کی اتنی بھی فکر و پرواہ کرنے والے کم ہی ہوتے ہیں، جتنی کہ ان کے نزلہ بخار کی معمولی بیماری کی! دوستوں عزیزوں، دن رات کے ملنے جلنے، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کو علانیہ دیکھتے ہیں کہ نماز روزہ کے تارک ہیں زکوٰۃ نہیں ادا کرتے، ترکہ کی شرعی تقسیم نہیں کرتے، حلال و حرام نہیں دیکھتے، رشوت لیتے ہیں، دھوکا دیتے ہیں، بدگوئی و چغلخوری کرتے ہیں، بدنگاہی و بدکاری میں پڑے ہیں جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹے مقدمے لڑتے ہیں، جھوٹی گواہیاں دیتے دلاتے ہیں، قرض مارتے ہیں، گھوڑ دوڑ لاٹری اور معمہ بازی کا جوا کھیلتے ہیں، شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں سراسر غیر اسلامی و مسرفانہ رسوم و خرافات نام و نمود فخر و مباہات کی حرکتوں میں گرفتار ہیں، جب تک نام نہ معلوم ہو، صورت و شکل وضع قطع تک سے مسلمان معلوم نہیں ہوتے۔

لیکن ہمارے دینداروں کی بھی یہ عجیب طرفہ تماشہ دینداری ہے کہ دین اسلام کو اس طرح سربازار رسوا کرنے والے اور کھلے خزانے خدا کے احکام کو ان ٹھکرانے والے[1]

---

[1] ان سطروں کو لکھتے ہی لکھتے اخبار میں پڑھا کہ کسی سگ سرشت آدم نے فخر اولاد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی (فداہ ابی وامی) پر اپنے ہم سرشت کتے کا نام رکھ کر اسی سرشت کے ایک انگریزی اور ہندی روزنامہ میں اس کی تلاش کا اشتہار (۲۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو) دیدیا۔ بے دست و پا مسلمان سراسیمہ ہو کر جا بجا ناراضی اور احتجاج کے جلسے کر رہے ہیں، زبان سے ناراضی و احتجاج کیا چیز، اس نام پر تو جان قربان کر دینا بھی عین ایمان ہی ہے۔

پھر بھی سوچنے کی بات ذرا ٹھنڈے دل سے یہ ہے کہ جو کور بخت سرے سے ایمان ہی سے محروم ہے وہ اس نام والے کے مقام کی عظمت و رفعت کو کیا پہچانے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

مسلمانوں سے نہ عزیزوں کی عزیزداری میں کوئی فرق آتا ہے نہ دوستوں کی دوستی میں نہ اُن کو باز رکھنے کے لئے اثر یا دباؤ سے کوئی کام لیا جاتا ہے نہ زبان سے کوئی تفہیم و تنبیہ ہوتی ہے اور نہ دل ہی سے کسی بیزاری و بے تعلقی کا اظہار۔

ایک نماز ہی کو لے دیکھئے کہ حضرات صحابہؓ اسی سے مومن کو مومن اور کافر کو کافر جانتے پہچانتے تھے، غنیمت ہے کہ کوئی مسلمان، مسلمان ہو کر علانیہ اس کی فرضیت کا منکر تو اب بھی شاید ہی ملے، لیکن عمل یہ ہے کہ اولاد نماز نہیں پڑھتی، مسجد کا منھ نہیں دیکھتی، تو نماز جماعت کے پابند والدین اس پر اتنی بھی باز پرس نہیں کرتے جتنی اسکول نہ جانے پر، بیماری آزادی میں حسب تعلق دوست دوست کے دوا علاج کی تدبیر کو اپنا دوستانہ و عزیزانہ فرض جانتا ہے لیکن آنکھوں کے سامنے گھرے سے گھرے دوستوں عزیزوں کو علانیہ تارک نماز دیکھنے والوں میں شاید ہی کوئی بندۂ خدا ہوتا ہو گا جو اس کی کوئی فکر و تدبیر کرتا یا خیر خواہی و دلسوزی سے سمجھانا بجھانا الگ رہا چھوٹے منھ ٹوک دینا بھی پسند کرتا ہو یا نماز نہ پڑھنے والے اپنے عزیزوں دوستوں ہم چشموں اور سوسائٹی میں اپنی عزت و وقعت میں کوئی کمی پاتے ہوں، خصوصاً اگر کچھ

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) سوال تو مدعیان ایمان و اسلام کو خود اپنے گریبانوں میں سر ڈال کر کرنا چاہیے کہ ہم مسلمانوں کے سے نام رکھ کر کام کتنے دن رات اسلام اور رسولِ اسلام کو علانیہ رسوا ہی کرتے رہتے ہیں اور پوری امت کی امت من حیث امت ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی سے دور و نفور ہو کر سراپا "باعث رسوائی پیغمبرؐ" کے سامان کے سوا کیا رہ گئی ہے۔

ہر کس از دستِ غیر می نالد   سعدی از دست خویشتن فریاد

صاحبِ جاہ و مال ہیں تو ہمارے نام نہاد علما و مشائخ تک کو ان کی خوشامد و چاپلوسی ہیں کلمۂ حق زبان پر لانے سے گریزاں پائیں گے بلکہ اچھے اچھے تہجد و اشراق والے علما صلحا کو بھی دیکھا کہ داماد نمازی یا دیندار کے بجائے بی اے، ایم اے یا عہدہ دار ہی تلاش کیا جاتا ہے، چاہے خیر اس کے ایمان کی بھی نہ رہی ہو اور کم ہی رہتی ہے۔

صحتِ روحانی کی فکر نہ رہی! میں کبھی کبھی روزہ نماز والے والدین سے پوچھتا ہوں جن میں بعض نامی گرامی "دارالعلوموں" کے علما و اساتذہ تک ہوتے ہیں کہ آپ کی یہی بے نمازی اولاد اگر ذرا کسی اندیشہ ناک یا مہلک مرض میں مبتلا ہو تو بھی آپ اسی بے فکری اور سرد مہری سے کام لیتے رہیں گے؟ پھر کیا دین و ایمان کی بیماری بیماری نہیں یا آخرت کی ہلاکت ہلاکت نہیں! جواب بہتوں کا برف کا سا ٹھنڈا بس یہ ہوتا ہے کہ کہتا تو ہوں! ایک آدھ مثال اس کی بھی مل جاتی ہے کہ صرف معمولی طور پر زبان ہلا دینے سے آگے بڑھ کر ترغیب و ترہیب یا اثر و دباؤ کو بھی کام میں لاتے ہیں مگر کام چلتا نہیں۔ پوچھتا ہوں کہ بھائی اگر مزمن و مہلک مرض میں گھر کے علاج سے نفع نہ ہو رہا ہو اور آب و ہوا کے بدلنے یا کسی اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ ہو جہاں بہتر آب و ہوا اور بہتر علاج و تیمارداری میسر ہو تو کیا اپنی والی اس کے انتظام و اہتمام میں کوئی کمی کریں گے؟ اسی طرح اگر خدانخواستہ کوئی اولاد کسی متعدی مرض میں مبتلا ہے جس سے دوسروں کو متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو کیا اس کو علیحدہ نہیں رکھتے یا کسی متعدی امراض کے اسپتال میں داخل نہیں کر دیتے، پھر اگر دین و اخلاق کی بیماریاں بھی بیماریاں ہیں اور جسمانی بیماریوں سے

زیادہ مہلک و متعدی نو آخران کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیوں نہیں کیا جاتا کہ جب تک ضرورت و مناسب ہو اُن کو بھی دین و اخلاق کی کسی صحت مند و صحت بخش فضا او ہمہ وقتی نگرانی میں رکھا جائے، یا اگر کسی کو خودکشی کرتے دیکھا جائے اور سمجھانے بجھانے سے باز نہ آتا ہو تو کیا زبردستی اس کو روکا نہ جائے گا، پھر بھی اندیشہ ہو کہ موقع پاکر جان دے ہی دے گا تو کیا ماں باپ دوست و عزیز اپنی والی کوئی سعی و تدبیر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ نگرانی اور دیکھ بھال کی اٹھا رکھیں گے، جب تک اس کے دل سے خود خودکشی کا خیال نکل جانے کا اطمینان نہ ہو لے۔ سوال یہی ہے کہ کیا ابدی زندگی کی ہلاکت یا **آخرت کشی** کا خسران اس چند روزہ زندگی کی خودکشی کے برابر بھی نہیں، جو خودکشی کے بغیر بھی صبح و شام کسی نہ کسی آن ختم ہی ہو کر رہے گی؟

ہماری جدید درسگاہیں ایمانی قتل گاہیں ہیں	سوال کا عام عملی جواب یہ ہے کہ ہم اُلٹے اپنی اولاد کو ایمان و عمل دونوں کی دینی خودکشی و ہلاکت کی جو انتہائی و بازدہ متعدی آب

وہوا اسکولوں کالجوں کی ہے اس تک میں بے تکان جھونکتے چلے جاتے ہیں، اسباب کچھ بھی ہوں لیکن کھلی آنکھوں اس تعلیم کے جن آثار کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہی اس کا نقشہ امت کے حکیم مجدد وقت کے ہلکے سے ہلکے الفاظ میں بھی یہ ہے کہ

"نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض، عقائد میں ضعف و تشویش، اخلاق میں تکبر و تصنع، کفار کی تقلید کا ذوق و شوق، مال وجاہ کی محبت کہ ان کی طلب میں دین کے خارج ہونے کا صدمہ نہ ہونا اور دن رات دماغ میں بس مالی ترقی اور جاہ و منصب

کی ہوس پکاتے رہنا، جس چیز میں مال و جاہ کی ترقی لیکن دین کا تنزل ہو تو مال و جاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پرواہ نہ کرنا۔" لہ

نماز روزہ میں کاہلی و اعراض کیا کھلے خزانے تارک ہوتے ہیں، بعضے قائل تک نہیں رہتے اور خدا تک کے منکر ہو جاتے ہیں۔ غیر منکروں کے بھی ایمانیات کی کوئی نہ کوئی چول ہل ضرور جاتی ہے، خدا کی ذات و صفات، قضا و قدر، وحی و نبوت کے عقائد میں ضعف و تشویش ہی کو راہ نہیں مل جاتی، بارہا ان کی حقیقت ہی اتنی منقلب ہو جاتی ہے کہ ان کو اسلامی کہنا سرے سے بے معنی ہوتا ہے، یہ سُنی سُنائی یا قیاسی باتیں نہیں چوتھائی صدی سے زیادہ اور یونیورسٹیوں کا (بمبئی و عثمانیہ) کا ذاتی تجربہ ہے حالانکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں کچھ نہ کچھ ان کی روک تھام اور رد عمل کا ظاہری انتظام بھی تھا، خود شعبۂ دینیات کے طلبا جن کا انگریزی کے سوا باقی پورا کا پورا انصاب تعلیم تفسیر و حدیث فقہ و کلام وغیرہ اسلامی علوم ہی ہوتے تھے وہ بھی سمیت و تعدیہ سے غیر متاثر نہیں رہتے تھے۔ بس جیسے کسی شدید وبائی فضا میں رہ کر کچھ سخت جان جاں بر ہو جاتے ہیں، اسی طرح کچھ بطنی سعادتمند اسکولوں کالجوں کے سراپا دین دشمن ماحول سے بھی دین و ایمان سلامت لیکر نکل آتے ہیں، ورنہ سچ پوچھئے تو یہ غارت گرِ دین و ایمان تعلیمگاہیں سیدھا جہنم کا ٹکٹ

لہ تحقیق تعلیم انگریزی کے عنوان سے حکیم الامت کا واقعی ایک بڑا حکیمانہ مضمون ہے، یہ اسی کا اقتباس ہے اور "تجدید تعلیم و تبلیغ" کے صفحہ ۴ سے صفحہ ۵۳ تک اس پر مفصل بحث ہے، ۱۲

ہوتی ہیں۔

ابتدا میں عام طور پر علما و صلحا کی طرف سے جو اس تعلیم کی شدید مخالفت ہوتی تھی بظاہر تعصب و تنگ نظری ہی کا شبہ ہوتا تھا لیکن تجربے نے بتایا کہ درحقیقت ان کی ایمانی فراست تھی اور آج دنیا بھر کے مسلمان جس سب سے بڑی دینی مصیبت کا شکار ہیں وہ یہی ہے کہ بالآخر ہر جگہ مسلمانوں کی قیادت و سیاست کم و بیش بالکلیہ اسی دین دشمن مغرب زدہ تعلیم و طبقہ کے ہاتھ میں چلی گئی کون نہیں جانتا کہ ان کا دین نام کے مسلمان ہو کر بھی تمام تر یہی دنیا اس کا جاہ و مال حکومت و سلطنت، عیش و عشرت، رقص و سرور، شراب و کباب لہو و لعب کی آزادیاں اور آزاد خیالیاں ہوتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ تعلیم ضمیر و قلب کی زندگی و جرأت اتنی مردہ کر دیتی ہے کہ عوام کے خوف و خطر سے ضمیر کے صریحاً خلاف زبان پر تو سیاسی نام و نعرہ اکثروں کے اسلام کا ہوتا ہے لیکن اندر ہی اندر مغربی سیاست و معیشت، زندگی و معاشرت آزادی اور آزاد خیالی کی فکروں تدبیروں اور سازشوں میں سرگرم رہتا ہے اور نام نہاد ملکی و سیاسی آزادی حاصل کرنے پر بھی پرانے مغربی آقاؤں ہی کا دم بھرتا رہتا اور ان ہی کی پشت پناہی میں اپنا کام نکالتا رہتا ہے۔ اسی ناپاک صورتِ حال سے دوچار ہو کر غریب پاکستان غلامی کے دور سے بھی زیادہ روز بروز ناپاک ہوتا جا رہا ہے اور یہی مصر و انڈونیشیا وغیرہ مسلمان ملکوں میں کوئی صحیح اسلامی جماعت و تحریک ان فرنگی تعلیم کے آزاد غلاموں ہی کی بدولت مشکل سے پنپنے اور زندہ

رہنے پاتی ہے، مصری اخوان کا تازہ تازہ حشر کل کی بات ہے، حکومت پر قابض اسی طبقہ کے اندرونی کارروائیوں اور سازشوں کی کشمکش میں پاکستان کا دستور کسی طرح اسلامی نہیں بن پا رہا ہے اور اس کی راجدھانی (کراچی) کے ایک بڑی ایمانی حرارت والے صاحبِ فاران کو بڑی حیرت ہے کہ

"تاریخ میں یہ واقعہ بھی ایک اعجوبہ کی صورت میں یادگار بن کر رہ جائے گا کہ ایک مملکت صرف اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی، اس مملکت کے ارباب اقتدار خدا کے فضل سے مسلمان تھے اور وہاں کی اکثریت بھی خدا اور رسول پر ایمان رکھتی تھی مگر اس جگہ مسلمانوں کو اسلامی دستور کا مطالبہ کرنا پڑا۔ آنے والی نسلیں اس واقعہ کو تاریخ میں پڑھیں گی اور غرق حیرت ہو کر رہ جائیں گی کہ یہ بات آخر ظہور میں کس طرح آئی اور وہ کس قسم کے مسلمان تھے جن پر دستور اسلامی کی اہمیت واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی (حالانکہ ..... وہ جن کے ہاتھوں میں زمام کار تھی اور اللہ تعالیٰ نے جن کو حکمرانی اور دستور سازی کا موقع دیا تھا اُن کے کرنے کا کام ہی یہ تھا" (فاران جنوری ۱۹۵۳ء)

مغربی تعلیم و تسلط کی لائی ہوئی مغرب زدگی و مغرب پرستی کا طلسم انشاءاللہ ٹوٹنے کے بعد اس سے ناواقف "آنے والی نسلیں" بلاشبہ اس "اعجوبہ" پر جتنا بھی "غرقِ حیرت" ہوں موجبِ حیرت نہ ہوگا۔ لیکن آج "جن ہاتھوں میں زمام کار" ہے ان کی ذہنیت خود ان کے مسلمان والدین کے ہاتھوں جاہ مال اور دنیا کے عشق و محبت ہیں، جس

دین بیزار اور خدا ناشناس (GOD LESS) تعلیم و تربیت کے جس سانچہ میں ڈھلی ہو اس کو
جان پہچان کر کسی بڑے ہی سادہ لوح کے لئے یہ باتیں "اعجوبہ" یا "غرقِ حیرت" ہونے کی
ہوں تو ہوں! ورنہ "غرقِ حیرت" ہونے کا سب سے بڑا "اعجوبہ" دراصل یہ ہوگا اگر
ان کے ہاتھوں سے کبھی بھی .. حقیقی معنی میں "دستورِ اسلامی" پر دستخط ہو گئے اور اس سے
بھی بدرجہا بڑا "اعجوبہ" ہوگا اگر ان ہاتھوں سے عملاً کبھی یہ دستور نافذ ہو گیا تو میں
سمجھوں گا کہ سورج مغرب سے نکل آیا۔ [1]

منکرات کا سرچشمہ جدید تعلیم ہی ہے

غرض دنیا کی تاریخ میں کفر والی بے دینی و بددینی کے منکرات کا آج
سب سے بڑا سرچشمہ یہی جدید تعلیم اور اس کی تعلیم گاہیں ہیں، مسلمانوں
کا جہاں کہیں اور جتنا بھی انفرادی و اجتماعی زور اس سراپا دشمنِ ایمان و دین کش سرچشمہ
منکرات تعلیم کو بند کرنے اور آئندہ نسلوں کو اس سے بچانے میں لگ سکے لگانا تھا، اگرچہ جدید
علوم و فنون کی کسی درجہ میں تعلیم ضروری ہو بھی ـــــ اور بعض علوم خصوصاً سائنس کی
حد تک ہے بھی ـــــ تو اس کا انتظام بالکلیہ دینی علوم و تعلیم کے اس طرح زیر نگرانی
و زیر تربیت ہو کہ ایمان و عمل صالح پر اس کے زہریلے اثرات کا قطعاً کوئی احتمال و

---

[1] مضمون پریس میں ہے کہ الحمد للہ نام کی حد تک تو پاکستان کی حکومت جمہوریہ اسلامیہ بن گئی دل سے
یا بے دلی سے کسی طرح سہی بھی سہی، کاش توفیق و ہمت اس کی بھی ہو جائے کہ یہ نام بدنام نہ ہو۔
کاش! کہ یہ ٹوٹی پھوٹی آس پانچ سال پہلے کی تھی۔ اب مارچ ۶۱ء میں "مسلم عائلی قوانین" کے نام سے
فوجی صدر پاکستان کا یہ "فرمان واجب الاذعان" (آرڈیننس) شرف صدور لایا ہے اس کے بعد انا للہ
پڑھنے یا اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"۔

اندیشہ نہ رہے اور جب تک ایسا انتظام نہ ہو اُس تعلیم کا دینی و اخروی ضرر و فساد اس کی وقتی و عارضی ضرورت پر اس طرح غالب آگیا ہے کہ جن والدین کے اندر دین و آخرت کی حقیقت و اہمیت کا ایمان و احساس کچھ بھی زندہ ہے بخدا اس تاریک دقیانوسی کی سمجھ میں قطعاً نہیں آتا کہ کیسے اس آگ میں اپنی اولاد کو دیدہ و دانستہ جھونک دیتے ہیں۔

لیکن کیا عرض کیا جائے کہ ایک تو ہمارے کچھ اگلوں کی ایمانی حس و فراست یہ تھی کہ درخت ہی سے انھوں نے پھل کو تاڑ لیا تھا اور ایک ہم ہیں کہ ایمان اور عمل صالح دونوں کے حق میں پھلوں کے زہریلے اثرات کا گھر باہر دن رات مشاہدہ و تجربہ کر رہے ہیں اور پھر بھی شجرِ خبیث کے پہچاننے سے جان بوجھ کر اندھے بن رہے ہیں بلکہ اُلٹے اس کو انفرادی و اجتماعی کوششوں سے پروان چڑھاتے رہتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا ریلا بھی اب اُنھیں تعلیم گاہوں کی طرف ہے۔ صدق ہفتہ وار (۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء) میں مشرقی پاکستان کی کسی کالجی صاحبزادی کا ایک مراسلہ نظر پڑا تھا جس میں شکایت تھی کہ ایڈن کالج میں سائنس کا انتظام نہیں جس کی وجہ سے ان کو ڈھاکہ کالج جانا پڑتا ہے جہاں لڑکوں سے الگ لڑکیوں کے لئے سائنس کا انتظام ہے جس کا وقت صبح سات بجے سے سوا دس بجے تک ہے اور صاحبزادی کو صبح ۶ بجے ہی وہ بھی سردی میں جانے کا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کی خود صاحبزادی صاحبہ کے نزدیک دو ہی صورتیں تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ مخلوط تعلیم جاری کردی جائے اور لڑکیاں بھی ڈھاکہ کالج میں ہی پڑھنے لگیں (۲) دوسرے یہ کہ لڑکیوں کیلئے علیحدہ سائنس کلاس کھولے جائیں"

پھر خود ہی سارے نسوانی احساسات و خطرات کو بالائے طاق رکھ کر روشن خیالی کی، مردانہ ہمت کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ

"یہ دوا و علاج بہت خرچیلا اور بہت دقت طلب بھی۔ تجربہ گاہیں وغیرہ بھی سب الگ بنانا پڑیں گی۔ آسان علاج پہلا ہی ہے یعنی مخلوط تعلیم عام کردی جائے جیسا کہ مغربی پاکستان میں ہے"

انا اللہ! یہ تاریک خیال تو پاکستان میں پھر طالب علم نہیں، روشن خیال طالبہ کی طرف سے مخلوط تعلیم کا یہ مطالبہ پڑھ دم بخود رہ گیا تھا اور یہ تو بالکل پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ پاکستان نے آزادی کے پانچ سالوں ہی میں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی اور خدمت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن مطالبہ اسلامی پر مبنی پاکستان کو اسلامستان ثابت کردکھانے کا تنہا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ مغربی پاکستان میں مخلوط تعلیم جاری کردی اور مشرقی پاکستان کی "مومنات غافلات" تک میں اس کا علی الاعلان مطالبہ پیدا کردیا۔

مخلوط تعلیم خود دنیوی نظر سے بھی تباہ کن ہے

حالانکہ دین تو دین خود دنیا کے حق میں بھی اس تعلیم کے گوناگوں نقائص و مفاسد کا ہر سال ہی مختلف یونیورسٹیوں کے عطائے سند کے خطبوں میں رونا رویا جاتا ہے اور ان کی اصلاح و ازالہ کے لئے چھوٹی بڑی کمیٹیوں کمیشنوں کا سلسلہ لگا ہی رہتا ہے، اور تو اور ہماری نئی تعلیم کے ائمہ و مقتدا یعنی خود

یورپ کے اہل فکر و نظر بھی بے دینی کی اس تعلیم کو دنیا ہی کے حق میں وبال جاننے لگے ہیں، فرانس کے کسی بڑے نامی گرامی نوبل پرائز پائے ہوئے ڈاکٹر کاریل نے ایک کتاب **نامعلوم انسان**[۱] کے نام سے لکھی ہے مطلب **خود فراموش انسان** معلوم ہوتا ہے کہ بیشمار علوم و فنون اور ان کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی اتنی ترقی کے باوصف انسان خود اپنی انسانیت سے جاہل ہی رہا۔ کراچی کے ایک اچھے صحیح و سلیم فکر و ایمان والے پندرہ روزہ **یقین** (۷ نومبر ۱۹۵۲ء) میں اس کے کچھ اقتباسات نظر سے گذرے تھے، لکھا ہے کہ

> "گو ہمارے پاس دنیا بھر کے علمائے سائنس فلاسفہ اور سریّہ (MISTICS) کے فراہم کردہ مشاہدات کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے تاہم خود اپنی (انسانی) ذات وحقیقت کے صرف چند پہلو ہی کچھ گرفت میں آسکے ہیں، پوری طرح انسان کو ہم نے نہیں جانا ہے بس کچھ پراگندہ یا الگ الگ اجزا کا اس کو ایک معجون مرکب سمجھ رکھا ہے اور یہ اجزا بھی خودساختہ ہی ہیں۔"

علم کا مقصد اولین خود اپنی ذات کی معرفت ہے

ورنہ درحقیقت خود اپنے متعلق انسان کا علم ابتک بہت ہی ادنیٰ و ابتدائی درجہ کا ہے"۔ معلوم یہی ہوا کہ انسان کے لئے علم و تعلیم کی راہ سے جس بات کا جاننا سب سے مقدم و ضروری ہے کہ خود اپنی انسانی حقیقت اور غرض و غایت کو جاننے پہچانے اسی سے سب سے زیادہ انجان اور جاہل و غافل ہے!

---

[۱] Man the unknown al

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم کجا بودم   دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم

نئی تعلیم کا حشر نئی دنیا والوں کی زبانی نئی دنیا (امریکہ) جس پر آج ساری دنیا کی نگاہیں سب سے زیادہ رشک و حسد کی پڑ رہی ہیں ڈاکٹر موصوف ہی کے الفاظ میں وہاں کی اس نئی تعلیم کا حشر ملاحظہ ہو کہ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کے

"بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم پر جو بے حساب دولت خرچ کی جا رہی ہے اس کے باوجود عقل و فہم کی سطح میں کوئی خاص اضافہ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

بلکہ ان جدید تعلیم یافتوں میں

"نہایت ادنیٰ قسم کے لٹریچر اور نقلی علم و فن کی طرف میلان خصوصیت سے زیادہ پایا جاتا ہے، بچوں کو بہتر سے بہتر صحت بخش حالات میں رکھ کر پرورش کیا جاتا ہے، اسکولوں میں ان پر انتہائی توجہ صرف کی جاتی ہے پھر بھی ان کے ذہنی و اخلاقی معیار میں کوئی بلندی نہیں پیدا ہوتی۔"

اس مشینی دور کے تمدن و تعلیم کا سب سے پُرفخر کارنامہ نئی مشینوں کی ایجادات اور آئے دن سائنسی انکشافات ہیں لیکن ڈاکٹر موصوف کی رائے میں اس طرح

"روز روز نئی نئی مشینوں کی ایجادات کو بڑھاتے چلے جانے سے کوئی فائدہ، حاصل نہ ہوگا۔ اسی طرح طبعیات و کیمیا و فلکیات (وغیرہ کے سائنسی) انکشافات پر زیادہ زور دینا بھی بیکار ہے۔"

اس کے بجائے اصل ضرورت اب انسان کو

"خود اپنی اور اپنے ذہنی اور اخلاقی نکمے پن کی طرف توجہ کرنے کی ہے ......
ایک طرف ایسے طرزِ زندگی کو ترقی دیتے چلے جانا جو درحقیقت عظیم الشان انسانی
نسلوں کو اخلاقی زوال و انحطاط میں دھکیلتا چلا جا رہا ہے اور ان کے اعلیٰ و
اشرف جوہروں کو تباہ کر رہا ہو کوئی دانشمندی کا کام نہیں خود اپنی طرف توجہ کرنا
اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ زیادہ تیز رفتار سٹیمر زیادہ آرام دہ موٹر زیادہ سستے ریڈیو
دور دراز سحابیوں (ستاروں) کی شکل و ساخت کی تحقیق کے لئے دوربینیں بناتے
رہیں ...... اس سے کون سی حقیقی ترقی (ہماری انسانیت میں) ہو جائیگی
اگر ہوائی جہاز نے ہم کو یورپ سے چند گھنٹوں میں چین پہنچا دیا۔ یہ کیا ضروری ہے
کہ ہر طرح کی پیداواروں کو برابر بڑھاتے چلے جائیں جن کی بدولت انسان غیر ضروری
چیزوں کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ پھنسا رہے"۔

جن علوم و فنون کو ہم ترقی ترقی جانتے اور پکارتے رہتے ہیں، ڈاکٹر موصوف کے نزدیک
اس میں شک کیا "شائبہ شک" کی گنجائش نہیں کہ یہ

"میکانکی طبیعاتی اور کیمیائی علوم ہم کو عقل و فہم، اخلاقی نظم و ضبط، جسمانی صحت و
تندرستی، علمی توازن و اعتدال اور (سیاسی و سماجی) امن و امان عطا کرنے سے
قطعاً عاجز و قاصر ہیں ...... بلکہ اُلٹے آدمی میں (ان ترقیوں کی بدولت)
خطرناک بیماریاں پیدا ہونے کی استعداد بڑھ گئی ہے ....
اعصاب اور دماغ کو (اس ترقی بازی کی زندگی میں دن رات) مسلسل جھٹکے

لگتے رہتے ہیں عضوی فساد و اختلال سے غذاؤں میں زہریلے مادے پیدا ہوتے

رہتے ہیں جن سے برابر ہم کو متاثر ہوتے رہنا پڑتا ہے۔"

اور نوا ور آج ہر جگہ نئے۔ نئے سائنسی طریقوں سے غذائی پیداوار بڑھانے کا جو زور وشور

ہے ان ہی ماہر سائنس ڈاکٹر کی زبان سے اس کی برکتوں کا حال بھی سن لیں۔

"غلہ وغیرہ خام غذاؤں میں، اب پہلے کے سے قوت بخش اجزا نہیں رہ گئے

ہیں، گیہوں، انڈہ، دودھ، پھل، مکھن وغیرہ کی ظاہری شکل وصورت گو

وہی ہو لیکن کثرت پیداوار کی وجہ سے ان کی اندرونی ترکیب بدل گئی ہے

کیمیائی کھادوں نے اناجوں کی پیداوار تو بڑھادی ہے مگر زمین کے اجزا میں جو

کمی وکمزوری آگئی ہے اس کی تلافی نہ ہونے سے بالواسطہ غلوں اور ترکاریوں

کی غذائی قوت ہی میں فرق آگیا ہے۔ . . . ."

یہ تو جدید تعلیم گاہوں میں پڑھے پڑھائے جانے والے علوم میں سائنس نام جس علم پر

عہد جدید کو سب سے زیادہ غرہ ہے اس کی برکتوں کا ایک مخفی گوشہ تھا، باقی میدانِ

جنگ میں اس کے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور جراثیمی ہلاکت آفرینیوں کا پوچھنا ہی کیا

خود اس تعلیم وتہذیب کے اہلِ فکر دوستوں کے سامنے بھی اس کا مستقبل یہی ہے

کہ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی"۔

باقی عام نتیجہ اس نام نہاد تعلیم کا اسی "خود فراموش" یا نامعلوم انسان

نام والی کتاب ہی میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس کے سارے طبقات ہی کو اس کے

اخباروں، سستی کتابوں، ریڈیو اور سنیما کی کثرتوں نے بالکل ذلیل و کمینہ بنا ڈالا ہے" اِحدیہ کہ عقل و فہم تک بڑھنے کی جگہ اس تعلیم کی راہ الٹے۔

"اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ نصابوں کے باوجود روز بروز بے عقلی و نافہمی ہی عام ہوتی چلی جارہی ہے"۔

پھر اس عقل و فہم کی دشمن تعلیم کے پیدا کئے ہوئے تمدن و تہذیب کا انجام اس کے سوا سوچا کیا جاسکتا تھا کہ بنی نوعِ انسان کو

"تمام اخلاقی بندشوں قیدوں اور مذہبی ضابطوں سے آزاد کردیا ہے"۔ اور

"ہر بری بھلی جائز و ناجائز راہ سے زرطلبی و زراندوزی کی آگ ان کے اندر بھڑکا دی ہے بس اتنی شرط ہے کہ جیل نہ جانا پڑے"۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ ہی آزادی سب سے زیادہ بڑھ گئی ہے، دونوں جگہ ہر دفتر و محکمہ میں نیچے سے لیکر اوپر تک اسی تعلیم کے فرزندوں کی اسی زرطلبی یا مالی حرص و ہوس نے طرح طرح کی بدعنوانیوں کا بازار اتنا گرم کر رکھا ہے کہ خود حکومت ہر طرح کی طاقتوں تدبیروں کے باوجود ان کی روک تھام سے بے بس ہورہی ہے۔

آگے خود صاحب یقین کی زبان ایمان و "یقین" سے ان سارے معائب و مفاسد کا علاج بھی سنتے چلیں کہ صرف مذہب کی طرف پلٹنا ہی اس کا واحد علاج ہے۔

"کیونکہ مذہب ہی انسان کی توجہ کو آخرت کی طرف موڑ کر اس کو مادی ماحول

(اور اس کی ترغیبات) سے بلند کر دیتا ہے لا مذہب آدمی تو مال و متاع کی فراوانی میں بھی اپنے کو غریب ہی محسوس کرتا ہے۔ بخلاف ایک سچے مذہبی آدمی کے کہ وہ مصیبت میں بھی مسرور رہ سکتا ہے، بڑی سے بڑی دولت و ثروت کا مالک ہونا بھی آدمی کو جب دل کا سکھ چین نہیں دے پاتا تو (ایمان والی) صالح زندگی اس کو قناعت و صحت اور مسرت سب کچھ عطا کرتی ہے"۔

علاج صد فی صد تیر بہدف سہی، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس تعلیم ہی نے انسان کی عقل و فہم کو اتنا دیوالیہ کر دیا ہے کہ جو علاج تھا اس کو مرض اور مرض کو عین علاج جاننے اور بتلانے لگی اور اتنی موٹی بات تک سمجھنے سے عاری ہے کہ انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی کم و بیش ہر شر و فساد کی بڑی جڑ ملک و مال، جاہ و اقتدار کی حرص و ہوس ہوتی ہے اور مذہب کی حقیقت انسان کی نظر کو خدا و آخرت کی طرف موڑ کر حب الدنیا راس کل خطیئۃ کی اس جڑ ہی کو سرے سے کاٹ ڈالتا ہے، رہا مذہب کا خالی نام لے کر اس کو بدنام کرنے والوں نے وہ بھی مذہب کی ہزاروں سال کی تاریخ میں جو کچھ تھوڑا بہت ادھر ادھر کہیں کہیں فساد برپا بھی کیا اس کا نام بھی ان فسادات کے مقابل میں کیا لیا جا سکتا ہے جو لا مذہبی کی صرف دو صد سالہ جدید تعلیم اور اس تعلیم کی بھی موجودہ صدی کی صرف آٹھ سال کی دو عظیم اور جہانگیر جنگوں نے دنیا بھر میں مچا رکھے ہیں اور جن سے پیدا ہونے والی تیسری جہاں سوز جنگ کے تصور سے جنگ و امن والے سب ہی لرزہ براندام ہیں کہ وہ ساری دنیا و انسانیت اور اس سارے تمدن و

ثقافت سب ہی کو بھسم کر کے رکھ دینے والی ہوگی۔

امریکہ کے مشہور روزنامہ نیویارک ٹائمس میں اس موجودہ بیسویں صدی کی برکتوں پر بے خانماں انسان کی بھیانک صدی کے عنوان سے ایک مضمون نکلا ہے اس میں اس صدی کی جو برکتیں گنائی گئی ہیں ان ہی میں یہ ہے کہ

"یہ لڑائی جھگڑوں کی صدی ہے کیونکہ یہ جان و مال دونوں کی بربادی تباہی کی ایسی وسیع پیمانوں پر عالمگیر جنگوں کا زمانہ ہے جس کی خوں ریزی کی سابق داستانوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔"

آگے اسی مضمون میں ڈاکٹر ایلفی ریس نامی کسی بڑے مستند و ماہر کے حوالہ سے اس بابرکات صدی کو خانماں برباد انسان کی صدی کہا گیا ہے کہ "دنیا کی معلوم تاریخ میں نہ کبھی اتنے انسانوں کو ان کے ملکوں سے نکالا گیا اور نہ اس طرح کبھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگنے پر لوگ مجبور کئے گئے، اس صدی کی سب سے نمایاں برکت و خصوصیت یہی تو بتائی گئی ہے کہ "خانہ بدر یا اپنے گھر سے نکالا ہوا انسان اس صدی کا ویسا ہی خاص نشان ہے جیسا کہ ایٹم کا توڑا جانا جس کی بدولت ایٹم بم بنا۔"

دیکھا آپ نے اس جدید تعلیم و تہذیب کی ترقی، اس کے خود گھر کے بھیدی جو ذرا بھی صاحب فکر و نظر ہیں خود ان کی نظر میں اور خود دنیا ہی کے لئے خیر و صلاح سے کہیں بڑھ چڑھ کر شر و فساد کا کیسا مجموعہ و منبع ظاہر و ثابت ہو رہی ہے لیکن دنیا کے

۱؎ ۱۶ اگست ۱۹۵۳ء منقولہ یقین ۲۲ ستمبر ۱۹۵۳ء

حق ہیں بفرض یہ سراپا خیر ہی خیر ہوتی تو بھی دین کے حق ہیں جب اس کے مقاصد طرح طرح کی علانیہ بداعمالیوں اور بداخلاقیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ عقائد و ایمانیات تک ان کی زد سے محفوظ نہیں تو اسلام اور مسلمان کی نظر میں اس سے بڑھ کر کون سا منکر ہوگا جس کی اصلاح و انسداد پر سب سے زیادہ زور لگانے کی ضرورت ہو؟ جب تک اس تعلیم اور اس کی آوردہ تہذیب و تمدن والوں کا حکومتوں پر غلبہ و تسلط ہے اس وقت تک اس کا کامل و کلی انسداد و استیصال دشوار یقیناً بہت ہے تاہم ناممکن بہرحال نہیں اور ممکن ہو یا ناممکن مسلمان کا کام تو تواصی بالحق کے نظام کے مطابق معروف و منکر کے امر و نہی کی اپنی والی انفرادی و اجتماعی ممکنہ جدوجہد تو کرتے ہی رہنا ہے باز پرس کامیابی و ناکامی کی نہیں امکانی سعی و تدبیر کی ہوگی اور گو فرنگی طرز کے نام نہاد آئینی احتجاجات بھی طرح طرح کے جانی و مالی ایمانی و اخلاقی فسادات کا نام اور اسلامی مزاج کے ناموافق ہی ہیں تاہم جب بہت سے دنیوی سیاسی و معاشی معاملات میں ان آئینی احتجاجات کے رائج الوقت ذرائع سے کام لے کر حکومتی اور غیر حکومتی ادارات سے اپنے واجبی ہی نہیں بارہا ناواجبی مطالبات تک منوائے جاتے ہیں تو اُن کے بجائے ان ہی جائز و قانونی تدبیروں سے پُر مفاسد تعلیم جدید کے دینی و اخلاقی منکرات و مفاسد کی اصلاح و انسداد میں ہی کیوں کام نہیں لیا جا سکتا۔ خصوصاً مسلمان حکومتوں میں عوام کو ساتھ لیکر جائز و مناسب احتجاجی تحریکات کے ذریعہ حکومتوں اور یونیورسٹیوں کے ارباب بست و کشاد کو

کیوں نہیں مجبور کیا جا سکتا کہ وہ اس تعلیم کو علماً و عملاً اسلامی تعلیمات کے موافق بنائیں اور چلائیں، یا کم از کم ایمان و عمل صالح کی زندگی پر اس کے ناموافق اثرات ہی کی روک تھام کا پورا پورا بندوبست کریں، اس کا انتظار کیوں کیا جائے کہ جب تک پوری حکومت ہی کا ڈھانچہ بدل کر نیچے سے اوپر تک اسلامی نہ ہو جائے، اس وقت تک اس سب سے بڑے منکر نام نہاد تعلیم کے ایمانی و عملی منکرات کو آزادی سے پھلنے پھولنے دیا جائے، دراں حالیکہ ایسی تعلیم کے فرزند مسلمان حکومتوں تک پر مسلط ہو کر مصر و پاکستان اور انڈونیشیا ہر جگہ ان کو اسلامی بنانے میں سب سے زیادہ سنگ راہ بلکہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر اسلام دشمنی میں ان سے آگے نکل جاتے ہیں۔ مصر میں جو اخوان کے ساتھ اور پاکستان میں مخالفِ قادیانیت تحریک کے ساتھ جو کچھ اس تعلیم جدید کے نام نہاد فرزندانِ اسلام کے ہاتھوں ہوا کیا کوئی غیر مسلم دین دشمن حکومت بھی اس سے آگے جا سکتی تھی! پھر قادیانیت کے فتنۂ ارتداد کو روکنے کے لئے تو راست اقدام (ڈائرکٹ ایکشن) کے فاروست حربہ تک سے کام لینے کا جواز سمجھ میں آ گیا لیکن جن کالجوں اور یونیورسٹیوں کی راہ سے کم و بیش پوری کی پوری مسلمان نسلیں عملاً اسلام سے پھرتی اور حریفوں کے کیمپ میں شریک ہوتی چلی جا رہی ہیں ان کو درست کرنے یا ان سے بچانے کی کسی اجتماعی و احتجاجی تحریک کا کیا ذکر، شاذ ہی کسی دیندار سے دیندار مسلمان کو انفرادی طور پر بھی خود اپنی اولاد تک کو ان دین لیوا اور آخرت کش جدید تعلیم گاہوں میں جھونک دینے میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ جھجک

بھی محسوس ہوئی ہو۔ عوام کیا اچھے سے اچھے علما و مشائخ نے اب یہاں تک ترقی کرلی ہو کہ لڑکیوں تک کو بی اے۔ ایم اے کرنا ضروری جانتے ہیں خواہ وہ کالج سے نکلتے نکلتے کمونسٹ ہی ہو کر کیوں نہ کسی خاندانِ "علم و عمل" کا نام روشن کریں اور یہ ضرورت ہو کیا؟ وہ بھی سُن لیں کہ صاحبزادی کو بی اے، ایم اے بنائے بغیر بی اے، ایم اے داماد نہیں ملتا!

جدید تعلیم کا دھارا سیاسی و قومی اسلام کی طرف

وہ تو خدا بھلا کرے حکومت و سیاست کے ذوق و شوق ہی کا کہ اس کی بدولت پھر بھی دین اسلام کی طرف نہ سہی دنیوی یا سیاسی و قومی اسلام کی طرف اس جدید تعلیم کا دھارا کچھ نہ کچھ مڑ گیا ہے آخرت کی فکر نہ ہو، روزہ نماز کی پرواہ نہ ہو، بلکہ ایمان تک کی خبر نہ ہو لیکن قومی مسلمان بنے رہنے پر اصرار پیدا ہو گیا ہے اس سے ان کو دینی مسلمان بنانے کا بھی بحمداللہ ایک راستہ نکل آیا ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی تو خیر براہِ راست ہی سیاسی جذبہ کو اپیل کرتی ہے، جماعت الیاسی جیسی خالص تبلیغی جماعت کو بھی جہاں تک جدید طبقات میں کامیابی کا تعلق ہے بڑی حد تک دھارے کا یہی موڑ کام دے رہا ہے لوہا گرم ہے، ایسی جماعتوں کی بڑی دینی خدمت و سعادت ہے کہ اس کو توڑ موڑ کر رُخ دین کی طرف پھیر رہی ہیں۔

قدیم مدرسی نصاب میں مناسب جدید تبدیلی کے ساتھ مثالی درسگاہ کے قیام کی ضرورت

ایک بڑی تعمیری تدبیر خود ہمارے پرانے دینی بڑے دارالعلوموں اور ان کے علما کے ہاتھ میں ہے۔

ان مدرسوں میں ابتدا سے انتہا تک دس بارہ سال تک کا نصاب ہوتا ہے جس میں مناسب

اصلاح وردوبدل سے بہت آسانی کے ساتھ انگریزی زبان اور بعض جدید علوم مثلاً سیاسیات
و معاشیات اور فلسفہ خصوصاً سائنس کو شریک کرلینا چاہیے۔ آخر جو قوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
بنا سکتی ہے اور سیکڑوں ہائی اسکول و کالج چلا سکتی ہے وہ دو ایک دینی مدرسے ایسے
نہیں بنا سکتی جن میں سائنس کے تجربہ قانون وغیرہ کے لوازم کے ساتھ کم از کم اتنا ہی
انتظام ہو جتنا بی اس سی، ام اس سی تک کے معمولی کالجوں میں ہوتا ہے، البتہ شرط یہ
ہے کہ ان جدید علوم و فنون کی حیثیت ضمنی و ثانوی رہے اور غلبہ ہر طرح علومِ دین
کا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر مقدم و ضروری شرط یہ ہے کہ تربیت کا انتظام و اہتمام
تمام تر دینی اور بالکلیہ اہلِ دین یا صالح و متقی علماء کے ہاتھوں میں ہو اور ارکان و
اساتذہ سے لیکر شاگرد پیشہ تک اس کا شدت سے التزام رہے کہ ان تعلیم گاہوں سے
کوئی تعلیمی و انتظامی تعلق رکھنے والا ایمان و عمل صالح کی ظاہری و باطنی اقل
قلیل مطلوب معیار سے گرا ہوا ہرگز ہرگز نہ ہو۔ ورنہ خالی جدید علوم و فنون کا پیوند
لگا دینے سے قوی اندیشہ انہی اثرات کے غالب آجانے کا ہے جس کا سب سے
بڑھ کر تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی خصوصاً اس کے شعبۂ دینیات میں کیا جا چکا۔ اسی کو
دُھرلنے سے بہتر تو پرانے دینی دارالعلوموں کو اپنے پُرانے حال میں پڑا رہنے دینا ہوگا۔

لیکن اگر دینی تعلیم و تربیت اور ایمان و عمل کا کچھ کی پوری نگرانی و حفاظت کے
ساتھ جدید علوم و فنون کی بھی واقفیت و مہارت کو پیدا کر دیا جا سکا، تو ایسی دینی
درسگاہوں کو کوئی حکومت سرکاری طور پر تسلیم نہ بھی کرے تب بھی انشاء اللہ ان کے

تعلیم یافتہ اپنی دینی تربیت و اخلاقی سیرت کے ساتھ ان جدید علوم میں بھی جدید کالجیوں سے اتنے ممتاز ہوں گے کہ علم و فن یا سائنس و آرٹ کے جس میدان میں بھی وہ اپنے نمایاں جوہر لے کر سامنے آئیں گے، سرکاری اور غیر سرکاری سب ہی ادارات کو جھک مار کر ان کا لوہا ماننا اور سیرت و کردار سے معرا ام و نہاد تعلیم یافتوں کے مقابلہ میں ترجیح دینا پڑے گا جن کے چھوٹوں بڑوں کم و بیش سب ہی کی مفاد پرستیوں، خود غرضیوں، رشوت ستانیوں، اقربا پروریوں اور طرح طرح کی بدعنوانیوں نے ہر حکومت کے ہر چھوٹے بڑے محکمہ کو گندہ اور سارے عوام کو آشفتہ و پراگندہ کر رکھا ہے۔ صحیح دینی تربیت و تعلیم کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ دل و دماغ اعمال و اخلاق سب کو سنوار دیتی ہے۔

ساتھ ہی عمومی امر و نہی کی اہمیت	یہ تو عہد جدید کے ایمانی و عملی منکرات کی منکر ترین جز تعلیم جدید کے متعلق کچھ معروضات تھے اب اس جز کے تناور درخت کی صورت و

قوت حاصل کر لینے کے بعد گھر باہر، عورتوں مردوں میں، دفتروں بازاروں میں، کھیل تماشوں میں، فلموں سڑکوں میں، قمار خانوں گھوڑ دوڑوں میں، کلبوں نغز بچوں میں، حد یہ کہ اخباروں رسالوں اور کتابوں تک کی راہوں سے فحشا و منکر کے جو گوناگوں برگ و بار پھیل گئے اور روز بروز پھیلتے ہی جا رہے ہیں، ان کو براہ راست فوری طور پر روکنے اور پسپا کرنے کی کوئی کارگر صورت بجز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مذکورہ صدر اسلامی و قرآنی نظام و اہتمام کے نہیں رہ گئی ہے۔ جس چھوٹے بڑے ملک و معاشرہ میں اس نظم و نظام کے تحت منکرات پر انکار کا حق ادا کیا جائے گا ناممکن ہے کہ اس میں اس

شجرِ خبیث کے برگ و بار سرسبز و شاداب رہ سکیں اور بالآخر آبیاری سے محروم رہ کر اس کی جڑیں بھی خشک نہ ہو جائیں۔

غیر تعلیم یافتہ نسلی مسلمانوں میں دعوتِ خیر کی ضرورت

رہے عام پرانے غیر تعلیم یافتہ نسلی مسلمان ان کا معاملہ تو تعلیم یافتہ قومی مسلمانوں سے بالکل الگ ہے وہ اس معنی میں تو یقیناً "نسلی" ہیں کہ باپ دادا نے جس دین کو قبول کیا تھا اسی کو وہ بھی تقلیدی و اجمالی طور پر مانتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم ان کا یہ ماننا کسی قومی سیاسی و معاشی مفاد و منفعت کی بنا پر ہے نہ حکومت کے عہدوں منصبوں ممبریوں اور وزارتوں وغیرہ میں کوئی حصہ لگانے کے لئے، نہ اور کسی طرح کے خود اپنے یا اپنے خاندان والوں کے لئے جاہی و مالی فائدوں کی خاطر۔ البتہ ان میں اجمالی ایمان کے ساتھ نسلاً بعد نسل سے تفصیلی ایمان و عمل صالح کی خرابیاں اور کوتاہیاں، بدعات و خرافات ضرور جاگزیں چلی آرہی ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس کا بھی سب سے بڑا بلکہ واحد سبب معروف و منکر کے اسلامی نظام کی ذمہ دار اولین جماعت ولتکن منکم امۃ کی اپنی ذمہ داریوں سے مسلسل غفلت و کوتاہی ہے۔ ایسی جماعت کا فریضہ ایک طرف دعوتِ خیر (یدعون الی الخیر) یعنی خیر یا معروف کے تمام ایمانی و عملی شعبوں کے تفصیلی احکام کی دعوت و تبلیغ یا ان سے ان عوام کو واقف رکھنا تھا اور دوسری طرف یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر کے تحت ان احکام پر عمل کا حکم دیتے اور ان میں کوتاہیوں سے روکتے رہنا تھا۔ ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات۔ لیکن بات بہرحال وہی ہے کہ دینی تعلیم کے مدرسوں پر مدرسے تو قائم ہوتے اور ان سے

دینی علوم و احکام کے علما ہزار ہا ہزار کی تعداد میں نکلتے رہے لیکن عوام و جہلا میں پھیل کر ان علوم و احکام کو پہنچانے اور ان پر عمل کی نگرانی کا کوئی داعیہ جب ان میں مدرسوں کے اندر پیدا ہی نہیں کیا گیا تو مدرسوں سے باہر آ کر وہ اس کو اپنا فرض کیسے جانتے اور بنانے

سارے مسلمان مرد و عورت مدرسوں میں داخل ہو کر عالم نہیں بنائے جا سکتے تھے اور جو بنے یا بنائے گئے تھے انھوں نے غیر عالموں یعنی عوام و جہلا تک اپنے علم یا احکامِ دین کو پہنچایا نہیں۔ نتیجہ اسی کا جو ہونا تھا وہی ہوا کہ نسلاً بعد نسل سے جہل و جہالت کی تہیں پر تہیں جمتی چلی گئیں اور اب یہ سنی مسلمانوں کا سوادِ اعظم ہر جگہ نام و نسل ہی کے مسلمان ہو کر رہ گیا ہے۔ مرض مزمن ہو کر رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے علاج بہت دشوار ہو گیا ہے پھر بھی لاعلاج نہیں۔ مگر علاج ہے وہی ایک ہی کہ منکم امۃ والے علمائے دین جن دینی درسگاہوں میں تیار ہوتے ہیں وہاں کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور ان کا امتحان دیتے لینے سے زیادہ بہت زیادہ یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ جو اس تعلیم و تعلم کا اصل مقصود ہے، عام ہے اس کی لگن پیدا کرنے کراتے رہنا ہے تاکہ اس کتابی و امتحانی سلسلہ سے فارغ ہو کر جس کی حیثیت محض وسیلہ کی ہے مقصد کی نہیں دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اپنے اصلی مقصد و منصبی فرض میں لگ سکیں۔

اصلاح کی فوری تدبیر

دینی مدرسوں میں یہ بنیادی اصلاح تو ہر صورت میں اہم و اقدم ہے ہی۔ پھر بھی یہ "تریاق از عراق" کا معاملہ ہے۔ فوری تدبیر یہ ہے کہ اس وقت بھی

ماشاء اللہ ہر ملک خصوصاً ہندوستان و پاکستان میں جو ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے علما اور ذی علم مشائخ موجود ہیں ان میں تھوڑے سے بہت اہل اخلاص کی سمجھ میں بھی اگر اپنے عالم دین ہونے کا یہ فرض منصبی اور مقصد و مقام آجائے تو خود اپنی اپنی جگہ یا جو جمع ہو سکیں ایک جگہ جمع ہو کر موجودہ حالات کے مناسب اپنے محدود دائرہ ہی کی حد تک بھی (جو بہتوں کا خاصا وسیع ہے) ایسا عملی نظام اختیار کر لیں جس میں اسی دائرہ کے محلہ محلہ قریہ قریہ اور گھر گھر تک ایمان و عمل کے تفصیلی احکام پہنچانے (دعوت الی الخیر) اور ان پر عمل کی نگرانی (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کا اہتمام و انتظام ہو تو انشاء اللہ کام چل پڑے گا اور دوسروں کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

راقم نالائق و ناکارہ کو تو یقین واثق ہے کہ کسی معتدبہ آبادی میں ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی کو صد فی صد نہیں کسی معتدبہ درجہ ہی تک ـــــ مگر خالی نماز روزہ ہی میں نہیں ـــــ ظاہر و باطن اخلاق و معاملات اور معاشرت سب میں اتنے نمایاں طور پر برپا و مشاہدہ کرا دیا جائے کہ لوگوں کو وہاں کے مسلمانوں کے ہر طبقہ میں ـــــ امیروں میں غریبوں میں، دوکانداروں میں دستکاروں میں، کاشتکاروں میں زمینداروں میں، مزدوروں میں کارخانہ داروں میں، نوکروں میں آقاؤں میں، شوہروں میں بیویوں میں، اولاد میں والدین میں، شاگردوں میں استادوں میں، گھر باہر ہر جگہ ـــــ اسلامی زندگی چلتی پھرتی جیتی جاگتی نظر آئے تو پھر خدا نے چاہا یہی آبادی خواہ وہ قصبہ ہی کی ہو مدینۃ النبی (فداہ ابی و امی) کا نمونہ و پرتو بن کر اپنے اثرات کو آہستہ آہستہ

سہی مگر مضبوط قدموں کے ساتھ بڑھا سکتی ہے بلکہ انشاء اللہ یہی ملی دلاغ بیل صحیح اسلامی حکومت کے قیام وکشش کی بنیاد بن جا سکتی ہے۔

اسلام کی تعلیم پر عمل میں بالخاصہ مقناطیس کی کشش وجاذبیت ہے۔ شرط بس عمل ہی ہے۔ مقناطیس کی جاذبیت بھی جب تک مقناطیس روبرو نہ ہو، خالی جاذبیت پر تقریر وتحریر کی سرگرمیاں یا رسائل وتصانیف کے انباروں سے جاذبیت ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسلامی ایمان وعمل صالح کی ایسی جامع زندگی والی آبادی ومعاشرہ کسی غیر اسلامی ملک میں محکوم رہ کر بھی، مثلاً آج ہندوستان ہی میں آنکھوں کے سامنے آجائے تو اس کے افراد کو حاکموں سے اپنے حصہ کی انشاء اللہ نوکریوں کی بھیک ہرگز نہ مانگنا پڑیگی نہ الصادق الامین (علیہ التحیۃ والتسلیم) کے اسوہ کی قدیم عملی شہادت صاحب صدق جدید کو ہر دوسرے تیسرے مہینے اکائیوں ودہائیوں بلکہ کبھی کبھی سیکڑوں کے مقابلے میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مقام صفر پر صفر چھاپنا پڑے گا۔ ایسے معاشرہ یا سوسائٹی کے افراد کو حکومت وحاکم نوکریاں دینے کے لئے خود ہی ڈھونڈھیں گے اور اگر کسی چھوٹے بڑے خطہ میں ایسے معاشرہ کی حکومت ـــــ کہ یہی واقعی اسلامی حکومت ہوگی ـــــ قائم ہو جائے تو اس کو دیکھنے والے دوسرے ملکوں کے عوام یا شہری خود ہی نام کی جمہوریت واشتراکیت سب کا نام لینا چھوڑ دیں گے اور اسلام کے دامن ہی میں نجات کو یقین کرنے پر مضطر ہوں گے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں، مسلمان جب مسلمان تھے تو ان کی تاریخ حکمرانی کے یہ واقعات وتجربات ہیں کہ غیر بھی

اپنوں کے مقابلہ میں ان کی حکومت ہی کو ترجیح دیتے تھے اور محکومانہ اقلیت میں ہو کر بھی وہ حاکمانہ اکثریت والوں کی آنکھ کا تارہ بن کر رہتے تھے۔ جس کی بعض شہادتیں خود اسی ہندوستان میں مولانا گیلانی سلمہ کی کتاب ہزار سال پہلے سے اور کہیں درج ہو چکی ہیں۔

بات میں بات نکلتی چلی آرہی ہے۔ کہنا ہر پھر کر ایک ہی بات ہے کہ دین ہی نہیں مسلمانوں کی دنیا کے بھی تمام انفرادی و اجتماعی سیاسی و معاشی مسائل و مشکلات کا حل و علاج ہے ایک ہی — ایمان و عمل صالح کی اسلامی تعلیمات و مطالبات کے مطابق مسلمان بننا بنانا اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ میں بننا بنانا۔ تدبیر بھی اس کی وہی ایک اور صرف ایک ہی ہے تواصی بالحق یا معروف و منکر کے امر و نہی کے نظم و نظام کا از سر نو احیاء و اجراء جو کم و بیش ہر معاشرہ اور ہر طبقہ کے مسلمانوں میں ہر جگہ ہی بالکلیہ نسیاً منسیاً اور معدوم و معطل ہو چکا ہے۔

کچھ مزید تذکیر

اس از سر نو احیاء و اجراء کی اہمیت کے مدنظر کچھ مزید تذکیر اعلان طور پر عملی نقطۂ نظر سے عرض کیا جاتا ہے۔

انبیائی کام کی ذمہ داری اب علماء امت پر ہے — جس طرح دعوت خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی ابتدا حضرات انبیاء اور آخر میں حضرت خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰة والسلام کی بعثت و ظہور سے ہوئی۔ اسی طرح اس کا بقاء و قیام احیاء و تجدید ہر لحاظ سے "وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ"

کے امر کے مطابق ابتدائی و اولین ذمہ داری تمام تر بنی اسرائیل کے انبیاء ہی کا سا درجہ و مقام رکھنے والے امت محمدیہ (علیہ السلام والتحیہ) کے حضرات علماء کی ہے اور کتاب و سنت ہی کے مطابق عقلاً و نقلاً ہر اعتبار سے اس کا عملی پروگرام یہ ہے کہ

جو علماء گذر اوقات کے بقدر فارغ البال ہیں یا ہو سکتے ہیں یا توکل کی ہمت و زندگی رکھتے ہیں ان کا تو دن رات کا کام بالکلیہ ایک طرف دعوتِ خیر یعنی ترغیب و ترہیب کے ساتھ گھر باہر اپنوں پرایوں کو جہاں تک جتنی زیادہ سے زیادہ پہنچ ہو سکے پہنچانا ہے اور دوسری طرف ان احکام پر عمل کی نگرانی جس کا نام معروف و منکر کا امر و نہی ہے۔[1]

دعوتِ خیر کا خصوصی دائرہ

دعوتِ خیر کے یہ احکام خصوصیت کے ساتھ وہ ہوں گے جن کا روزمرہ کی زندگی میں کم و بیش ہر مسلمان سے اسلام کا مطالبہ ہے اور ان میں عقائد و عبادات، معاملات و اخلاق اور معاشرت کے احکام پر زیادہ زور ہو کہ ان سے عام طور پر زیادہ جہل و غفلت ہے۔ اور ان کے بغیر عقائد و عبادات بھی کمزور و بے جان ہی رہتے ہیں۔ نیز مسلمانوں غیر مسلمانوں سب کے دل میں دین اسلام کی برتری و فضیلت، اس کی طرف کشش و رغبت کے لیے خالی دعوتی و اصلاحی تقریر و تحریر بجائے خود کافی ہرگز نہیں، البتہ معاملات اور معاشرت کی اسلامی تعلیمات پر عمل کے ایسے ٹھوس تجربات

---

[1] ایک غلطی خدا جانے بعض اکابر حضرات اور سلف تک کو یہ کیسے لگی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف حکومت یا حاکمانہ اقتدار رکھنے والوں کا کام ہے حالانکہ اس تخصیص کی دلیل ہی سے کتاب و سنت دونوں خالی نہیں بلکہ تعمیم کے دلائل سے پُر ہیں البتہ ہر حکم کی طرح کچھ قیود و شرائط اس کے بھی ہیں۔

جو لوگوں کو دنیا والوں کی عام انفرادی و اجتماعی قومی و وطنی خود غرضیوں اور مفاد پرستیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی علانیہ خدا پرستی و آخرت پسندی پر گواہی دینے والے ہوں وہ زبانی و کاغذی دعووں اور دعوت کے بغیر بھی دشمنوں سے اسلام اور مسلمانوں کا اخلاقی لوہا منوا سکتے ہیں۔

معروف و منکر کے امر و نہی کا چرچا بھی ہو اور معروف کی قدر اور منکر کی تحقیر بھی پیدا کی جائے

دینی تعلیمات کی بے عملی زندگی کسی معاشرہ یا امت و جماعت میں جماعتی حیثیت سے تب ہی رونما ہو سکتی ہے جبکہ ایک طرف اس میں معروف و منکر کے امر و نہی کا چرچا ہو اور دوسری طرف معروف کی پسندیدگی اس کی عزت و عظمت و برتری اور منکر سے بیزاری و ناراضی اس کی کمتری و حقارت کو برابر محسوس کیا جاتا ہو۔ صحاح کی مشہور حدیث بلکہ خود قرآن ہی کی تفسیری روایت ہے کہ

"بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فساد یہی پیدا ہوا کہ ایک دوسرے سے ملتا اور دیکھتا کہ وہ کسی برائی یا منکر میں مبتلا ہے تو کہتا کہ خدا سے ڈرو اور یہ حرکت چھوڑ دو، یہ جائز نہیں۔ پھر دوسرے دن ملتا اور بدستور اس برائی میں مبتلا پاتا، تو بھی اس کے ساتھ کھانے پینے سے باز رہتا، نہ اٹھنے بیٹھنے سے، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب ہی کے دل ایک طرح کے کر ڈالے۔"

یعنی جو پہلے دوسروں کو منع کرتے تھے خود ہی اس برائی میں مبتلا ہونے لگے بالکل نفسیاتی بات ہے کہ جیسے لوگوں سے ہم خلا ملا میل ملاپ رکھیں گے خود بھی آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر ان ہی کے رنگ میں رنگتے جائیں گے۔ بہرحال ارشادِ بالا کے ساتھ ہی حضورؐ نے قرآن مجید کی

یہ آیات تلاوت فرمائیں کہ

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ ..... فَاسِقُوْنَ ۝ (۵ : ۷۸ تا ۸۱) -

"بنی اسرائیل میں کفر کرنے والے داؤد و عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے اس بنا پر لعنت زدہ ٹھہرائے گئے کہ وہ گناہ کرتے (شریعت کے حدود سے) تجاوز کرتے (پھر بھی) ایک دوسرے کو برے کاموں سے منع نہ کرتے۔ یقیناً ان کا یہ (خاموشی و رواداری) کا طرز عمل بہت ہی برا تھا (بلکہ) بہتوں کو تم ان میں سے دیکھو گے کہ کفر (یا نافرمانی) کی باتیں کرنے والوں سے دوستی کا معاملہ رکھتے ہیں۔ سو یہ اور بھی بہت ہی برا ہے جو انھوں نے اپنی عاقبت و انجام کے حق میں کر رکھا ہے۔"

بنی اسرائیل کے اس طرز عمل کی بدولت ملعون و مردود ٹھہرائے جانے پر خود قرآن مجید سے استشہاد فرما کر اصل مدعا حضورؐ کا ظاہر ہے کہ خود اپنی امت کو اس انجام سے ڈرانا اور متنبہ فرمانا تھا۔ چنانچہ آگے ہی ارشاد ہوا اور کس قوت و شدت کے ساتھ کہ

"خوب آگاہ رہو! خدا کی قسم تم معروف کا حکم اور منکر سے منع ضرور کرتے رہنا اور ظالم کا ہاتھ (جہانتک ہو سکے) ظلم سے روک لینا اور اس کو حق کی طرف پھیر دینا اور اس کو حق ہی پر اچھی طرح جمائے رکھنا ورنہ یاد رکھو کہ (بنی اسرائیل ہی کی طرح) تم سب کے دل

بھی ضرور اللہ تعالیٰ (نافرمانی پر دلیری میں) ایک ہی طرح کے کر ڈالے گا اور ضرور تم کو بھی
اسی طرح لعنت زدہ کر دے گا جس طرح ان کو کر دیا۔"

ترمذی شریف کی اسی روایت میں خصوصیت کے ساتھ علمائے بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ
"وہ بنی اسرائیل کو گناہوں سے روکتے پھر اگر وہ نہ رکتے تو یہ اُن کے ساتھ میل جول سے احتیاط
نہ کرتے بلکہ ان کے ساتھ بیٹھتے اُٹھتے، کھاتے پیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے سب ہی کے دل
ایک طرح کے کر ڈالے (یعنی سب ہی گناہوں پر دلیر ہو گئے) اور آخر اسی عصیان اور
سرکشی کی وجہ سے ان کے انبیاء داؤد و عیسیٰ (علیہما السلام) ہی کی زبان سے ان کو لعنت زدہ
فرما چھوڑا۔ آگے اسی روایت میں ترمذی ہی میں یہ بھی ہے کہ آپ تکیہ لگائے تشریف فرما
تھے اس سے اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
(کہ تمہارے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہو کر رہے گا) حتیٰ کہ تم ظالموں اور نافرمانوں
کو حق کی طرف پھیرتے اور اس پر جماتے رہو۔ ظاہر ہے کہ علماء پر اور بھی خصوصیت سے
نہ صرف معروف و منکر کے امر و نہی کا فرض عائد ہوتا بلکہ علانیہ منکرات و معاصی والوں
کے ساتھ نشست و برخاست میل جول کے تعلقات سے بھی احتیاط زیادہ ضروری ہے
کہ اس مداہنت و مسامحت سے نہ صرف ان منکرات والوں کی منکرات پر جرأت بڑھتی
ہے بلکہ عوام اپنے مقتداؤں کی ان بے احتیاطیوں کو دیکھ کر فاسقوں و فاجروں کے
ساتھ خلا ملا میل ملاپ بلکہ اُن کے معاصی و منکرات میں ہر طرح شرکت و اعانت
(تعاون علی الاثم والعدوان) تک جا پہنچتے ہیں۔

انسان کی انسانی فطرت و بشریت کی یہ کوئی بڑی باریک بات نہیں کہ وہ صحبت
خصوصاً نفس پرستی اور بدراہ ہوس کی صحبت و قرب سے زیادہ اور جلد اثر پذیر ہوتا ہے۔
بارہا اچھے خاصے نیک سرشت لوگوں کے دلوں میں بھی اس راہ سے بڑی بڑی برائیاں دبے
پاؤں اس طرح راہ پا جاتی ہیں کہ غریبوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ زہر پیتے چلے جا رہے ہیں۔
دوسرے یہ بھی انسان کی جانی پہچانی معمولی نفسیات ہی ہے کہ سوسائٹی یا سماج یا
ہم جنسوں اور ہم پیشوں میں جن باتوں کو ذلت و حقارت یا بری نگاہ سے دیکھا جائے
آدمی ان کے ارتکاب میں بہت ہچکچاتا ہے۔ پولیس و عدالت خدا و آخرت سے بھی ہر کس و
ناکس اتنا نہیں ڈرتا جتنا معاشرہ یا بھائی بندوں میں بدنامی یا ذلت سے۔ تو پھر دین اسلام
جس کی تعلیمات قدم قدم پر انسانی فطرت و نفسیات کی دقیق دقیق رعایتوں پر مبنی ہیں،
وہ خیر و شر، صلاح و فساد یا معروف و منکر کے معاملہ میں ان سماجی عوامل و موثرات سے
چشم پوشی کیسے گوارا کر سکتا اور افراد کو اس کی کھلی چھوٹ دے سکتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے
من مانی کرتا رہے اور علانیہ فسق و فجور، فواحش و منکرات تک پر دوسروں کی طرف سے
نہ کوئی روک ٹوک ہو نہ دوستی و رشتہ داری کے تعلقات اور سماجی عزت و ذلت، نیک نامی
و بدنامی میں کوئی فرق آئے۔ قانون و عدالت کی گرفت میں اندھیرے اجالے ہر وقت
ہر جگہ ہر شخص آسانی سے نہیں آسکتا نہ خدا و آخرت ہی کا خیال و خوف عوام الناس میں
اس درجہ کا پیدا کرنا آسان ہے کہ وہ ہر برائی کا ہر موقع پر ہاتھ پکڑ لے۔ یہ تو جن میں ہم ہر وقت
رہتے سہتے، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہیں اور جن کی نظروں میں عزت و ذلت، نیک نامی و

بدنامی کا احساس قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے، انھیں کے اندر نیکی و بدی، معروف و منکر کے احساس کو اتنا بیدار و جاندار رکھنا چاہیئے کہ مجموعی حیثیت سے سوسائٹی علانیہ فواحش و منکرات کو برداشت ہی نہ کر سکے اور حال و قال زبان و عمل ہر طرح ہر طرف سے ان پر بیزاری و ناراضی کا ردِ عمل ان کے ارتکاب کرنے والوں کو محسوس کرنا پڑے۔ ورنہ جس معاشرہ میں معروف و منکر دونوں کو بے حسی نے کم و بیش ایک سطح پر رکھ دیا ہو کہ نہ معروف پر تحسین و احترام کے جذبات کا کوئی خاص ردِ عمل نمایاں ہوتا ہو اور نہ منکر پر ناراضی و ناپسندیدگی کا، تو یہی نہیں کہ ایسے ملک و معاشرہ میں روز بروز معروف کمزور ہوتا اور منکر زور پکڑتا جائے گا، بلکہ عملاً لوگ معروف کا معروف اور منکر کا منکر ہونا ہی بھول جائیں گے اور بالآخر معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھا جانے لگے گا۔ جب معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھا جانے لگے تو ہوتے ہوتے (اعاذنا اللہ) اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ معروف سے روکا جائے اور منکر کا حکم دیا جانے لگے! کیا اس روزِ بد کے قریب ہم نہیں آگئے ہیں؟ بلکہ کیا آج بھی بہت سے منکر معروف اور معروف منکر نہیں بن چکے ہیں؟ اور کتنے کھلے کھلے شرکیات و بدعات و فواحش و منکرات ہیں، جن کی بے دھڑک عین دینداری یا تہذیب، و ثقافت آرٹ اور کلچر کے خوشنما ناموں سے تعلیم و دعوت دی جانے لگی ہے!

قرآن نے جن اعمال و حرکات کی بدولت سب سے زیادہ گھاٹے ٹوٹے زیان و خسران میں پڑنے کی خبر دی ہے (هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا) وہ ایسے ہی لوگوں کی تو ہے جو دنیا پرستی کی ساری برائیوں میں لت پت ہو کر بھی (الَّذِينَ ضَلَّ

سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا) اپنی اوندھی عقلوں اور خوش فہمیوں سے سمجھے یہی جا رہے ہیں کہ بڑے کارنمایاں انجام دے رہے ہیں (یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا) کیا دجل ودجالیت کا یہی انتہائی دور دورہ اب دن دوپہر آنکھوں کے سامنے نہیں ہے!

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلہ میں حدیث کی جو پیشینگوئی نقل فرمائی ہے اور جس کی تفصیل اوپر کہیں گذر چکی، اس میں معروف ومنکر کے امر ونہی کے ترک کا آخری وانتہائی انجام یہی تو فرمایا گیا ہے کہ "تم معروف کو منکر اور منکر کو معروف جاننے لگو گے" جس کا ناگزیر نتیجہ جو ہونا چاہئے وہی ہو کر رہے گا کہ بالآخرہ منکر کا حکم دینے اور معروف سے منع کرنے لگو گے"۔

غرض جو حضرات علما معروف ومنکر کے امر ونہی کی اہمیت اور اس کے ترک و غفلت کے ان نتائج بد کو محسوس فرمائیں ان کا اولین فرض خود اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی حد تک یا کسی جماعت سازی کے احکام دین کو پہنچانا اور امر ونہی کی ترغیبی وترہیبی راہوں سے ان پر عمل کی نگرانی کرنا ہے۔

"تغییر منکر" والی سنت کی تلقین وتاکید

نیز دین کے دوسرے اوامر ونواہی یا احکام کے ساتھ ساتھ معروف و منکر کے امر ونہی کی اہمیت کو "تغییر منکر" والی تعلیم وسنت کے مطابق لوگوں کے ذہن نشین کرنا تاکہ وہ اس کے حدود وآداب کے مطابق اپنے اپنے محل ومقام کے اعتبار سے منکر کی تغییر یا مٹانے اور معروف کے پھیلانے کو بھی نماز روزہ وغیرہ ہی کی طرح اپنی ایک اسلامی ودینی ذمہ داری جانیں۔ لوگ غور نہیں کرتے ورنہ حدیث کی اس

تعلیم نے تو اس طرح معاصی و منکرات کے مٹانے کو ہر فرد مسلمان کا اپنی اپنی حیثیت و استطاعت کے بقدر زندگی بھر کا ایسا انفرادی فریضہ قرار دیدیا ہے جس سے کوئی فرد کسی حال اور کسی مقام میں اپنے لئے استثنا کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ کون ایسا موقع ہوگا کہ جس میں آدمی منکر کے مٹانے کے لیے ہاتھ یا قوت سے اگر کام نہ لے سکے، تو کم از کم زبان ہی ہلا دے اور اگر اتنی بھی ہمت یا مصلحت نہیں تو دل ہی سے برا جان کر کم از کم اپنے کو اس سے دور رکھ کر اپنی دلی ناراضی و ناپسندیدگی کا اظہار کر کے، اپنے ایمان کے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو تو بچا لے سکتا ہے۔

اس تعلیم کے معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنی سنت سے تینوں صورتوں پر ہاتھ، زبان اور دل تینوں سے منکر کی تغییر یا اس کو مٹانے کی کیسی صاف و واضح رہنمائی و نشان دہی فرمائی ہے۔ ہاتھ یا قوت سے مٹانے کی مثال تو حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھ کر اتنا غضبناک ہوئے کہ خود ہی اس کے ہاتھ سے نکال کر اور چھین کر پھینک دیا اور فرمایا کہ (یہ کیا حرکت ہے) تم میں سے بعض قصداً اپنے ہاتھ میں آگ کی چنگاری رکھ لیتے ہیں! سبحان اللہ حضرات صحابہؓ کی بھی کیا شان اطاعت و محبت تھی کہ جب حضورؐ ہٹ گئے تو کسی نے کہا کہ اب اپنی انگوٹھی اٹھا کر رکھ لو پہننے کے بجائے کچھ اور ہی نفع اس سے حاصل کر لینا۔ بیساختہ جواب دیا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے پھینک دیا ہو میں اس کو خدا کی قسم کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گا۔[له]

(له حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔۱۲۔)

اسی طرح زبان سے روکنے کی مثال تو اس انتہائی درجہ تک کی مل جاتی ہے کہ بظاہر کسی کے پاس سلام کہے بغیر چلا آنا زیادہ سے زیادہ ایک معمولی معاشرتی کوتاہی کے سوا کوئی بڑا منکر امر نہیں معلوم ہوتا، پھر بھی اوپر ہی کہیں گزر چکا کہ اس کو بھی کس بلیغ اہتمام سے روکا گیا کہ ایک صحابی بلا اسلام کے حاضر خدمت ہو گئے تو حکم دیا کہ واپس جاؤ اور السلام علیکم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالید یا ہاتھ کی قوت کا سب سے موثر و وسیع نام و تام مظہر حکومت یا تلوار کی طاقت ہے، اسلامی حکومت و خلافت کی حقیقت یا اصل غرض و غایت اس قوت و طاقت سے معروف و منکر کے امر و نہی کی خدمت ہی ہوا کرتی ہے —— ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

اسی طرح اسلامی جنگ و جہاد نہ بالذات ملک گیری و اقتدار کے لئے ہے نہ تجارتی و استعماری مفادات و اغراض کے لئے نہ کسی تہذیب و ثقافت یا سیاسی و معاشی دعوت و دعوات کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنے کیلئے، نہ اس فرضی نام نہاد آزادی کے لئے کہ کسی دوسرے جغرافیائی ملک و خطہ یا رنگ و نسل والے اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے نکل کر خود اپنے ہی ملک و خطہ والوں کی غلامی میں آ جائے جو درحقیقت نام ہے زمین پر گلی کوچے شر و فساد پھیلانے کا۔ اسی آزادی کا مظاہرہ آج کل کانگو، لاؤس اور کمبوڈیا میں کیسی طوائف الملوکی و خونریزی سے ہو رہا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام کے جنگ و جہاد کا مدعا بالکلیہ شر و فساد کی طاقتوں کو مغلوب اور خیر و صلاح کی طاقتوں کو غالب کرنا ہے۔ قرآن مجید کی جامع اصطلاح میں اس شر و فساد کی راہ شیطان کی راہ (سبیل الطاغوت) جس کیلئے ہمیشہ سے زیادہ آج کے شیطان دوستوں (اولیاء الشیطان) نے پورے سیارۂ ارض کو میدان جنگ بنا رکھا ہے اور خیر و صلاح کی راہ کی قرآنی تعبیر سبیل اللہ ہے۔ مسلمانوں کو صرف اس راہ کیلئے اور صرف اولیاء الشیطان ہی سے حدود و شرائط کے تابع رہ کر جہاد کی اجازت یا حکم ہے ——

الذین آمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلوا اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا۔

کہہ کر (پہلے اجازت لو کہ) کیا میں آجاؤں؟ - ایک اور موقعہ پر کسی صاحب نے اجازت کی درخواست تو کی کہ کیا آجاؤں؟ مگر "السلام علیکم" نہیں کہا اس پر آپ نے خادم کو حکم دیا کہ جاؤ اور ان کو اجازت لینے کا پورا ادب سکھلا دو کہ پہلے "السلام علیکم" کہیں پھر اجازت مانگیں کہ کیا آجاؤں۔ ان صاحب نے یہ سن لیا اور خادم کی ہدایت کے بغیر ہی پہلے "السلام علیکم" عرض کیا پھر اجازت چاہی کہ کیا آجاؤں؟

اللہ اکبر جس معاشرہ میں ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے آداب معاشرت تک پر ایسی روک ٹوک اور ان کی اتنی کڑی نگرانی کا عملی اہتمام ہو تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس میں بڑے سے بڑے فسق و فجور معاصی و منکرات کا علانیہ ارتکاب کرنے والوں کو ایسی کھلی چھوٹ مل سکے، بس دیکھتے رہیں اور زبان تک نہ ہلائیں۔ خصوصاً خطاب خاص سے تو اچھے اچھے علما و صلحا بلکہ ایسے مصلحین و مبلغین تک جنھوں نے اصلاح و تبلیغ کو ماشاء اللہ اپنی پوری پوری زندگیوں کا مشن بنا لیا ہے، اپنی خاص مجلس میں بلکہ اپنے خاص زیر نگرانوں کو روک ٹوک گویا ناجائز ہی جانتے ہیں۔ حالانکہ دوسروں کے سامنے روک ٹوک سے دوسروں کو بھی سبق ملتا اور ان کی بھی جہالت و غفلت دور ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ طرز اصلاح و تعلیم ہی کا اختیار کیا جائے، اہانت و تذلیل کا ہرگز ہرگز نہ ہو۔ گو اپنے توابع یا زیر نگرانوں مثلاً اہل و عیال شاگردوں مریدوں وغیرہ کے حق میں حسب ضرورت ناراضی و تنبیہ کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر ضروری و مؤثر بھی ہوتا ہے کہ اپنی ناپسندیدگی کا مناسب سختی سے اظہار کیا جائے۔

تیسری صورت یعنی دل سے معاصی و منکرات کی تغییر یا ان سے بیزاری کے اظہار کی بھی ایک مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی سنت سے لیجئے۔ مشکوٰۃ شریف (کتاب الرقاق) کی ایک حدیث میں حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ باہر تشریف لے جا رہے تھے اور ہم لوگ (کچھ صحابہ) ساتھ تھے کہ نظر مبارک ایک قبہ نما بلند مکان پر پڑی تو (بطور نکیر) فرمایا یہ کیا! (یعنی ایسا منکر مکان کس کا ہے) لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں انصاری کا ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے تو خاموشی اختیار فرمائی لیکن دل میں (غصہ و ناراضی کے ساتھ اس کو) لئے رہے۔ یہانتک کہ جب اس مکان کے مالک انصاری کسی وقت حاضر خدمت ہوئے اور لوگوں کے مجمع میں سلام عرض کیا، تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور ایسا ایک مرتبہ نہیں بار بار فرمایا کہ جب وہ سلام کرتے آپ منہ پھیر لیتے۔ آخر ان انصاری نے دوسرے صحابہؓ سے جو زیادہ حاضر باش تھے شکایت کی کہ کیا بات ہے؟ میں حضورؐ کے اس طرزِ عمل میں بخدا اپنے متعلق غصہ اور ناراضی کا اثر محسوس کر رہا ہوں؟ لوگوں نے جو بات تھی بیان کر دی، کہ حضورؐ ایک دن باہر تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں تمہارے اس بلند قبہ نما مکان پر نظر پڑی تو اس کو ناپسند فرمایا۔ بس اتنا معلوم ہونا تھا کہ وہ انصاری سیدھے اپنے گھر آئے اور مکان کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ پھر جب ایک دن دوبارہ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا تو دریافت فرمایا کہ وہ قبہ کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کی کہ مالک مکان نے حضورؐ کی ناراضی محسوس کر کے ہم سے شکایت کی کہ کیا بات ہے؟

تو جو حقیقت ہم کو معلوم تھی کہہ سنائی، جس کے بعد انھوں نے اس کو مسمار کر ڈالا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے بھی اپنی ناگواری اور غصہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ " ہر وہ عمارت جو غیر ضروری ہو اس کے مالک کے حق میں وبال ہے "

ترجمہ میں جو توسیعی تشریحات درج کر دی گئی ہیں معلوم رہے کہ وہ راقم ہذا کی نہیں بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مشہور و مسلم فارسی ترجمہ مشکوٰۃ اشعۃ اللمعات کی ہیں ان تشریحات سے قطع نظر نفس روایت کے الفاظ سے بھی اتنا بہرحال واضح ہو جاتا ہے کہ ہاتھ یا زبان سے قدرت نہ رکھنے کی صورت میں دل سے برا جاننے (یا تغیر بالقلب کے) صرف یہ معنی نہیں کہ بس زبان بند کر لینے سے فرض اتر گیا، بلکہ جیسا بار بار اوپر عرض کیا جا چکا جہاں تک ہو سکے دل کی ناراضی و بیزاری کو کم از کم معاشرتی بے تعلقی کے ظاہری طرز عمل سے ضرور اس منکر کے مبتلا کو محسوس کرانا چاہیئے، خصوصاً جب معلوم ہو کہ اس محسوس کرانے کا اس پر کچھ نہ کچھ اثر بھی پڑے گا۔ ہاں اگر ایک طرف اس پر کوئی اثر پڑنے کی توقع نہ ہو اور دوسری طرف اپنے کو کوئی ایسا ضرر پہنچ جانے کا قوی اندیشہ ہو جو ناقابل تحمل ہو تو محض انفعالی طور پر صرف دل سے کسی منکر کو برا جان لینا بھی انشاء اللہ ایمان کے ادنیٰ و آخری درجہ کو بچانے کے لئے کافی ہوگا۔

منکر کو ہاتھ اور زبان سے روکنے اور بدرجہ مجبوری یا کسی مصلحت و حکمت سے کم از کم دل سے برا جاننے اور مناسب طرز عمل سے اس پر اظہار بیزاری کے ذریعہ معمولی سے معمولی منکرات تک کو مٹانے اور روکنے کی یہ تینوں نبوی سنت کی عملی رہنمائیاں ہیں

ان میں ایک بات یہ بھی خیال کرنے کی ہے کہ ان کا تعلق خصوصیت والے یا اکابر صحابہ رضی سے نہیں بلکہ بستی (مدینہ طیبہ) کے عام باشندوں یا امت کے عام افراد ہی سے معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ ایک تو یہی ہے کہ بلا کسی خاص تعلق کے صرف عام اسلامی و ایمانی ہمدردی و خیر خواہی کا فریضہ بھی آپس میں ایک دوسرے کو معروف و منکر کا امر و نہی کرتے رہنا ہے اس کے علاوہ حضرات انبیا کا اپنی امت کے تمام افراد سے راعی و رعیت یا نگران اور زیر نگرانوں کا جو خصوصی تعلق ہوتا ہے وہی ذمہ داری و مسئولیت ان کے وارث و جانشین حضرات علما پر کم سے کم اپنی بستی اور پاس پڑوس والے عام مسلمانوں کے معاملہ میں عائد ہوتی ہے کہ اپنے پاس آنے جانے ملنے جلنے والے یا چلتے پھرتے راستہ گلی میں کبھی کسی مسلمان کو کسی چھوٹے سے چھوٹے منکر میں بھی مبتلا دیکھ لیں تو ہاتھ زبان یا دل سے جس طرح اور جتنا بھی اس کو باز رکھ سکیں رکھیں۔

علما و مشائخ کی ذمہ داری | غرض اتنا تو ہر معمولی سے معمولی عالم دین کا عالمانہ و دینی فرض منصبی ہی ہے کہ اس نے دین کے اوامر و نواہی کا جو علم حاصل کیا ہے اس کے امر و نہی کو صرف عملاً ہی لوگوں تک نہ پہنچاتا رہے بلکہ جہاں تک ہاتھ زبان کی یاری یا کم از کم دل کی ناراضی و بیزاری کے اظہار کے ذریعہ ان پر عمل کرا سکتا ہے کرائے۔ باقی بہت سے علماء و مشائخ اس گئے گذرے زمانے میں بھی ایسے ہیں جو سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اچھے خاصے اپنے عقیدتمندوں اور ارادتمندوں کے چھوٹے بڑے حلقے رکھتے ہیں جن پر وہ اسی نوعیت کا اثر رکھتے ہیں جو حضرات انبیا کا خاص اصحاب یا حواریوں پر ہوتا تھا

لہذا ان کی تو خاص طور ہی پر چھوٹے بڑے امر و نہی کے باب میں پوری اور کڑی نگرانی اسی طرح پر واجب ہے جس طرح خود اپنے اہل و عیال کی بلکہ حضرت حکیم الامت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ نے تو مشائخ کی ذمہ داری اور مسئولیت کو والدین و اولیا کی ذمہ داری سے بڑھ کر قرار دیا ہے کیونکہ بچوں پر "گو شرعاً ہماری اطاعت واجب ہے مگر انھوں نے صراحۃً اس کا کوئی التزام و معاہدہ نہیں کیا کہ تم ہم کو تعلیم و تبلیغ کرو اور ہم تمہاری تعلیم پر عمل کریں گے"۔ بخلاف شیخ و سالک یا پیر و مرید کے تعلق کے کہ وہ "نام ہی ہے مرید کی جانب سے معاہدہ اطاعت کا اور پیر یا شیخ کی جانب سے معاہدۂ تعلیم و اصلاح کا"۔ اس لئے مریدوں کو ان کے چھوٹے بڑے تمام منکرات پر روک ٹوک نہ کرنا صریح خیانت و معصیت ہے"۔ جس میں ترک تبلیغ کے (عام گناہ) کے ساتھ وعدہ خلافی کا (خاص) گناہ بھی شامل ہے"۔ اور اس عام و خاص خیانت و گناہ کے مرض میں صرف عام دوکاندار یا درگاہی پیر ہی گرفتار نہیں بلکہ اچھے خاصے صاحب علم و صلاح مشائخ تک کو دیکھا کہ "مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں کچھ روک ٹوک نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوخ یا تو پیری و مریدی کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر پہلو تہی کرتے ہیں"۔ [۵۲]

مخلص مشائخین کی معروف و منکر کے امر و نہی سے غفلت کا سبب	اصل میں مخلص اہل صلاح یا خواص مشائخ جان بوجھ کر پہلو تہی تو کیا کرتے لیکن یہ عام غلطی و غفلت خدا جانے

[۵۱] یعنی والی و وارث (ر غ۔م) [۵۲] تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۲۴۰

کیسے پھیل گئی ہے کہ معمولی نماز روزہ کے سوا ایک طرف سلوک و تعلیم کو خواص و مخلصین بھی تمام تر ذکر و شغل وغیرہ کے معمولات ہیں محدود سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف معروف و منکر کے امر و نہی کی کتاب و سنت نے جو اہمیت دی ہے اس پر بڑے بڑے علما و صلحا میں بھی عمل و اہتمام اٹھ جانے سے اس کا مامور و منصوص فرض و واجب ہونا ہی ذہنوں سے نکل گیا ہے۔ ورنہ خیال کرنے کی بات ہے کہ یہ حضرات اگر اپنے زیر اثر سیکڑوں ہزاروں معتقدوں مریدوں کو تمام چھوٹے بڑے معروفات و منکرات کی امر و نہی کے ذریعہ نگرانی فرماتے رہیں تو ایک طرف کیسے یہ خود مرید و معتقد پکے اور پورے مسلمان بن جاتے اور دوسری طرف یہی مرید و معتقد دوسروں خصوصاً اپنے توابع یا اہل و عیال وغیرہ کے اعمال و اخلاق یا معروف و منکر حسب استطاعت و موقع ہاتھ زبان یا دل سے نگرانی کرتے۔ اس طرح بالکل فطری و طبعی راہ سے ان سیکڑوں ہزاروں پیروں مریدوں کا اثر نسلاً بانسل اور لاکھوں لاکھ تک پھیلتا چلا جا سکتا۔ دین فطرت کی تعلیم جس طرح ہر باب میں بے تکلف فطری و طبعی اصول پر مبنی ہے اسی طرح اجتماعی و متعدی اصلاح و تبلیغ کیلئے بھی معروف و منکر کے امر و نہی کا جو جامع نظام خود کتاب و سنت نے عطا کیا ہے آج کل کی مصنوعی جماعت سازیوں والے طرح طرح کے پر مفاسد طریقوں کے مقابلہ میں کیسا سیدھا سادہ بے تکلف و بے خرچ اور بے مفاسد نظام و انتظام ہے۔ ہا غیروں کی نقالی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو کر ہم نے گھر کی کیسی کیسی دولتوں سے اپنے کو محروم کر لیا ہے!

اہلِ مدرسہ علما پر طلبا کی تربیتی ذمہ داری کا فریضہ

ان عام و خاص علما و صلحا کے بعد تیسرا طبقہ ان حضرات علما کا ہے جن کی نگرانی میں چھوٹے بڑے سیکڑوں ایسے دینی مدارس چل رہے ہیں جن میں ہزاروں طلبا علوم دین ہی کی تحصیل و تکمیل میں دس دس بارہ بارہ سال تک اپنی پوری پوری طلب علم کی زندگیاں لگا دیتے ہیں اگر ان کی ایک طرف دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہی دینی تربیت بھی ہوتی رہے بلکہ تربیت و عمل کا علم و تعلیم سے زیادہ اہتمام و انتظام ہو کہ وہی علم و تعلیم کا اصل مقصد ہے اور دوسری طرف برابر ان کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جاتی رہے کہ علم دین حاصل کرنے ہی سے ان پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ عائد ہو جاتی ہے کہ اپنی اہلیت و استطاعت بھر گھر باہر اپنوں پرایوں سب کو اپنے معلوم احکام دین پہنچاتے اور اپنے اثر و قوت، زبان و دل حال و قال سب سے حسب موقع و محل ان احکام پر عمل کی نگرانی کرتے رہیں یعنی وہی تواصی بالحق یا معروف و منکر کے امر و نہی کے انبیائی علم کے انبیائی حقوق و فرائض ادا کرتے رہیں تو کیا ہمارے موجودہ دینی مدارس اور ان سے نکلنے والے یہ ہزاروں علما ہی اپنے لاکھوں مسلمان بھائیوں کو اٹھتے بیٹھتے ملتے جلتے خطاب خاص و عام سے ہر طرح بے تکلف روزمرہ کے دینی احکام سے واقف اور ساتھ ساتھ اوامر و نواہی کے امر و نہی سے ان کی پابندی پر آمادہ نہیں کرتے رہ سکتے ہیں؟

دین کی صاف سیدھی اور روشن راہ

کیا اور کس طرح عرض کیا جائے کہ راقم عاجز کی نظر میں تو دین تمام تر یسر ہی یسر اور آسانی ہی آسانی ہے۔ انفرادی ہی نہیں اجتماعی یا

ملی راہ بھی نہایت صاف سیدھی اور روشن (سمحاء بیضاء) ہی ہے، جس پر چل کر افراد
ہی کی طرح پوری ملت بھی بے کھٹکے ملی یا قومی کمال و معراج کی منزل کو پا سکتی ہے
نہ دین کی ملی و اجتماعی خدمات کے لئے آج کل کی بیدینی کی راہوں اور بے دینوں کی لائی
اور چلائی ہوئی بات بات پر جماعت سازیوں یا کنونشن بازیوں بڑے بڑے جلسوں،
جلوسوں، پنڈالوں، دھنواں دھار تقریروں سیکڑوں ہزاروں میل کے سفروں، دوروں
اور ان کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر ہزاروں لاکھوں کے چندوں فنڈوں، ان میں
اسرافوں بے احتیاطیوں کی ضرورت اور نہ مصالح سے زیادہ ان راہوں کے دوسرے
طرح طرح کے مفاسد میں پڑنا ناگزیر۔ ضرورت اس کی اور صرف اس کی ہے کہ عام و خاص
علما اور ان کے اعتماد و تعلق والے خصوصی قلعے (مدرسے) اپنے انبیائی وراثت و نیابت کے
مقام و منصب کو جان پہچان کر اس پر کھڑے ہو جائیں۔ اور "مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ
اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کی مخلصانہ و بےغرضانہ شان سے محض رب العلمین کی ربوبیت
یا پروردگاری و دستگیری پر بھروسہ کر کے اپنی اپنی جگہ بلا کسی مصنوعی جماعت سازی و چندہ
بازی کی فکر میں پڑے وسعت و استطاعت بھر جہاں تک پہنچ سکے **دعوت خیر** یعنی
گھر باہر والوں کو احکام دین (کہ وہی خیر ہیں) پہنچانے اور ان پر اپنی بساط بھر قوت و
زبان دل و جان سے چلنے چلانے یا معروف و منکر کے امر و نہی پر آمادہ ہو جائیں تو بس
انشاء اللہ "منکم امۃ" والے علما کے یہی دو کام (یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ" اور "یَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ) جہاں تک اللہ تعالیٰ کی مشیت و مرضی ہے اس کی

نصرت و دستگیری سے امت کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی سب ہی کام بنتے جائیں گے۔
جس طرح حضرات انبیا کے گرد چھوٹی بڑی "اصحاب و حواریین" کے مخلصین کی جماعت دفتر و
رجسٹر چندہ و فنڈ کے بغیر جمع ہو جاتی تھی اور پھر جب جتنا اس کو اللہ تعالیٰ کو بڑھانا پھیلانا
ہوتا تھا بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی اور اللہ ہی کو منظور یا مقدر ہوتا تھا تو اس بے سروسامان
اور بے یار و مددگار جماعت کو اپنی یاری و مددگاری سے اپنی حاکمانہ خلافت و نیابت بھی
زمین کے کسی چھوٹے بڑے خطہ پر عطا فرما دیتا تھا۔

یہی صاف سیدھا سبق تمام انبیا خصوصاً امام الانبیا خاتم النبیین (صلی اللہ علیہم
اجمعین) کی سیرت و اسوہ سے ملتا ہے۔ اس کے سوا تمام دوسری راہیں دوسروں کی نقالی،
احساس کمتری اور خود اپنے گھر کی دولت سے غفلت اس کی ناقدر شناسی اور احساس کمتری کا
نتیجہ ہیں۔ جس میں عوام کا کیا ذکر اچھے اچھے خواص علما و صلحا تک مبتلا ہیں اور جس سے عجیب
عجیب خوش فہمیوں اور طرح طرح کے افسوسناک تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ایک اچھے
فہیم و صالح تعلیم یافتہ، جنھوں نے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی کتابیں ہی خوب
نہیں پڑھیں ماشاء اللہ بڑی عقیدت بھی رکھتے ہیں کہنے لگے کہ حضرت نے انفرادی صلاح
و اصلاح کی تو بڑی خدمات انجام دیں لیکن دین کا کوئی جماعتی و اجتماعی کام نہیں کیا۔ دل میں
انا للہ پڑھا اور خاموش ہو رہا خصوصاً اس لئے کہ یہ خیال غالباً ان غریب سے زیادہ ایک
مشہور دینی جماعت کے مسلم اہل علم و قلم کے اکابر کی ترجمانی تھی۔ مطلب وہی تھا کہ آج کل کے
رنگ میں جس کو اجتماعی کام کہا جاتا تھا وہ نہیں کیا۔

اجتماعیت کے جدید شکنجوں کی ہلاکت سامانی

اجتماعیت کے کاروبار یہ رنگ ڈھنگ سچ پوچھئے تو بادیت میں شرابور فرنگی بے دینوں کا لایا اور چلایا ہوا ہے۔ بادہ پرستی کے غلو و غلبہ میں مغربی ذہن مشینوں پر مشین بناتے بناتے خود اتنا میکانی (میکانکل) ہو کر رہ گیا ہے کہ انسان کو بھی زیادہ تر ایک جاندار مشین ہی تصور کرنے لگا ہے۔ بات بات پر جماعت سازیوں اور ادارت بازیوں کے ذریعہ سارے افراد کو مختلف چھوٹے بڑے اجتماعی شکنجوں میں کس کر اور مشین ہی کی طرح کا ایک پرزہ بنا کر اس کی ساری انفرادیت و شخصیت کا خون کرڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ انسانی خلقت و فطرت اصلاً میکانکی نہیں، اخلاقی و روحانی ہے جو انفرادی اختیار و ارادہ کی آزادی زیادہ سے زیادہ اور مصنوعی اجتماعی جکڑبندیوں کو کم سے کم چاہتی ہے۔ ان جکڑبندیوں کو بالکل ناگزیر صورتوں تک محدود رہنا چاہئے تاکہ انفرادیت و شخصیت کو اپنے پورے اٹھان اور ارتقا کے لئے فضا میسر آسکے۔ بخلاف آج کل کے خصوصاً حکمیت پسندانہ بالکل مختارانہ رجحانات کی جکڑبندیوں میں روحانی و اخلاقی انفرادیت کا دم ہی گھٹا جا رہا ہے۔

اسلامی تعلیمات پر ادنیٰ و معمولی نظر و فکر سے بھی یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام خارجی یا میکانکی بندشوں سے زیادہ اور بہت زیادہ قدم قدم پر انفرادی اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ باطنی و قلبی یا اخلاقی و روحانی تبدیلیوں کا داعی ہے۔ اس کے علاوہ دیکھا جائے تو ہر چھوٹے بڑے کام و مقصد کے لئے جماعتوں پر جماعتیں اور تنظیموں پر تنظیمیں بناتے چلے جانا در اصل اجتماع و اتحاد کے بجائے بہ حیثیت مجموعی پورے معاشرہ کے حق میں

انتشار وافتراق تحزب وتفرق ہی کا سرچشمہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ ہر جماعتی تعلق وتعصب نظر وفکر کے لئے کوئی نہ کوئی قدرۃً ایسا محدود دائرہ بنا دیتا ہے کہ آدمی حق وصداقت کو تمام تر اپنی ہی جماعت میں دائر ومنحصر جاننے لگتا ہے اور دوسری جماعتوں سے کچھ نہ کچھ امتیاز وحریفانہ چشمک پیدا ہو جانا نفسیاتی طور پر ناگزیر ہوتا ہے۔ مزید براں جدید طرز کے رائج الوقت جماعتی کام اور ان کے لئے جماعتی نظام عین اپنی ساخت ونوعیت ہی کی رو سے جلسوں، جلوسوں، تقریروں، گشتوں وغیرہ طرح طرح مظاہروں و نمائشوں دکھاوے اور سناوے کے مواقع پر مشتمل ہوتے ہیں جن سے نا تربیت یافتہ عوام وخواص سب ہی کے نفس کو پیٹ بھر غذا ملتی رہتی ہے۔ ان مظاہراتی ونمائشی مفاسد کے غلبہ اور ان میں انہماک کا ایک اثر یہ پڑتا ہے، کہ ان راہوں سے خالص دینی خدمات کرنے والوں خواص بلکہ اخص خواص تک کو دیکھا جاتا ہے کہ انفرادی حقوق وفرائض —— معاملات واخلاق اور معاشرت —— کے بہتیرے موٹے موٹے قطعی ومنصوص اوامر ونواہی میں کچھ ایسی بے حسی کے ساتھ کوتاہیاں فرمانے لگتے ہیں، کہ گویا وہ دینی احکام ہی نہیں، تو پھر ان کے عوام کا پوچھنا ہی کیا! وہ غریب ان مظاہراتی جلسوں، تقریروں کیا، مظاہراتی شب بیداریوں تک سے فریب کھا کر انفرادی حقوق وفرائض کی کوتاہیوں میں گھر باہر ہر جگہ جتنی دور بھی نکل جائیں کم ہی ہوگا۔

٭

اشتمالیت واشتراکیت کی فریب کاری

سچ پوچھیے تو "أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (۲:۴۴)" کی خود فراموشی و خود فریبی ہی فرنگی و مغربی رنگ کے جماعتی و اجتماعی سیاسی و معاشی کام کرنے والے لیڈروں کی خاص شان ہوتی ہے۔ عوامیت و جمہوریت اشتراکیت و اشتمالیت (سوشلزم) ہی کا دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹنے اور دنیا بھر سے اونچ نیچ مٹانے والے بڑے سے بڑے مدعیوں کو دیکھئے کہ خود اپنا حق شاہوں شہنشاہوں سے بڑھ کر فرعونی شان و شوکت نمود و نمائش کی اونچائیوں اور بلندیوں ہی کو جانتے ہیں۔ اور تو اور اپنے آئے دن کے مظاہراتی استقبالوں اور ان کے نمائشی و آرائشی انتظاموں ہی پر بے دریغ انتہائی بیدردی کے ساتھ ہزاروں لاکھوں کے وارے نیارے کرتے کراتے رہتے ہیں اور کسی چھوٹے منہ سے نہیں نکلتا کہ یہ ان ہی کاشتکاروں، مزدوروں یا عوام کی گاڑھی کمائیوں پر کیا ظلم ڈھایا جا رہا ہے جن کی پستی و مفلسی کا دن رات رونا رویا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی اسی ہندوستان میں کیا شاہِ حجاز و شاہ ایران کی بدنام قرونِ وسطیٰ والی بچی کھچی شاہی یادگاروں کے استقبال سے کہیں بڑھ چڑھ کر ابھی شاہی و شہنشاہی کے کٹر دشمن فراعنۂ روس (بلگانن و خروشیف) کے شاہانہ استقبالوں پر ہندوستان بھر میں جو لاکھوں لاکھ آتش بازی کی طرح پھونک دیئے گئے وہ انھیں نیچوں کے اونچا کرنے میں نہیں لگا دیئے جا سکتے تھے جن کی خاطر "سوشلسٹک ڈھنگ" کی جنت بنانے والے منصوبوں کے لئے قرض اور بھیک تک مانگنا پڑ رہی ہے۔

❀

انبیائی دعوت ہی میں جماعت بندیوں اور ان کے فساد کا علاج ہے

انبیائی دعوتوں، ان کے تبلیغی و اصلاحی طریقوں میں بھلا آج کل کی طرح بات بات پر جماعت سازیوں، پارٹی پارٹیوں اور ان کے گوناگوں فتنوں فسادوں کا دُور دُور بھی کوئی نام و نشان ملتا ہے! وہاں تو لے دے کر بس توحید الٰہ کی ایک ہی دعوتِ حق ہے اور اس کے ایمان و انکار رد و قبول سے بالکل قدرتی اور غیر مصنوعی طور پر مومن اور کافر دو جماعتیں یا حزب اللہ اور حزب الشیطان دو پارٹیاں از خود وجود میں آجاتی ہیں۔ باقی جو کچھ ظاہری و جزئی اختلافات و امتیازات ہیں یا ان ہی کے اندرونی مراتب و درجات ورنہ دراصل حق و باطل جنگ و صلح کی ساری جدوجہد اور کشمکش کے اصولی محاذ و میدان صرف دو ہی ہیں ایک طرف ہر اعتبار سے باطنی و داخلی وحدت ہی وحدت ہے اور کثرت محض ظاہری و خارجی۔ دوسرا میدان تمامتر شرک و کثرت کا میدان ہے جس کی عین شرکی فطرت کا لازمہ جماعت سازیاں گروہ بندیاں اور نہ ختم ہونے والی تقسیمات در تقسیمات کا جنگل اور پھر جنگل ہی کا قانون ہے۔

اسلامیت یا اسلامی توحید کا تقاضا تو جماعتوں، طبقوں، فرقوں اور گروہوں کو مٹانا یا "جَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا" کی محض تعارفی یا انتظامی تقسیمات کو کم سے کم ناگزیر حدود کے اندر محدود رکھنا، نہ کہ اُلٹے دین و اسلام کے غلط استعمال ہی جتنی تقسیمات و اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان ہی میں اور اسلامیت ہی کے نام لگا لگا کر بے شمار نئے طرز کی جماعت بازیوں کا آئے دن اضافہ کرتے چلے جانا۔

لیکن اس بدعقلی و بدفہمی کا کیا علاج کہ اللہ و رسول کتاب و قبلہ سب کچھ ایک رکھ کر بھی ایک نہیں رہ سکتے اور روز بروز قومی نہیں بین الاقوامی طور پر بھی آپس میں ایک دوسرے سے دور و نفور ہوتے جاتے ہیں مسلمان ممالک ہی ساری دنیا کے ملکوں اور قوموں سے بازی لئے جا رہے ہیں۔[1] کتاب اور "بینہ" سب کچھ اگلوں پچھلوں سب سے بڑھ کر دیئے جانے اور رکھنے کے باوجود تفرق و تشتت انتشار و پراگندگی ہی میں سب سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں ــــ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸/۴) حالانکہ حکم ان کو بھی سب سے بڑا اپنی سب سے بڑی کتاب سے وہی ایک ملا تھا جو اگلے کتاب والوں کو کہ بس ہر طرف سے کٹ کر ہر طرح ایک اور خالصۃً ایک ہی کی بندگی میں لگ جاؤ۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (۹۸/۵) اور فرقوں یا جماعتوں میں بٹنے اور پھٹنے کے بجائے سب کے سب اللہ ہی کی رسی کو پوری مضبوطی و قوت سے تھامے رہو۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۳)

وقتی تدابیر اختیار کرنے کی گنجائش و صورت | بے شک اجتماعی کاموں کے لئے فرنگی طریقوں کی حیثیت سے فی الجملہ وقتی تدابیر کی ضرورت ہے اور مناسب وقت نئی پرانی فرنگی غیر فرنگی ہر قسم کے وسائل و تدابیر اختیار کرنے کی شریعت کی طرف سے اجازت

---

[1] پاکستان و افغانستان مسلمان اور در وزرا کے پڑوسی ہو کر بھی آپس کی دشمنی و دوری میں ترقی کرتے جا رہے ہیں اور ہندوستان و افغانستان ہزاروں میل دور ہو کر بھی نزدیک سے نزدیک ہوتے جاتے ہیں (یا للعجب!)

ہی نہیں بعض صورتوں میں واجب بھی ہے۔ البتہ وسائل چونکہ صرف وسائل ہی ہیں مقاصد بہرحال نہیں، اس لئے دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے، ایک تو یہ وسائل یا تدابیر نفس شریعت و اسلامیت کے اصولی مقصد اور ان کی روح و مزاج کے منافی نہ ہوں دوسرے ان کے مفاسد ان کے مصالح پر غالب نہ ہوں یعنی اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا (۲۱۹) کی صورت ہو ورنہ دنیا میں کون ایسا شر و فساد ہے جس میں کوئی نہ کوئی خیر و خوبی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔

فرنگی ہر راہ میں شر ہی پیش پیش ہے!

عجیب بات یہ ہے کہ جدید فرنگی راہوں کی ایک اجتماعیات ہی پر کیا موقوف، اس کی سیاسیات و معاشیات، تمدن و تہذیب کون سی ایسی چیز ہے جس میں انسانی زندگی کے لئے خیر و صلاح سے زیادہ شر و فساد کا سامان نہ ہو۔ اور تو اور سب سے زیادہ آنکھوں کو خیرہ کردینے والی ان کی سائنس اور سائنسی ایجادات ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس راہ نے کہاں جا پہنچایا ہے کہ جس زندگی اور تہذیب و تمدن کی آسائش و آرائش کے لئے ساری ایجادات تھیں ہائیڈروجن بم راکٹ میزائل وغیرہ کی ایجاد خود اس زندگی اور تہذیب و تمدن ہی کو پورے سیارۂ ارض سے صفایا کردینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ یہ تو خیر ابھی صرف دھمکی ہے اور دھمکی کے خالی آزمائشی تجربات جو وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں، ان کے مضر صحت اثرات سیکڑوں ہزاروں میل دور بسنے والی انسانی بستیوں بلکہ ان کی آئندہ آنے والی نسلوں تک کی خبر لے لیتی ہیں لیکن موٹر، موٹر سائکل بس وغیرہ سواریاں تو سمجھا جاتا ہے کہ نعمت ہی نعمت ہیں۔ تاہم ان کی خیر و برکت بھی خود انسانی زندگی ہی کے حق میں جہاں تک جا پہنچی ہے،

اس کا اندازہ صدق (۱۷ فروری ۱۹۵۶ء) میں ذرا ملاحظہ ہو۔ شکاگو سے چلی ہوئی رپوٹر کی (۵ فروری کی) اطلاع ہے کہ ۱۹۵۵ء میں سڑکوں پر حادثات کا شکار ہو کر ملک میں ۳۸،۳۰۰ انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور اس سے بڑی میزان تاریخ کے کسی سال میں نہیں ملتی۔ سڑک کے علاوہ اور مختلف حادثوں سے مرنے والوں کی میزان ۹۲ ہزار تک پہنچی اور زخمیوں کی ۹۲ لاکھ تک! خود صاحبِ صدق کی درخواست ہے کہ "سڑک اور موٹر، موٹر سائیکل اور بس کی برکتوں کو گنانے والے کیا اچھا ہو کہ کبھی کبھی ان اعداد پر بھی نظر فرما لیا کریں" آگے ارشاد ہے کہ "بہت بڑی جنگوں کا ذکر نہیں باقی معمولی اور چھوٹی جنگوں کے کشتوں اور زخمیوں کی تعداد بھی اتنی ہوتی ہے جتنی اس متمدن ترین ملک میں حفاظت کے بہترین سامان وتدبیر کے باوجود زمانہ امن میں رہی؟" یعنی اس جدید ترقیوں کے "متمدن ترین ملک" کا زمانہ امن بھی غریب غیر متمدن ملکوں کے مقابلہ اور ہلاکت کے معاملہ میں مستقل میدانِ جنگ ہی ہے۔

در ماندۂ صلاح وفسادیم الحذر　　زیں رسم ہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

میکانی تمدن کی ترقی جسم وجان کیلئے بھی تو آفت ہی بنتی چلی جارہی ہے

خدا و آخرت سے چڑھنے والے تو کیوں سوچنے لگے، ورنہ ہے درحقیقت یہ بڑے سوچ کی بات کہ جس قدر یہ چیز ترقی کرتی جارہی ہے اسی قدر اس تمدن کی وہ ترقیاں بھی جو روح وقلب کے لئے نہ سہی کم از کم جسم وجان کے لئے خیر ونعمت معلوم ہوتی ہیں وہ بھی بہت کچھ آفتِ جان بنتی چلی جارہی ہیں۔ سلامتی تا بہ امکان ان سے دوری ہی میں نظر آتی ہے۔ خصوصاً

خالص دینی کاموں میں تو اس لادینی تمدن و ترقی کی راہوں کو وسائل و تدابیر کے درجہ میں استعمال سے جب تک بالکل ہی مجبوری و اضطرار نہ ہو بالکل ہی بچنا چاہیئے۔ اور ہمارے اہل علم و فہم اگر ذرا ایمانی فہم و فراست سے کام لیں تو انشاء اللہ انبیائی طریق و تدبیری کو بالخصوص نبی الانبیائی اسوہ کو اس عہد میں بھی خطرات و مفاسد سے پاک ہی نہیں بلکہ جن مقاصد کے لئے یہ تدابیر اختیار کی جاتی ہیں ان کیلئے کارگر بھی زیادہ پائیں گے۔

بے دینی قالب میں دینی مقاصد کی روح کو باقی رکھنے کی کوشش بے سود ہے

اصل یہ ہے کہ جو زندگی و تمدن اپنی ذات و جوہر ہی میں بالکلیہ دنیا پرستی اور دین بیزاری کا نام ہو، اس کے تدبیری چوکھٹوں میں ہم خالص دینی مقاصد کو بے دینی کے مفاسد سے بچا کر فٹ ہی کیسے کر سکتے ہیں۔ نہ یہ بات قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ دینِ کامل نے حالی اپنے مقاصد کے تجریدی و فلسفیانہ تصورات عطا کرکے، ان کی تکمیل و تحصیل کی عملی تدبیروں کے لئے ہم کو غیروں وہ بھی دین بیزاروں کے حوالہ کر دیا ہو اور خود اپنے مقاصد کے مناسب اسباب و وسائل کے معاملہ میں رہنمائی سے محروم رکھا ہو۔

اسلام کا مقصد بھی متعین ہے اور حصولِ مقصد کے وسائل بھی بتا دیئے گئے ہیں!

اس ذرا طویل مگر ضروری جملہ معترضہ کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح مسلمان کا مقصود تمام تر ایمان اور عمل صالح کی اسلامی زندگی کے سوا نہ کچھ ہے نہ ہونا چاہیئے، اس طرح اس مقصود کے حصول و طلب یا مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی صلاح و اصلاح کے تدبیری اسباب و وسائل بھی کتاب و سنت کی اسلامی تعلیمات ہی ماخوذ و مستفاد ہونا

چاہئیں اور جس طرح ایمان و عمل صالح ہی کے ایجابی و سلبی پہلوؤں کی تعبیر معروف و منکر ہے، اس طرح معروف و منکر کے اوامر و نواہی پر اطلاع اور ان کی اتباع کا اس سے زیادہ سہل و سادہ فطری و طبعی موثر و کارگر طریقہ و تدبیر کیا ہو سکتی ہے کہ ایمان و عمل کے ہر معروف و منکر پر امر و نہی معاشرہ کے کم و بیش ہر فرد کا فریضہ اپنے اپنے محل و مقام کے اعتبار سے اور اپنی اپنی استطاعت بھر اس طرح قرار دیدیا جائے جس طرح معروف پر عمل اور منکر سے احتراز خود ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے پس کتاب و سنت پر مبنی معروف و منکر کے امر و نہی کی تعلیم و تدبیر کے مذکورہ بالا پنج گانہ نظم و نظام کا مفاد و مدعا یہی ہے۔

خیال کیجئے کہ جس ملک و معاشرہ میں (۱) سب سے پہلے ایمان و عمل کے معروفات و منکرات کا کامل و تحقیقی علم رکھنے والے علما کے ایک پورے طبقہ کے طبقہ کا خاص یہی کام و منصبی فرض ہو کہ چھوٹی بڑی تمام آبادیوں میں اس کے افراد پہنچ اور پھیل کر لوگوں کو خیر و شر یا طاعات و معاصی کے صحیح صحیح احکام پہنچاتے، ان کی بھلائیوں برائیوں کو سمجھاتے بالفاظِ دیگر ان کی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ معروف و منکر کا امر و نہی فرماتے رہتے ہوں۔ (۲) پھر اس کی بدولت ہر راعی یا نگراں اپنی رعیت یا اپنی زیر نگرانی خصوصاً اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اپنی مسئولیت و ذمہ داری کو محسوس کرتے ہر معروف و منکر کی نگرانی کا اپنی پوری قوت و اثر سے حق ادا کرتے رہتے ہوں اور (۳) عام مسلمان بلا خاص تعلق کے بھی نفس اپنی ایمانی ولایت و محبت بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ یا محض دینی ہمدردی و خیر خواہی کی راہ سے ملتے جلتے، اٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے کو

اپنی اپنی واقفیت واہلیت کے موافق سمجھاتے بجھاتے، روکتے ٹوکتے رہتے ہوں ــــ
(وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹/۷۱) تو ایسی سوسائٹی یا سماج کی فضا میں منکرات کو غلبہ کے ساتھ
سر اٹھانے کا موقع ہی کیسے مل سکتا ہے ایسی فضا میں تو معاصی و منکرات کی حقارت و
کمتری اور ان سے نفرت و بیزاری آپ سے آپ پیدا ہوگی اور علانیہ و بے باکانہ فواحش و
منکرات کے ارتکاب کی جرأت ہی مشکل سے کسی کو ہوگی۔ جس کو ہوگی بھی بہت ہی چوری
چھپے۔ یہ نہ ہوگا کہ برملا بدیوں اور بدکاریوں کا انفرادی ارتکاب متعدی ہوکر پورے
معاشرہ میں آزادی سے اپنے زہر کو پھیلاتا رہے۔ علی الاعلان پھولنے پھلنے کا موقع ایسے
ماحول میں صرف حسنات و معروفات ہی کو حاصل ہوگا۔ (۴) تب ہی جاکر مسلمانوں کا
معاشرہ بہترین قوم یا خیر امۃ ہوگا جو ساری دنیا کی صلاح و فلاح کے لئے نکالی یا
اٹھائی گئی ہے اور جس کا اصل منصب و مقام بلا امتیاز رنگ و نسل قوم و ملک پوری
انسانیت کو خیر و صلاح کی راہ پر لگانا اور شر و فساد کے راستہ سے ہٹانا ہے۔

خیر امۃ کے اس منصب و مقام کا منصبی فریضہ ہی امر بالمعروف و نہی عن
المنکر قرار دیا گیا ہے کہ "تم ایسی بہترین امت ہو جو اٹھائی ہی گئی ہے پوری انسانیت
(کی بہتری) کے لئے اس طرح کہ ان کو معروف کا امر اور منکر سے نہی کرتے ہو۔ كُنْتُمْ
خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔
(۵) بالآخر جب اور جہاں کہیں اس خیر امۃ کو اس کی خاص امتیازی شان

خیر ہی کی بدولت زمین پر موعود استخلافی یا سیاسی اقتدار و تمکن یا حکومت اللہ تعالیٰ کی نصرت سے عطا ہو جائے تو اس کی شرط و غرض بھی دونوں ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کو قرار دیا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور ان کی نصرت فرمائے گا جو اس (کے دین) کی نصرت کرتے ہیں۔ اللہ یقیناً بڑی قوت و طاقت والا ہے (بندوں کی طرف سے خدا یا دین کی نصرت کی صورت یہی ہے) کہ جب ہم ان کو زمین پر اقتدار و تمکن بخشتے ہیں تو (خود اپنی صلاح کا بھی اہتمام رکھتے ہیں کہ) نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح کا حق بھی اس طرح پورا کرتے ہیں کہ) ان کو نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں اور انجام کار سب باتیں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔"

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲: ۴۰-۴۱)

اسلامی نظام صلاح و اصلاح کا یہ آخری یا پانچواں جز پہلے کے چاروں اجزا ہی کا در اصل لازمہ و تتمہ ہے جس طرح کسی جماعت و معاشرہ کا جو فرد بجائے خود خیر کا بہترین نمونہ ہوتا ہے، وہی دوسرے افراد کو خیر کی تعلیم و تلقین کے لئے زیادہ موزوں ہوتا اور اسی کی بات زیادہ وزنی ہوتی ہے، اسی طرح پوری انسانیت کے لئے بھی وہی قوم یا امت من حیث امت خیر یا معروف کے امر و اجرا اور

شر یا منکر کی نہی و انسداد کی زیادہ حقدار و ذمہ دار ہوگی، جو سب سے زیادہ خود خیر و معروف کے علم و عمل کی عالم و عامل ہو۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں کا بہ حیثیت قوم و ملت خیر امۃ ہونا ہی دنیا کی تمام دوسری امتوں یا قوموں کی ہدایت و اصلاح کی اب واحد راہ و تدبیر ہے۔ کیونکہ خیر و شر یا معروف و منکر کی کامل و مستند الٰہی تعلیمات کو قیامت تک کے لئے اب اسی امت کی امانت و حفاظت میں دیدیا گیا ہے۔

ہماری شرمناک صورت قرآنی آئینہ میں

مگر ہماری امانت و حفاظت کا حال جب یہ ہو رہا ہو کہ دست و بازو یا قوت و طاقت کیا معنی قال و حال یا زبان و دل تک سے معروف و منکر کے امر و نہی کے ان تعمیری عناصر اربعہ ہی کو خیرباد کہہ چکے ہوں جن پر خود مسلمانوں کا اجتماعی و قومی اعتبار سے خیر امۃ ہونا موقوف و مبنی تھا، تو پھر دوسری قوموں کو ہم سے کیا سبق مل سکتا ہے بلکہ الٹا نتیجہ یہی نکلنا تھا اور نکل کر رہا کہ دین کے معاملہ میں دنیا کی بدترین قوم یا شر امۃ ساری دنیا پر اس طرح چھا گئی کہ ساری دنیا کے خود مسلمان بھی الٹ کر اس کو بہترین قوم (خیر امۃ) سمجھنے اور اس کے نقش قدم پر چلنے میں اپنی خیر ماننے لگے۔ عملاً بس ہو بہو وہی نقشہ ہمارا ہو رہا ہے جو خود قرآن مجید نے ابتدائے اسلام میں منافقین و یہود کا کھینچا ہے کہ

کفر کی باتوں میں دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں، زبانوں پر ایمان و اسلام کا دعویٰ ہے دلوں میں اس کا نام و نشان نہیں۔ ......

اَلَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔ ......

خدا کی باتوں کو توڑ مروڑ یا تحریف کرکے ان کے	يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ
اصل مطلب سے ہٹا اور اپنے مطلب کا بنا) کر لوگوں	يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ
سے کہتے ہیں کہ ان (محرف) باتوں ہی پر تم سے	وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا . . .
عمل کرنے کو کہا جائے تو کرو ورنہ نہ کرو . . .	. . . .
اللہ تعالیٰ (ناپاکی پر اڑے ہوئے) ایسے دلوں کو	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ
پاک فرمانے کا ارادہ ہی نہیں فرماتا۔ ان کیلئے	يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا
تو دنیا میں بھی (بوزنہ صفت نقالی اور احساس	خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ
کمتری کی) رسوائی ہی رسوائی ہے اور آخرت	عَظِيمٌ ۝ (۵/۴۱)

میں تو بڑی سزا ہے ہی۔

کاش پرانے منافقین کے اس آئینہ میں آج ہم خود مدعیان ایمان اپنی صورت دیکھتے اور پہچانتے! خصوصاً جدید تعلیم و تہذیب کے وہ طبقات جن کے ہاتھ میں ہر جگہ مسلمانوں کی قیادت و حکومت آگئی ہے کہ مغرب و مغربیت کی ہر گندگی پر مکھیوں کی طرح گرتے ہیں۔ زبانوں پر اسلام، اسلام کے دعوے اور نعرے ہیں لیکن دل ایمان و اسلام کے یقین سے خالی۔ قرآن و حدیث کی "برقی و پرویزی" انتہائی جاہلانہ تحریفات تک پر اتنے جری کہ پوری اسلامیت کو بالکلیہ فرنگیت کے قالب میں ڈھال لینا چاہتے ہیں۔ نہ اس منافقانہ اسلام کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینے اور اصل اسلام کی طرف رخ کرنے سے روکنے میں اپنی والی کوئی کسر اٹھا رکھتے ہیں۔ ظاہری طور پر جہاں

کچھ آزاد ہیں یا نام نہاد آزادی حاصل ہوگئی ہے وہاں بھی اس آزادی کو مسلمانوں کو مسلمان یا خیر امت بنانے یا اسلام و اسلامیت کی خدمت میں استعمال کرنے کی جگہ اس سے اسلام دشمنوں ہی کی نقالی و غلامی کا کام لیتے[1] اور آخرت کی بربادی سے پہلے ہی دنیا کی رسوائی خریدتے ہیں: فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (پ۱ ع۱۰)

جدید تعلیم والے تو پھر بھی اپنی تعلیمی ذہنیت ہی کے ہاتھوں خود اپنی اور اپنے سے بڑھ کر اپنے دین و ملت کی رسوائیوں کی اس راہ و روش پر ایک حد تک معذور کہے جا سکتے ہیں لیکن ان جدید (ماڈرن) مولویوں پر کس زبان و قلم سے ماتم کیا جائے، جن کی تعلیم تمام تر دینی دارالعلوموں میں ہوئی۔ کہ اپنی جدت پسندی و روشن خیالی کی داد دینے اور لینے میں تعدد ازدواج و قطع ید وغیرہ کے ایسے مسائل و حدود تک میں يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ کی جرأت سے نہیں چوکتے، جو کتاب و سنت میں منصوص اور عملاً سلف سے لے کر خلف تک متواتر و مسلم چلے آرہے ہیں۔[2]

---

[1] ابھی ۲۷ مارچ ۱۹۶۱ء کو "مسلمانوں کی خاندانی زندگی" کے نام سے وہاں کے فوجی صدر کی طرف سے جو فرمان صادر کیا گیا ہے اور جو کتاب و سنت اور قریباً چودہ سو سالہ اجماع و تعامل کے سراسر خلاف ہے مگر اعلان یہ کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد قرآن پر عمل کرانا ہے۔ انا للہ!

يخدعون الله والذين آمنوا وما يخدعون الا انفسهم وما يشعرون۔

[2] اور یہ تحریفی کارنامے ماہانہ رسالے اور کتابوں پر کتابوں کے ذریعہ اس ملک میں انجام دیئے جاتے ہیں جو عین اسلام کے نام پر لاکھوں مسلمانوں کا خون کرا کے وجود میں لایا گیا ہے!

بھڑاس نکلتی ہی چلی جا رہی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ حق جوئی کے بجائے خود رائی اور خدا پرستی کے بجائے دنیا پرستی کے غلبہ و استیلا نے دین کے کھلے کھلے حقائق و بدیہیات کو بھی خود بہتیرے اہل دین کی نظر میں ایسا نظری بنا دیا ہے کہ دین اپنے گھر ہی میں "غریب" و بیگانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری سچ پوچھئے تو بہت کچھ معروف و منکر کے نظم و نظام کے تعطل ہی پر ہے۔ جس معاشرہ کے لوگ عملی زندگی میں نہ خود معروف کو جاننے پہچاننے کی فکر کرتے ہوں، نہ دوسروں کو پہچنوانے کا کوئی انتظام و اہتمام رہ گیا ہو اور منکر پر انکار و نکیر کا، اس میں معروف کا حشر اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ نامعروف و اجنبی ہو کر رہ جائے اور بالآخر حدیث ہی کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہونے لگے کہ معروف منکر اور منکر معروف کی جگہ لے لے، نہ صرف عمل میں بلکہ علم میں بھی۔ یعنی لوگ معروف سے انجان ہو کر منکر ہی کو معروف جاننے اور اس کا امر کرنے لگیں۔

قریب قریب یہی صورتِ حال اب اس معاشرہ و امت کی آنکھوں کے سامنے ہے جو خود اپنے ہی اندر نہیں،	ہم کو جسمانی صحت کا تو بڑا خیال ہے مگر ایمانی صحت کی ذرا بھی فکر نہیں!

دنیا کی تمام دوسری قوموں کے اندر بھی معروف و منکر کے امر و نہی کے لئے خاص طور پر مامور و مبعوث تھی۔ کوئی بالکل غیر و اجنبی یا معمولی ملنے جلنے والا بھی کسی بیماری آزاری یا کسی جانی و مالی خطرہ سے دوچار ہو تو اس پر آگاہ کر دینا اور اپنے علم و تجربہ میں کوئی دوا و تدبیر ہو تو بتلا دینا معمولی بھلا آدمی بھی اپنی بھلمنساہٹ یا آدمیت و شرافت کا

تقاضا جانتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ دنیا کی بیماری و خطرہ کو بیماری و خطرہ جانتا ہے لیکن دین یا ایمان و عمل صالح کی بیماریوں اور خطرات میں بیگانوں کیا دوستوں عزیزوں بلکہ اپنے بال بچوں تک کو مبتلا دیکھنے والوں کتنوں کو اتنی بھی پرواہ ہوتی ہے، جتنی ان کے معمولی کھانسی بخار کی۔ صاحبزادے بلکہ اب تو بہنوں کی صاحبزادیاں بھی اگر اسکول نہ جائیں، امتحان کی تیاری نہ کریں، اس میں پاس نہ ہوں تو بازپرس، ڈانٹ ڈپٹ سب کچھ ہوگی۔ لیکن روزہ نہ رکھیں، نماز نہ پڑھیں، مسجد کا دروازہ نہ جھانکیں، جھوٹ سچ کی پرواہ نہ کریں، بے دینوں بد دینوں کی سوسائٹی میں بگڑتے رہیں، سینما بینی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے رہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ بی اے۔ ایم اے بھی ہوتے رہیں تو ماں باپ گھر بھر سب ہی باغ باغ! خود اپنے قریبی عزیزوں، دوستوں کے تجربات یہاں تک ہیں کہ نماز روزہ کا ذکر ہی کیا، صاحبزادہ بی اے، ایم اے ہوتے ہوتے روشن خیالی کی معراج کفر وارتداد کی باتوں تک جا پہنچے پھر بھی خاصے اچھے دیندار والدین کو ایسی اولاد کا غم نہیں حالانکہ یہی صاحبزادہ اگر ذرا کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوں تو یہی والدین جان و مال سب کی بازی لگا دیتے ہیں۔ بات وہی ہے کہ دین کی صحت و مرض بیماری و ہلاکت یا معروف و منکر کی شعوری اہمیت و وزن ایسے دیندار والدین کے قلب میں بھی دنیاوی زندگی کے معمولی نفع و ضرر کے برابر بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ اس کا بڑا سبب بھی یہی ہے کہ جس چیز کی برائی بھلائی کا شعور و احساس بہ حیثیت مجموعی پورے معاشرہ میں مردہ ہو چکا ہو اس کے کچھ افراد اگر اپنے ذاتی عمل کی حد تک معاشرہ کی عمومی روش سے

کچھ الگ بھی ہوں تو اس کی وجہ بالعموم کوئی اتفاقی و استثنائی عادت کی سی "لَمَّا یدخل الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ" والی نیم جان ہی ہوتی ہے نہ کہ دل میں جاں گزیں یا شعوری ایمان و یقین کی زندگی و سرگرمی کی طرح فعال و جاندار، جو لازماً دوسروں میں بھی صحتمند زندگی ہی کے آثار و افعال دیکھنا چاہتی ہے۔

اب تو عوام کیا علما و خواص تک کا ایمان کچھ نیم جان اور انفعالی ہو کر رہ گیا ہے کہ بڑے بڑے خاندانی علما و	افسوس کہ علما و خواص کا ایمان تک محض انفعالی ہو کر رہ گیا ہے۔

مشائخ کے گھروں میں بھی یہی عبرتناک تماشہ دیکھا جاتا ہے۔ ابھی ایک دو پشت پہلے باپ دادا مسلم عالم و بزرگ تھے لیکن بیٹوں پوتوں کی وضع قطع صورت شکل باپ دادا سے کیا ملتی، نماز روزہ کے معمولی واجبات و فرائض اور بہتوں نے ایمان و اعتقاد تک سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ اس کے بعد اسلامی معاملات و اخلاق اور معاشرت کا ماتم ہی کیا یہی نہیں کہ اولاد کی معاملاتی بدعنوانیوں پر کوئی موثر مواخذہ نہیں بلکہ جان کر بھی ایسی اولاد کے ایسے معاملات میں بواسطہ یا بلاواسطہ معین و مددگار ہیں، جن سے ان کی بدمعاملگیوں کی اور ہمت بڑھتی ہے۔ رہیں اخلاقی و معاشرتی کوتاہیاں تو ڈھونڈے ہی سے اب ویسا کوئی عالم و بزرگ ملے گا جس کی مجلس خود ہی کبر و ریا حسد و غیبت، حرص و ہوس، نفس و نفسانیت، جاہ طلبی و زر پرستی کی باتوں سے گرم نہ رہتی ہو، تو اہل و عیال یا اپنے توابع اور عام مسلمانوں کی روک ٹوک کا سوال ہی کیا! کہاں حدیث میں آتا ہے کہ "معروف و منکر کے امر و نہی یا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا آدمی اور جو کچھ بھی

گفتگو کرتا ہے اس کے حق میں بُری ہی بُری ہوتی ہے" کہاں عوام و جہلا نہیں ہمارے خواص و علما کی مجلسوں کو بھی جا کر دیکھ لیجئے بالعموم ان ہی باتوں خصوصاً منکرات پر روک ٹوک سے خالی ہوں گی۔ جو حضرات خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاحی خدمات ہی میں مشغول ہیں ان کی بھی خاص مجلسوں کو معروف و منکر کے خصوصی امر و نہی سے آپ خالی ہی پائیں گے۔ بیشک نرمی سے کہئے، حکمت و دانائی سے کہئے، تنہائی میں سمجھائیے لیکن کہئے تو ایمان و عمل صالح کے ہر چھوٹے بڑے معروف و منکر کے معاملہ میں۔

بہت سے منکرات کو ہم معمولی اور ناقابل توجہ سمجھنے لگے ہیں۔

ایک اور بڑی غلطی اور غلط فہمی بہت سے منکرات و معاصی کے صغیر و خفیف یا چھوٹے اور ہلکے ہونے کے استخفاف بلکہ استحقار کی پھیل گئی ہے حتیٰ کہ ماڈرن علما کی زبانوں پر ان کا "محقرات امور" تک ہونا آجاتا ہے! اور بعض حضرات تو ان کی اصلاح کو نظر انداز کر دینا ہی عین اصلاحی حکمت و دانش خیال فرماتے ہیں۔ حالانکہ معصیت چھوٹی ہو یا بڑی ہے بہرحال وہ معصیت یعنی خدا کی نافرمانی یا اس کی ناراضی کا سودا۔ اور خدا کی چھوٹی سی چھوٹی ناراضی کو چھوٹا سمجھنا اور چھوٹا سمجھ کر بھول چوک سے نہیں دیدہ و دانستہ بے جھجک برابر خریدتے رہنا۔ خود ہی سوچئے کہ کتنی بڑی بے باکی و جسارت بلکہ خدائے ذوالجلال کی عظمت و جلال کی صریح عملی نفی ہے۔ یہی راز ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو جان بوجھ کر برابر کرتے رہنا یا صغائر پر اصرار خود کبیرہ یا بڑا گناہ یا بڑی نافرمانی بن جاتا ہے۔ ذرا خود اپنی فطرت کو ٹٹولئے کہ جس کی جتنی زیادہ عظمت و محبت آپ کے قلب میں ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ آپ اس کی

چھوٹی سی چھوٹی ناراضی ونافرمانی سے بھی طبعاً کتنا بچنے اور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا ذراسی باتوں میں آپ اس کی خوشی وخوشنودی کا منہ دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر سوچئے تو سہی کہ ایمان واسلام کا دعوٰی کرنے والے کی نظر میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون معظم ومحبوب ہو سکتا ہے یا ہونا چاہئے۔

"جمال پسندی" کا فطری جذبہ دین ہی کے معاملہ میں سرد ہو جاتا ہے | ایک اور انسان کی بالکل فطرت ہی کا مطالبہ ہے کہ وہ مقدور بھر اپنی چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی ناقص یا داغدار رکھنا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ کھانے پینے، رہنے سہنے ہر معاملہ میں اپنی والی "خوب سے خوب تر" ہی کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ مرغوب ومطلوب شئی میں کمال ہی کا طالب و حریص رہتا ہے۔ بلکہ جب پورے کمال کا ساعی ہوتا ہے تب ہی جا کر اس کو تھوڑا بہت دلخواہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ پھر کیا قناعت کی مشق کے لئے دین اور دین کی باتیں یا خدا ورسول کی رضا وناراضی کے اوامر ونواہی رہ گئے ہیں۔ ایک اور مثال بہت موٹی لیجئے کہ کسی دولتمند ہزاروں لاکھوں کے مالک کے اگر دس پانچ روپے جیب سے گرتے رہتے ہوں تو کیا وہ ان کو برابر گرتے یا کسی اور طرح بے پرواہی سے ضائع جاتے دیکھتا رہے گا۔ ایسا کرنے والا اگر دولتمند ہو بھی تو مفلس ہوتے دیر اس کو بھی نہ لگے گی۔

بات یہ ہے کہ دین کی دولت کا دولت ہونا کیا سچ پوچھئے تو دین کی حقیقت ہی ہماری نظر سے غائب ہے۔ جب دنیا کی چند روزہ زندگی —— وہ بھی ایسی کہ ٹھکانا ایک روز کیا ایک سانس کا نہیں —— اس کی ضروریات ہی نہیں فضولیات تک کی چھوٹی

چھوٹی چیزوں کے بناؤ سنوار میں اپنی والی ہم کوئی کورکسر لگی نہیں رکھتے، تو دین جس کی حقیقت یوم دین یا آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اُس کے بناؤ بگاڑ، ترقی و تنزل، نقص و کمال کے کسی معاملہ کو حقیر و خفیف یا چھوٹا اور ہلکا جاننا، خدا ورسول کی عظمت و محبت کی شان سے قطع نظر بجائے خود خالص طبعی و فطری نقطۂ نظر کے بھی سراسر منافی ہے۔ کوئی سلیم الفطرت انسان اپنے صاف و شفاف کپڑوں پر ذرا سی نجاست کی چھینٹ یا داغ دھبہ لگ جانا اتفاقی طور بھی پسند نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ ایسے دھبوں کو چھوٹا جان کر سارے لباس پر ان کی گل کاریاں بے فکری سے کرتا رہے۔ دین کی قدر و قیمت اور یوم دین کی حقیقت پر نظر رکھنے والے کو تو اپنی آخرت کے سدا بہار ایک پھول پتی کے برباد ہونے کا بھی اتنا غم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے صحابہ و تابعین کا نہیں، اس گئی صدی کے اواخر اور اسی ہندوستان کا ذکر ہے کہ دیوبند کے ایک بزرگ حاجی محمد عابد صاحبؒ کو:-

"ایک روز بہت رنجیدہ دیکھا گیا۔ کبیدگی و افسردگی کی یہ حالت تھی کہ جیسے کسی جواں مرگ پر ہو۔ جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی۔"[1]

گر زباغ دل خلالے کم بود
بر دلِ سالک ہزاراں غم بود

---

[1] سوانح قاسمی جلد دوم از مولانا گیلانیؒ ص ۲۴۱-

خدا کی "رحمانیت" کا غلط تصور بھی صراطِ مستقیم سے ہٹائے ہوئے ہے!

ایک اور زبردست بڑا شیطانی نرغہ وفریب خوف ورجا کے ایمانی اعتدال و توازن کے بجائے خارجیت کے دوسرے سرے پر رجائیت و مرجیئت کا غلو وغلبہ ہے جس نے سلف سے خلف تک اچھے اچھے اہل علم کو صراطِ مستقیم سے ڈگا دیا۔ یعنی خدا کی رحمت ورحمانیت، عفو وکرم پر بھروسہ کر کے معاصی و منکرات پر دلیر ہو جانا۔ بشر بشر ہی ہے فرشتہ نہیں۔ وہ ایمان و عمل صالح کے اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی بشریت کے تقاضوں اور لغزشوں سے معصوم نہیں بن جا سکتا کہ خدا کی رحمت و مغفرت سے بے نیاز ہو جائے بلکہ سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ کی عظمت وکبریائی کے سامنے حضرات انبیا علیہم السلام بھی باوصف معصومیت اپنے ایمان و عمل کے انتہائی کمالات کو بھی ہیچ در ہیچ ہی پاتے اور نجات و مغفرت کے لئے پناہ اس کے فضل وکرم ہی کے دامن میں ڈھونڈتے اور پاتے ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کو بہانہ بنا کر بڑے چھوٹے کسی طرح کے معاصی و منکرات پر دیدہ و دانستہ نفس کو مسلسل ڈھیل دیتے رہنا اس کا سبب تو جیسا کہ حضرت امام غزالیؒ کی تشخیص ہے کفر خفی یا پھر حماقت جلی ہے ارشاد ہے[1] کہ

"تو دو[2] ہی وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے ایک کفر خفی اور ایک حماقت صریح۔
کفر خفی یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے اور ثواب وعقاب سے تو ناواقف ہے،

---

[1] مولانا علی میاں سلمہ کی تازہ تصنیف "تاریخ دعوت وعزیمت" سے مستفید ہو رہا تھا کہ ص۱۶۴ پر یہ برمحل ارشاد ہاتھ آگیا۔

اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر مخفی اور اس کے استدراج کا خیال کئے بغیر اس کے عفو و کرم پر اعتماد ہے۔ حالانکہ (دنیا و معاش کے معاملات میں) تو روٹی کے ایک ٹکڑے، غلہ کے ایک دانے اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا پر بھروسہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار جتن کرتا ہے اور اس جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ الامانی (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا رہے“۔)

واقعی اسلام کا دعویٰ کرنے والے اُن دانشمندوں کی یہ منطق و ذہنیت عجیب ہی عجیب ہے، کہ دنیا کی مسافرانہ زندگی کے ادنیٰ ادنیٰ اغراض و مقاصد کے لئے بھی ہزار جتن کرتے ہیں لیکن آخرت کی ہمیشگی والے وطن کی خیر و فلاح کے معاملہ میں خدا کے رحم و کرم اور عفو درگذر پر اعتماد و تکیہ کافی جانتے ہیں!

ہر گناہ ایک بیماری ہے اور غفلت اس کو مہلک بنا دیتی ہے۔

کہنا یہی ہے کہ معاصی و منکرات چھوٹے ہوں یا بڑے ہیں سب بیماریاں ہی۔ بارہا چھوٹی سی بیماری مسلسل غفلت و بے فکری کی بدولت بڑی سے بڑی بیماری کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بیماریاں اگر جسم بھر میں یا اکثر اعضاء و جوارح میں پھیل جائیں تو

بھی زندگی کے مقاصد و مشاغل سے آدمی بڑی حد تک ناکارہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ داڑھ میں درد ہو، آنکھوں میں آشوب ہو، پاؤں میں لنگ ہو، ہاتھ کی انگلیوں میں ورم ہو تو بتائیے کہ ایسا آدمی زندگی کا کونسا کام ٹھیک کرسکتا ہے۔ اسی طرح دین کی چھوٹی چھوٹی بیماریاں ہی اگر عقائد و دیانات عبادات و معاملات و معاشرات، غرض ایمان و عمل صالح کے سارے اعضاء و جوارح میں پھیل گئی ہوں اور ان کو چھوٹا یا ہلکا جان کر پیہم ان سے بے پرواہی برتی جارہی ہو، تو یہ صغائر خود ہی کبائر نہ بن جاتے تو بھی ان میں مبتلا کیا صحت مند دینی زندگی کے حقوق ادا کرسکتا ہے۔ چہ جائیکہ بہ حیثیت مجموعی ایمان و عمل صالح کا سارا تن بدن کم و بیش صغائر و کبائر سب سے داغ داغ ہو رہا ہو، تو اسلامی تعلیمات کے وہ دینی دنیوی، انفرادی و اجتماعی برکات و ثمرات جو خود اسلام کی کتاب میں قدم قدم پر ایمان و عمل صالح کی صحتمند زندگی ہی کے ساتھ مشروط و موعود ہیں ان کے بجائے زیان و خسران یا گھاٹے ہی گھاٹے کے سوا کچھ ہاتھ لگ سکتا ہے۔

تقریروں، تحریروں، کتابوں، رسالوں میں دن رات ہم عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ کے واقعات اور تاریخ کو دہراتے رہتے ہیں حالانکہ اس عہدِ سعادت میں زبان و قلم چلانے کا تو کہنا چاہیئے کہ نام ہی نہ تھا، سارا زور ایمان پر مبنی، عبادات و معاملات، اخلاق اور معاشرت کے چھوٹے بڑے اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب پر تھا۔ اور یہ اتباع و اجتناب بھی خود غرضانہ یا اپنی ہی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ دوسروں کو معروف و منکر کا امر و نہی کرنا بھی خود اپنا ہی عمل صالح جانتے اور اس کے واجبات و

مستحبات کا اپنے کو اس طرح مامور و مسئول یا ذمہ دار و جواب دہ جانتے جس طرح خود اپنی ذات کے اعمال و افعال کا۔ کبائر کے عام ارتکاب کا تو ان قرون خیر میں سوال ہی کیا۔ سیکڑوں ہزاروں میں ایک آدھ سے بھی ان کا صدور ہو جاتا تو ایمانی حس و ادراک اتنا بیدار و جاندار، اور خدا و آخرت کا خوف اتنا شدید کہ اس کے مقابلہ میں عورتیں تک خود اپنے جرم کا اقرار کر کے باصرار سنگ ساری کی عبرتناک موت قبول کر لینا آسان جانتی تھیں۔

دوسروں کو امر و نہی کی جو کچھ نوبت آتی تھی وہ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر۔ ان بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر روک ٹوک کا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھ زبان اور دل سے جیسا اہتمام تھا۔ تینوں کی مثالیں اوپر گذر چکی ہیں۔

استیذان یا حصول اجازت بظاہر ایک معمولی معاشرتی ادب کا معاملہ ہے لیکن متفق علیہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں یہاں تک ہے کہ "اگر بلا اجازت تم کو کوئی جھانکے بھی اور تم اس کو کنکری مار دو جس سے اس کی آنکھ ہی کیوں نہ پھوٹ جائے تو تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا"۔ عام عادت ہے کہ دروازہ پر کوئی آواز یا دستک دے اور پوچھو کہ کون ہے؟ تو جواب میں صرف "میں" کہہ دینے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ حضرت جابرؓ نے ایسا ہی جواب دیا تو آپؐ نے نہایت ناگواری سے فرمایا کہ "میں کیا"! اصاف نام لے کر بتلانا چاہیے کہ فلاں ہوں۔

صحابۂ کرام میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی نگہداشت

معلم کتاب وحکمت علیہ التسلیم والتحیہ کی اسی نبوی تعلیم وتربیت کا اثر حضرات صحابہ میں یہ تھا کہ خدا اور رسول کی نافرمانی و ناراضی کی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ان کی نظر کے سامنے آجاتی تو اس کو نظر انداز نہ کرنا کسی حال میں بھی گوارا نہ فرماتے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جن کی عظمت آج حکومت کے متوالوں کی نظر میں زیادہ تر اُن کے ایک کامیاب صاحب حکومت و سیاست کی ہے، دیکھو کہ ان کی نظر بھی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کتنی رہتی تھی جن کو ہماری بڑی بڑی اصلاحی دعوتوں اور نامی گرامی دینی مدرسوں کے اچھے اچھے صاحب علم وصلاح ذمہ دار بھی اتنی چھوٹی جانتے ہیں کہ طلبا کیا اساتذہ تک کو معمولی و زبانی تنبیہ تفہیم تک کے درخور نہیں خیال فرماتے۔ آپ کو شہید کیا جاچکا ہے، آخری وقت ہے، عین اس حالت میں اسی نام نہاد "چھوٹی" بات پر بھی امر و نہی کا یہ خیال کہ کوئی نوجوان ٹخنوں سے نیچی ازار میں سامنے آجاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ "بیٹا ازار ٹخنوں سے اونچا رکھا کرو، اس میں صفائی بھی اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری بھی"۔

ان ہی فاروق اعظمؓ کا قول ہے کہ کسی کو اس کے عیب پر مطلع و متنبہ کر دینا، اس کو ہدیہ دینے کے ہم معنی ہے۔ ہدیہ کا حکم وحکمت یہ ہے کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے —— تھادوا تحابوا —— لیکن آج بالعموم سب سے زیادہ نامحبوب و نامرغوب بلکہ مبغوض ہدیہ کسی دینی معروف ومنکر کا امر و نہی ہے جو بارہا محبت کے بجائے اُلٹے نفرت کا سبب ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی نوکری چاکری یا جاہ ومال وغیرہ کے

کسی دنیوی نفع وضرر سے کسی کو آگاہ کردو تو البتہ تم کو اپنا بہت بڑا دوست وخیر خواہ جانے گا!

حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں جہاں مسجد و بازار وغیرہ مختلف مقامات و مواقع کے منکرات گنائے ہیں وہاں راستہ کے منکرات میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں تک شامل ہیں کہ کوئی راستہ میں خربوزہ کے چھلکے یا اتنا پانی ڈالدے جس سے لوگوں کے پھسلنے کا ڈر ہو تو اس کو بھی روکنا چاہیئے. جانور پر کوئی اس کے برداشت سے زیادہ بوجھ لادے جا رہا ہو تو اس کو بھی منع کرنا واجب ہے۔

خیر القرون کے بعد بھی مدت تک امر و نہی کا اہتمام رہا

خدا ہی بہتر جانتا ہے یا تاریخ کے جاننے والے کچھ بتا سکتے ہوں کہ امتِ محمدیہؐ کی تاریخ میں یہ افتاد کب سے پڑی کہ اس فاروقی ہدیہ کا اب راستہ گلی یا غیروں پرایوں میں کیا خود اپنوں اور اپنے گھروں میں نہ خوش دلی سے کوئی دینے والا ہی ملتا ہے نہ لینے والا۔ اگرچہ خلفائے عباسیہ کے زمانے ہی میں کم وبیش ہر طرح کے منکرات ومفاسد پھیل چکے تھے، تاہم امام صاحب ہی نے ایسے واقعات نقل فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک معروف و منکر کے امر و نہی کا فریضہ مسلمان معاشرہ میں آج کل کی طرح نسیا منسیا نہیں ہو چکا تھا۔ ایک طرف خود ان خلفا تک کو لوگ ٹوک دینے کی جرأت رکھتے تھے۔ دوسری طرف عوام میں بھی ایک دوسرے کو روک ٹوک کرنے والا پائے جاتے تھے۔

(۱) خلیفہ مامون کو معلوم ہوا کہ ایک شخص بلا خلیفہ کے حکم و اجازت کے لوگوں میں

معروف ومنکر کا امر ونہی کرتا ہے۔ خلیفہ نے بلوا کر پوچھا کہ تم بلا ہماری اجازت کے ایسا کیوں کرتے ہو۔ مامون اس وقت کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا جس کا کوئی حصہ گر کر اس کے پاؤں کے تلے آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے اپنا پیر خدا کے ناموں پر سے ہٹا لیجئے پھر جو کچھ فرمانا ہو فرمائیے۔ مامون مطلب نہ سمجھا اور بار بار پوچھتا رہا کہ کیا کہتے ہو؟ آخر چوتھی بار اس شخص نے کہا کہ یا تو آپ خود اٹھا لیں یا مجھ کو اجازت دیں کہ میں اٹھا لوں۔ اجازت دی تو اس نے پاؤں تلے کی کتاب کی طرف اشارہ کیا تب خود مامون نے کتاب کو اٹھا کر چوم لیا۔ اس کے بعد پھر اس شخص سے سوال کیا کہ تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیوں کرتے ہو؟ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سپرد کیا ہے کہ

جب ہم ان کو زمین پر اقتدار عطا کرتے ہیں تو الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف لوگوں کو معروف ومنکر کا امر ونہی کرتے ہیں۔ ونھوا عن المنکر۔ (۲۲/۴۱)

اس نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین آپ نے بجا فرمایا لیکن ہم (عوام یا رعایا) اس معاملہ (یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر) میں آپ ہی کے مددگار ہیں۔ اور اس کا انکار وہی کرے گا جو کتاب وسنت سے ناواقف ہو، خود اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے کہ

مسلمان مرد ہوں یا عورت سب ایک دوسرے المومنون والمومنات بعضھم کے مددگار وخیر خواہ ہیں کہ آپس میں ایکدوسرے اولیاء بعض یامرون بالمعروف کو معروف ومنکر کا امر ونہی کرتے ہیں۔ وینھون عن المنکر۔ (۹/۷۱)

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی مثال عمارت کی سی ہے جس کی ایک اینٹ دوسری کو سنبھالتی ہے ــــ المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً ــــ تو جو شخص کتاب و سنت کے احکام (یا اوامر و نواہی) کے جاری کرنے میں آپ کی مدد کرے، اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔"

یہ اور اس قسم کی جو دوسری حکایات امام صاحب نے ذکر فرمائی ہیں ان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون اور خلافت کے بعد بھی مدتوں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اسلامی انتظام و نظام کی اس اہمیت کا کچھ نہ کچھ احساس و اہتمام عام مسلمانوں تک میں موجود تھا کہ اس کو صرف علما و حکام کا فریضہ نہیں جانتے تھے، بلکہ خود قرآن کی اس آیت (اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ) کی رو سے جس کو راقم ہذا بار بار دہراتا آیا ہے معروف و منکر کے امر و نہی یا نگرانی کو ہر مسلمان کی ایمانی و اسلامی ذمہ داری جانتے تھے اور المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً کی حدیث کی رو سے تو سچ پوچھئے مسلمان اجتماعی حیثیت سے ایسی عمارت بن ہی نہیں سکتے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے ہو، جبتک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ اپنے اپنے محل و مقام کے مناسب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی ایمان و عمل صالح کی اینٹ کا سہارا نہ بنا رہے۔ معروف و منکر کی حقیقت ہی اس کے سوا کیا ہے کہ وہ نام ہے معاشرہ میں ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے احکام یا اوامر و نواہی کے عملی اجرا کا۔ ؎۱

(؎۱ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک خصوصی معاشری اصلاح کی کوشش عام ہونی چاہیئے	بادش بخیر۔ تھانہ بھون ہی کی یاد نے ایک اور بہت بڑے فساد کی یاد تازہ کردی جس کا تعلق بھی دراصل معروف و

منکر ہی کے امر و نہی سے ہے۔ مراد ذات البین کا فساد ہے۔ معاشرہ میں کتنی گوناگوں دینی و دنیوی، جانی و مالی، انفرادی و اجتماعی تباہیاں اور بربادیاں آپس کے بگاڑ اور

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

لہ اس سراپا منکرات کو الحمدللہ خورد و بزرگ بہت سے علما و صلحا سے تعلق کی سعادت نصیب رہی مگر پوری زندگی میں عمر میں صرف ایک خورد مگر علم و صلاح میں بزرگ ایسے ناصح ملے جن سے تجربہ ہوا کہ دین واقعی سراسر نصیحت و خیرخواہی (الدین النصیحۃ) ہے۔ یہ خود راقم احقر کی وضع و قطع کی بعض ظاہری کوتاہیوں سے لے کر اولاد کی تربیت تک کے معاملات میں خورد اور خورد بیں رہ کر اس وقت تک برابر ہر چھوٹی سی چھوٹی بات کی طرف متوجہ فرماتے رہے، جب تک احقر کے عذرات معقول و مقبول ہو کا اطمینان نہ فرمالیا۔ یا اس نے اپنی رائے و عمل سے رجوع نہ کرلیا، یا رجوع سے مایوس نہ ہوگئے۔ بے کہے رہا نہیں جاتا کہ یہ واحد استثنائی مثال سب سے کم عمر ایک تھانوی تربیت یافتہ ——— نام بھی لے دینے ہی کا جی چاہتا ہے ——— حضرت مولانا سید ابرار الحق صاحب سلمہ (ہردوئی) کی ہے۔ ان کا ناصحانہ و خیرخواہانہ معاملہ حسب تعلق کم و بیش سب ہی اہل تعلق سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس اسلامی اخوت، دینی نصیحت اور ایمانی نگرانی و ولایت کی جزائے خیر بالی بال۔ بے حساب عطا فرمائے کہ نہ صرف اپنی ذات تک بلکہ اپنی تبلیغی و اصلاحی دعوت الحق کے ذریعہ اللہ کی کتاب اور اس پر مبنی رسول کی سب سے اہم لیکن مردہ اصلاحی سنت کے نظم و نظام کو از سر نو زندہ فرمارہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بعض تھانوی نسبت والے اکابر ہی کا یہ بھی تجربہ ہوا کہ اپنی اولاد و توابع معتقدوں، مریدوں تک سے اپنی طبعی کمزوری یا ان کی وجاہت وغیرہ سے متاثر ہوکر چشم پوشی و خاموشی ہی نہیں اختیار فرماتے، ہم نوائی تک فرما دیتے ہیں، اور صریح منکرات پر مطلع ہوکر کبھی بہ لطائف الحیل ان کی اصلاح سے گریز فرماتے ہیں حالانکہ پیری و مریدی کے تعلق کو خود حضرت مجدد وقت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے اولاد و والدین یا میاں بیوی کے تعلق سے بھی زیادہ ذمہ داری و مسئولیت قرار دیا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

جھگڑوں ہی کا وبال ہوتی ہیں جو بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہو کر بڑی سے بڑی دشمنی تک جا پہنچتی ہیں۔ عمر بھر کی محبتیں عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہیں، پرانے پرانے دوست ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے پر آمادہ بلکہ بیٹا باپ کے اور باپ بیٹے تک کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے جس کا توڑ ایک ہی ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کہ بیعت کی حقیقت ہی مرید کی طرف سے صریح معاہدۂ اتباع کی ہے اور پیر کی طرف سے صریح معاہدۂ اصلاح ہے اس لئے مرید کی اصلاح کے معاملات میں چشم پوشی و خاموشی دراصل کھلی خیانت و بدعہدی ہے۔ ارشاد ہے کہ

"ایک وہ ہیں جنھوں نے اطاعت کا ہم سے صریح معاہدہ نہیں کیا ہے جیسے بی بی بچے کہ گو شرعاً ان پر ہماری اطاعت واجب ہے مگر انھوں نے صراحتاً اس کا کوئی التزام و معاہدہ نہیں کیا کہ تم ہم کو تعلیم و تبلیغ کرو، ہم تمہاری تعلیم پر عمل کریں گے۔
مگر ایک ایسا تعلق ہے جس میں دوسرا شخص ہماری اطاعت کے صریح التزام کا عہد کرتا ہے یعنی پیری و مریدی کا تعلق۔ کیونکہ پیری و مریدی نام ہی ہے مرید کی جانب سے معاہدۂ اطاعت کا اور پیر یا شیخ کی جانب سے معاہدۂ تعلیم و اصلاح کا۔ صرف ہاتھ میں ہاتھ لیکر سبق پڑھا دینے کا نام پیری و مریدی نہیں جیسا کہ آج عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ بس ایک مرتبہ سبق پڑھ لیا اور مرید ہو گئے، اب نہ پیر کے نزدیک تعلیم ضروری نہ مرید کے لئے اتباع۔ مجھے اس میں کلام ہے کہ اس طرح کسی طالب علم کو چپکے سے جلد مرید کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مرید کی اس غلطی کی گویا توثیق ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے۔"

مرید غریبوں کا سوال ہی کیا، تجربہ و تحقیق کر کے دیکھ لیجئے تھانوی حلقہ کے باہر پیری شاذ و نادر ایسے ملیں گے جو بیعت کی حقیقت ہاتھ میں ہاتھ دینے سے زیادہ کچھ جانتے اور مانتے ہوں۔ باقی مرید کے معروف و منکر یا اصلاح کی ذمہ داری کا احساس ابھی دیکھتے ہی دیکھتے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کہ اصلاح ذات البین جو دراصل معروف و منکر ہی کے امر و نہی کی ایک صورت ہے اس کا معاشرہ میں رواج و اہتمام اس درجہ عام ہو کہ عزیزوں دوستوں تعلق والوں میں جہاں باہم دو شخصوں میں کوئی کشمکش و کشیدگی شروع ہو، بات بڑھنے اور جڑ پکڑنے سے پہلے ہی سلجھانے اور ملانے کی کوشش لازم ہے۔ ابتدا میں کامیابی آسان ہو گی۔

مگر یہ کوشش کرے کون؟ ہمارے بہتیرے مسلمان بھائیوں کا تو لے دے کے خاص مذاق بھڑانا اور فساد ڈلوانا ہی ہوتا ہے۔ جو اس حد تک نہیں جاتے ان میں بھی بہت زیادہ وہ ہوتے ہیں جو لوگوں میں آپس کے بگاڑ کا تماشہ دیکھ کر لطف ضرور اٹھاتے اور موقع پا کر آگ کو بھڑکا دینے سے نہیں چوکتے۔ بعض اچھے اچھے تہجد و تسبیح والوں کو بھی اس کارِ خیر میں کمی کرتے نہیں دیکھا۔ بڑا ولی ان کو سمجھنا چاہیئے جو محض غیر جانبدار تماشائی بنے رہنے پر قناعت کر لیتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس تماشہ کو تاسف و تکلیف کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) خود تھانوی پیروں میں کمیاب ہوتا جا رہا ہے حالانکہ تھانوی پیران پیر کی نظر میں یہ صریح خیانت دمعصیت ہے۔

"جس میں ترکِ تبلیغ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ حقیقتِ بیعت کی رو سے جس طرح مرید کی طرف سے اطاعت کا وعدہ ہوتا ہے اسی طرح شیخ کی طرف سے اصلاح کا۔ حیرت ہے کہ مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع، پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں، کچھ روک ٹوک نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوخ یا تو پیری کی حقیقت نہیں سمجھے یا جان بوجھ کر پہلو تہی کرتے ہیں۔" (تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۱۰۱)

کم از کم تھانہ بھون میں پیری و مریدی کی حقیقت کا یہ سبق اتنا رٹایا جاتا تھا کہ جان بوجھ کر پہلو تہی کے سوا اتنی جلد اس سبق کے بھولنے کا حسن ظن بہت ضعیف الحافظہ حضرات ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

دیکھتے ہیں۔ باقی ایسا تو شاذ ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا جس کو اپنے خاص دوستوں عزیزوں میں بھی اصلاح ذات البین کی کوئی خاص فکر ہوتی ہو، اور ایسے تو بڑے بڑے دینداروں میں بھی عنقا کا حکم رکھتے ہیں، جو اس کو دین و آخرت اجر و ثواب کا کوئی بڑا کام جانتے اور خود اس میں کوئی خاص بڑی دلچسپی لیتے اور کوشش فرماتے ہوں، کم از کم راقم عاجز کو تو مدت العمر میں ایک ہی آدھ ایسی مثال ملی وہ بھی ادھوری، نیم دلانہ کوشش و دلچسپی کی۔

"حکیم الامت" کی امتیازی شانِ اصلاح

ہاں اس بارے میں بھی اگر کوئی بالکل استثنائی تجربہ ہوا تو وہی تھانہ بھون والے بدنام "سخت گیر و سخت مزاج" حکیم الامت کا اپنے ہی ایک نہیں کئی خانگی معاملات میں اور کیا کہوں کہ شان ہر معاملہ میں عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ[1] والے نبی الامت (فداہ ابی و امی) ہی کی ایسی سراپا رافت و رحمت کی کہ اس وقت بھی یاد سے دل بھر آرہا ہے! ایک معاملہ میں تو ایک قریب ترین عزیز نے پوری مسل اس مجرم کے جرائم کی مرتب کرکے خدمت میں بالا بالا بھیج دی تھی۔ یہ تو کیا ہوتا کہ اس سیہ کار کے ساتھ کسی حسن ظن کی بنا پر کوئی یکطرفہ رائے قائم اور فیصلہ صادر فرما دیتے۔ طول طویل پوری فہرستِ جرائم ملاحظہ فرمائی اور گو یہ نالائق نام لیوا حاضر تھانہ بھون ہی میں تھا مگر ایک درمیانی واسطہ سے مسل اس

---

[1] ترجمہ بھی آیت کا تھانوی مفسر ہی کے قلم سے درج ہے کہ "حضورؐ کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے اور تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند یا حریص رہتے ہیں، اور یہ حالت تو سب ہی کے ساتھ بالخصوص مومنوں مسلمانوں کے ساتھ تو بڑے شفیق و مہربان ہیں۔"

تاکید کے ساتھ بھیجی کہ اس کو پڑھ کر اطمینان سے جواب تحریراً ہی عرض کردوں۔ ایک دوسرے اس سے زیادہ سنگین معاملہ میں تو بلا احقر کی کسی درخواست کے خاص ہدایات اور اہتمام کے ساتھ مخدومہ محترمہ پیرانی صاحبہ مدظلہا تک کو درمیان میں ڈال کر اصلاح فرمائی۔ اصلاح ذات البین کو دین کے ایک اہم حق عباد کی طرح فریقین کے حقوق کی پوری رعایت و اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کی کسی دوسری جگہ ان دو سے نہ پہلے کوئی تیسری مثال ملی نہ بعد میں۔ اگر ملیں تو بعض تھانوی اکابر تک کے ہاں بالکل بالعکس مصلحت پسندانہ گریز کی، اور مصلحت بھی کسی فریق کی ناراضی کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ باقی اور جن ایسے اہل اصلاح سے نیازمندی کی سعادت حاصل ہے جن کے تقویٰ و تقدس کے یوں اور بہت سے تجربات کی بنا پر بہت معتقد و معترف ہوں لیکن جہاں تک اصلاح ذات البین کا تعلق ہے، وہ کیا، جو بڑی بڑی مستقل اصلاحی خدمات ہی کے لئے ماشاءاللہ اپنی زندگیوں کو وقف فرمائے ہوئے ہیں، وہ بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بجز عام تقریری و تحریری صورتوں کے خاص انفرادی طور پر نہ معروف و منکر کے امر و نہی کو مامور خیال فرماتے ہیں نہ اصلاح ذات البین کو اصلاحی کام۔

حالانکہ حضرات انبیا علیہم السلام کے ہاں تحریر و تصنیف کے "بے پایاں دفتروں" کا ذکر ہی کیا۔ خطاب عام کے ساتھ تقریروں یا خطبوں کا مجموعہ جمعوں کے علاوہ خود خاتم النبین صلی اللہ علیہ اجمعین کا ہمارے آج کل کے بہت سے گھنٹوں تقریر فرمانے والے انشا گفتار خطیبوں کی شاید دو ہی ایک تقریروں کے مساوی ثابت ہو۔ ورنہ حدیثوں کے

سارے مجلدات تمام تر انفرادی خطاب خاص یا مجلسی ملفوظات ہی کی نوعیت رکھتے ہیں۔ یعنی ایمان و عمل صالح کی دعوت و تعلیم بھی زیادہ تر انفرادی خطاب کے رنگ میں ہوتی تھی، اور معروف و منکر کے امر و نہی کی شان بھی یہی تھی۔ یہ مطلب بالکل نہیں کہ تصنیف و تالیف یا طویل طویل تقریریں حرام ہیں، لیکن لادینی و سیاسی پروپگنڈا بازوں کی طرح ان کی اتنی بھرمار کہ قلم و زبان کی درازنفسی ہی گویا اصلی کام ہے، یہ یقیناً دین اور دینی و انبیائی طرز و طریق اور روح و مزاج کے خلاف ہے۔ انبیائی دعوت و اصلاح تعلیم و تبلیغ امر و نہی کا اصل طریق انفرادی و مجلسی یا خطاب خاص ہی کا رہا ہے۔ موٹی بات یہ ہے کہ جس چیز کی تعلیم و اصلاح ہم خطاب عام سے ضروری جانتے اس کے خلاف جب اپنی آنکھوں کے سامنے گھر باہر دوستوں عزیزوں ملنے جلنے والوں کو کرتے دیکھیں تو اس کے لئے آنکھیں بند کئے رہنا کیسے جائز ہو گا کہ عام جلسوں، تقریروں یا کتابوں مضمونوں کے ذریعہ تو کہتے ہی رہتے ہیں اور آئندہ بھی کہتے رہیں گے!

اصلاح "ذات البین" کی قرآنی و حدیثی اتاث

بہرحال اس وقت ذکر خاص ذات البین کی اصلاح کا چل رہا تھا یہ تو اور بھی بالکلیہ فریقین ہی کو انفرادی طور پر سمجھانے بجھانے یا کوئی حاکمانہ جاہی و مالی یا اخلاقی اثر حاصل ہو، اس سے عملاً کام لینے ہی کا معاملہ ہے خود قرآن میں دیگر عنوانات کے علاوہ خاص امر ہی کے عنوان سے جو حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس میں کسی سے لڑائی جھگڑا یا شر و فساد پیدا ہو تو تو اس کی اصلاح خود ہی کر لیا کرو (فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۹)) دوسری جگہ خصوصیت کے ساتھ

مسلمانوں کو حکم ہے کہ "مسلمان (اپنے پرائے) سب ہی بھائی بھائی ہیں لہذا جن دو بھائیوں میں کچھ جھگڑا فساد پیدا ہو جائے اس کو (جہاں تک تمہارے امکان میں ہو) دور یا اس کی اصلاح کر دیا کرو" (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (۲۶ ۹ ۱)) تو کیا اس حکم کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اصلاح ذات البین" پر انشاپردازانہ کوئی مقالہ و کتاب لکھ دیا کرو یا کوئی انشا گفتارانہ دھواں دھار تقریر کسی جلسہ و مجمع میں کر دیا کرو! یا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو فریقوں میں کوئی نزاع و فساد دیکھو تو ترغیب و ترہیب اثر و دباؤ وغیرہ کی جو صورت بھی اپنے بس میں ہو اس سے کام لے کر اصلاح کی عملی کوشش کیا کرو۔ اصلاح بین الناس ہی کے حکم کا صدقہ و معروف کے حکم کے ساتھ ذکر ہے اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (۱۴ ۱۱) یعنی صدقہ و معروف ہی کی طرح اصلاح بین الناس بھی ایک خیر و نیکی ہی کا کام ہے جس کو خود بھی کرنا چاہئے اور دوسروں سے بھی کرنے کو کہتے رہنا چاہئے۔

ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہر شخص کے ہر ہر جوڑ بند یا عضو پر ہر سورج نکلنے والے دن یعنی روزانہ صدقہ عائد ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ صدقہ صرف مال یا روپیہ پیسہ کا نہیں ہو سکتا کہ اس کی ہر شخص کو کہاں استطاعت ہوتی ہے اس لئے آگے مثالاً کئی ایسی چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو مفلس سے مفلس کے بھی اختیار میں ہیں۔ ان میں سب سے پہلے یہی ہے کہ دو شخصوں کے درمیان انصاف و صلح کرا دینا بھی صدقہ ہی ہے، کسی کو سواری پر سوار ہونے میں مدد دینا یا اس کا سامان لدوا دینا بھی

صدقہ ہے. کوئی اچھی بات کہہ یا بتلا دینا بھی صدقہ ہے اور ہر قدم پر جو نماز کے لئے (مسجد جانے میں) اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور راستہ سے کسی تکلیف کی چیز (کانٹے وغیرہ) کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے. ظاہر ہے کہ صبح اٹھنے سے لے کر رات کو سونے تک جو یہ صدقہ و خیرات ہم پر عائد فرمایا گیا ہے جس طرح اس سے مراد نہ صرف مالی صدقہ ہے، اسی طرح صرف زبانی و قلمی دعوت و تبلیغ بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اچھی بات کہہ دینے (الکلمۃ الطیبہ) کی صرف ایک فرد خطاب عام والی تقریر و تحریر بھی ہو سکتی ہے ورنہ اصل مدعا ہر فرد کو وقت و موقع اور اپنی استطاعت کے اعتبار سے دوسروں کی کوئی نہ کوئی عملی خدمت و اعانت کرتے رہنا ہے۔

خصوصاً اصلاح بین الناس کی اہمیت تو شارع علیہ السلام کی نظر میں یہاں تک ہے کہ لوگوں میں ملاپ کرانے کے لئے اگر کوئی بھلائی کی بات خلاف کہہ دینے یا "دروغ مصلحت آمیز" سے کام لینا پڑے تو وہ بھی جائز ہے بلکہ ایسا شخص سرے سے دروغ گو ہی نہیں —— لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فینمی خیرا او یقول خیرا[1] —— ایک اور بخاری و مسلم ہی کی متفق علیہ طویل روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ جھگڑا ہے تو آپ خاص کر کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر ان میں صلح کرانے تشریف لے گئے جس کی وجہ سے نماز میں کچھ تاخیر ہو گئی۔[2]

---

[1] و [2] ریاض الصالحین باب اصلاح بین الناس۔

آج کل اس اصلاحی کوشش میں دقت | خود جا کر یہ فرض و سنت ادا کرنے کو تو جانے دیجیے۔ راقم عاجز کو اچھے اچھے مشائخ و علما کا تجربہ یہ ہے کہ درخواست کرنے پر بھی گریز فرماتے ہیں، جس کی وجہ کبھی برسرِ ناحق فریقین کی ناراضی سے بچنا ہوتا ہے اور زیادہ تر یہ کہ ایسا فریق ثالث بالخیر کے منصفانہ یا شرعی فیصلہ کو قبول کرنے ہی پر تیار نہیں ہوتا۔ انتہا یہ کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے وقت کے مشہور و مسلم شیخ اور سب سے بڑے دینی دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث نے خود راقم احقر کو اسی طرح کے ایک سلسلہ میں تحریر فرمایا کہ

"مجھکو تو حکمیت کا نہایت تلخ تجربہ متعدد مرتبہ ہوا ہے۔ فریقین فیصلے سے پہلے تو بہت اعتقاد ظاہر کرتے ہیں مگر جب فیصلہ کر دیا جاتا ہے تو جس فریق کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا تو مخالف ہو جاتا ہے اور تسلیم کرنے سے منکر ہو جاتا ہے جس سے تمام محنت بے کار ہو جاتی ہے بالآخر میں نے حکم بننے سے انکار کر دیا۔ جب اس پر بھی زیادہ اصرار ہوا تو میں نے رجسٹری کی شرط لگائی۔ مگر افسوس کہ رجسٹری شدہ حکم نامہ کے بعد بھی فیصلہ پر ایک فریق فیصلہ کے بعد راضی نہ ہوا اور مقدمہ بازی کی لعنت پیش آئی۔"[1]

---

[1] مقدمہ بازی کی لعنت کو پوچھیے ہی نہیں۔ خود راقم ہذا کو اپنی شامتِ اعمال اور فتنۂ احوال کی بدولت اس کے کئی کئی تجربات ایسے ہوئے اور ہو رہے ہیں کہ آپ بیتی نہ ہوتی تو یقین آنا دشوار ہوتا۔ مدعی ہونے کی ہمت تو کہاں سے لاتا اس کے مقابلہ میں ہزاروں کے نقصانات اٹھاتا ہوں جاتا رہا۔
ایک طوالت ہی کو لیجیے کہ کسٹوڈین کی طرف سے ایک دعویٰ محض ایک مہربان کی عنایت سے دائر ہو گیا، اس کا سلسلہ ۱۲، ۱۳ سال سے چل رہا ہے اب دو سال سے ہائی کورٹ میں ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

اناللہ وانا الیہ راجعون! سوچنے کی بات ہے کہ ایسے بزرگ کے مقابلہ میں اس کی عقیدت کے مدعیوں کو ایسی ڈھٹائی کی جرأت کیسے ہوئی۔ یہ نہیں کہ اس ڈھٹائی والے لچّے شہدے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے نماز روزہ بلکہ تہجد و تسبیح والے بھی یہی کرتے ہیں، بات وہی حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ والی یاد آتی ہے کہ دینداروں نے بھی دین خالی نماز روزہ یا اور ترقی کی تو بس عرفی عبادات کے اوراد و نوافل ہی کو سمجھ رکھا ہے۔ باقی اخلاق و معاملات یا حقوق عباد کو دین کی فہرست سے خارج دنیا کے معاملات جان کر اپنے کو آزاد قرار دے لیا ہے۔ اس کے تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ جس کو بھی کچھ معاملاتی سابقہ لوگوں سے پڑتا ہے بلا استثنا سب سے شہادت اسی کی ملتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ "دین کامل" کے متعلق محض پوجا پاٹ کا دین ہونے کی خوش فہمی پیدا کیسے ہوئی؟

موجودہ صورتِ حال کی ذمہ داری علماء و مشائخ کی مداہنت پر ہے!

جواب ایک ہی ہے۔ دین کامل یا پورے دین کے پورے احکام اوامر و نواہی کے جو عالم اور انبیائی امانت و وراثت کے جو حامل و وارث تھے پہلے خود ہی دنیا طلب ہو کر اپنے دنیوی معاملات میں دینی

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) پھر عدالتی قانون کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ کمزور سے کمزور بلکہ بے بنیاد دعوی کر کے آپ سالہا سال طوالت تو دے ہی سکتے ہیں، اور اگر جعل فریب جھوٹی گواہیوں وکلا کے محنتانوں اور رشوتوں کا حق ادا کرتے رہیں تو کامیاب ہو جانا بھی بے بنیاد سے بے بنیاد دعوی میں بالکل بعید نہیں ورنہ غریب مظلوم کے جان و مال وقت و قوت سب کا دیوالہ نکلوا دینا تو بالکل یقینی ہے۔

سنے سنائے نہیں ہیں تو ذاتی تجربات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ قانون اور اس کی عدالتیں سراسر ظلم کے اڈے ہیں بلکہ اس کی تعلیم گاہیں ہیں۔ تفصیل اس کی سبق آموزی کے لئے کچھ اپنے "اسباق زندگی" میں کی ہے۔

ہدایات سے تہاون و غفلت برتنے لگے۔ لازماً ان کے عام مواعظ اور خاص اصلاحی تعلیمات میں بھی یہ حصہ کم و حذف ہوتا رہا۔ بالآخر گھر باہر، اپنوں پرایوں کو خطاب خاص سے روک ٹوک کا دروازہ بند ہو کر رہا۔ وہی بنی اسرائیل والی صورت کہ پہلے ان کے علما منکرات کی روک ٹوک کرتے، پھر بھی وہ نہ مانتے تو بے تکلف میل جول، کھانے پینے، دوستی عزیزداری وغیرہ کے تعلقات جاری رکھتے۔ علماء بنی اسرائیل کی طرح کیا آج ہمارے علما و مشائخ اسلام کی مداہنت کا دانستہ یا نادانستہ ایک بڑا سبب یہ نہیں ہوتا کہ روک ٹوک سے دعوت و عقیدت میں خلل پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ سب کچھ سہی واقعہ بہر حال اپنی جگہ پر ہے کہ کتاب و سنت کی کھلی کھلی نصوص و تصریحات پر مبنی معروف و منکر کے امر و نہی کا جیتا جاگتا پورا نظام ہدایت و اصلاح مردہ و معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کے بعد اول تو عوام کے لئے روزمرہ کے ضروریاتِ دین یا اوامر و نواہی کے جاننے ہی کی کیا صورت رہی۔ کچھ تھوڑے بہت جانتے بھی ہوں تو جب گھر باہر پورے معاشرہ میں ان کے فعل و ترک پر کسی طرح سماجی عزت و ذلت، نیک نامی و بدنامی کا سوال نہ رہ گیا ہو تو پھر ان سے بے اعتنائی کے آخر کار ڈھٹائی تک پہنچ جانے کا سوال کوئی بڑا سادہ لوح فطرتِ بشری سے جاہل ہی اٹھا سکتا ہے۔

موجودہ مصلح علما و صلحاء کی فروگذاشت

پرانے مولوی مشائخ تو بچارے اب پرانے ہو چکے۔ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو"۔ لیکن ہمارے نئے (ماڈرن) علما و صلحا ہی نہیں، ماشاء اللہ پوری امت کی صلاح و اصلاح کی پوری للہیت و اخلاص

اور دل و جان کے ساتھ ہمت نے کر اٹھنے والے بھی خدا ہی جانتا ہے کہ اس سادہ لوحی میں کیسے مبتلا ہیں کہ سارا زور باڈرن پروپگنڈہ ہی کے رنگ والی دھواں دھار تقریروں اور دفتر کے دفتر تحریروں ہی پر اس طرح صرف فرما رہے ہیں کہ نہ خطاب عام و خاص سے ایمان و عمل صالح کے مہمات کی دعوت و ترغیب نہ ان کے مفاسد کی اصلاح کا اہتمام۔ کلمہ توحید کی لفظی اصلاح و تصحیح کی ضرورت و اہمیت میں بھی کلام ہرگز نہیں۔

توحید الٰہ پر زور دینے کی ضرورت

لیکن جب تک توحیدِ الٰہ کی معنوی حقیقت پر جس کی تفصیل اوپر ابتدا ہی میں عرض ہو چکی، مستقل و مسلسل زور پر زور نہ دیا جاتا رہے یہ شجر بے ثمر ہی رہے گا۔ اس کلمہ کا جوہری مطالبہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و اقرار ہے کہ اس کے سوا زمین و آسمان کی کسی مخلوق کے آگے نہ بندگی و عبادت کا سر جھکایا جائے گا نہ حاجت روائی و استعانت کا ہاتھ اٹھایا جائے گا۔ بس لے دے کر ایک اور صرف ایک ہی کے آگے جھکنا اور صرف اسی سے مانگنا ہے۔ جب تک عبادت و استعانت یا الٰہیت والوہیت کا یہ انحصاری رشتہ بالکلیہ نہ سہی کم از کم کسی معتد درجہ تک "الا اللہ" کا عہد و پیمان کر کے صرف اللہ ہی کے ساتھ وابستہ نہ ہو جائے اس وقت تک ہر نفع و ضرر، عطا و منع کے معاملہ میں ظاہری اسباب و تدابیر ہی پر آدمی جائز و ناجائز حلال و حرام کی تمیز کے بغیر بالکلیہ اعتماد و بھروسہ کرنے یا ان ہی کو تمام تر الٰہ بنا لینے کے سوا آخر اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

ساتھ ہی "یقینِ آخرت" کی تخلیق ضروری ہے

اس لا الہ الا اللہ یا توحیدِ الٰہ پر اعتماد و ایمان سے بھی کچھ بڑھ کر ہی آخرت پر یقین و اذعان لازم ہے۔ انسان اپنی بالکل انسانی و فطری وعاقبت اندیشی یا مستقبل ہی کے کسی بڑے نفع و ضرر کی امید و بیم کی بنا ہی پر نقد یا حاضر کے چھوٹے نفع و ضرر سے قطع نظر کر سکتا ہے ورنہ پھر تو نقد کو ادھار پر چھوڑنا "کارِ خردمنداں" ہرگز نہیں، سراسر حماقت ہی کا سودا ہوگا۔

لیکن کیا اور کس سے عرض کیا جائے۔

کہ ہمارے نئے پرانے علما و مصلحین سب ہی نے ایمانیات کے ان ہی سب سے بڑے مطالبوں سے قطع نظر فرما لیا ہے۔ علوم و فنون ادب و شاعری، تعلیم و تہذیب، سیاست و معیشت تمدن و ثقافت سب ہی پر اسلام و اسلامیت کے ٹھپّے لگا لگا کر زبان و قلم دونوں سے سیلاب و طوفان اٹھا رکھا ہے لیکن توحیدِ الٰہ اور آخرت پر ایمان و ایقان جو پورے اسلام و اسلامیت کی جان ہے اس کی تعلیم و تبلیغ پر زور کے خوردبینی ذرات بھی اس سیلاب و طوفان میں ڈھونڈھنے ہی سے ہاتھ آتے ہیں! اگر اِلٰہ واحد اور یومِ دین ہی کی دعوت و تلقین کو زبان و قلم دست و بازو سب کی دینی خدمات میں ان کی واجبی اولیت و اہمیت کا حق نہیں دیا جاتا تو پھر دین کے نام سے بھی علم و ادب، سیاست و معیشت، انسانیت و ثقافت کا ڈھنڈورا پیٹنا دراصل دنیا ہی کا بوزنہ وار پروپیگنڈہ ہے۔

غیبی ایمان میں شہادتی یقین عمل صالح ہی سے پیدا ہوتا ہے

لیکن ایمان بہرحال نام غیب ہی پر ایمان کا ہے۔ اس غیب میں شہادتی یقین کی طاقت عمل صالح کی شہادت ہی سے

پیدا ہوتی ہے جس قدر ایمانی تقاضوں یا توحید و آخرت کے ایمانی مطالبوں پر اصول و فروع جزئیات و کلیات سب میں اوامر و نواہی پر عمل زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور اوامر و نواہی پر عمل یا ان کے فعل و ترک کا اہتمام معاشرہ میں ان پر طا فتور امر و نہی ترغیب و ترہیب تعظیم و تمیز ہی پر موقوف ہوتا ہے۔ خصوصاً جن اوامر و نواہی یا احکام کا تعلق غیبی و ایمانی نفع و ضرر سے ہو کیونکہ شہادتی یا دنیاوی نفع و ضرر تو اکثر آنکھوں کے سامنے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کا نقد انقدی سودا ہوتا ہے۔ اس میں ہم چشموں یا معاشرہ کی نظر میں پسند و ناپسند، عزت و ذلت یا اس کی طرف سے روک ٹوک کی حاجت زیادہ نہیں ہوتی۔ بخلاف آخرت کے نفع و ضرر یا خدا کی رضا و ناراضی کے اوامر و نواہی کے کہ ان میں تو معاشرہ کی طرف سے امر و نہی روک ٹوک یا پسند و ناپسند عزت و ذلت کا ردعمل اتنا سخت و نمایاں ہونا چاہیئے کہ افراد علانیہ یا ڈھٹائی کے ساتھ اس سے قطع نظر نہ کر سکیں۔ چوری چھپے کوئی کچھ کر لے تو وہ اور بات ہے۔ اس کا اثر متعدی نہ ہوگا۔ بس یہی معروف و منکر یا امر و نہی کی اصل حقیقت و حکمت اور کتاب و سنت پر مبنی اس کے نظام کی ایمانی و عملی اہمیت ہے۔

ازلی و ابدی مستقل غیبیات و ایمانیات والے دینی نفع و ضرر کے معاملات کا ذکر ہی کیا، خود اس دنیا کے ایسے معاملات جو ذرا اٹل اوٹ ہوں آدمی ان کے ساتھ پہاڑ اوٹ ہی کا معاملہ کرتا ہے۔ نہ دنیوی پولیس و عدالت یا قانون و حکومت کا ڈر کام دیتا ہے، نہ گرفت و افشا کا احتمال و اندیشہ۔ دنیا کی سیدھی راہ پر بھی دین یا خدا و آخرت یا پھر

سماج و معاشرہ کا خوف و خیال ہی چلا سکتا ہے۔ عقل میں کسی طرح نہیں آتا کہ آج کل کے نام نہاد عقلا کی عقل اتنی گٹھل کیسے ہوگئی کہ اتنی موٹی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر خدا و آخرت سے ہماری بے عقلی کو بیزاری ہے تو کسی اور طرح معاشرہ ہی میں بھلائی برائی عزت و ذلت، رغبت و نفرت کا احساس اتنا جاندار و بیدار کردو کہ افراد رائے عامہ کے دباؤ کو آسانی سے ٹھکرا نہ سکیں۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ عقل ان کی اتنی کیا ماری گئی ہوگی، البتہ دین بیزاری یا بے معنی نامذہبیت کے دعوئے افتخار ہی نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے ورنہ ان جدید عقلائے روزگار میں سے کسی کسی کی کبھی کبھی ذرا آنکھ کھل جاتی ہے تو روشنی کے اقرار پر مضطر ہو جاتا ہے![1]

---

[1] پرسوں ہی کے اخبار میں اسی اقراری شہادت کی تازہ تازہ مثال خود ہمارے بھارت دیس اور صوبہ (یوپی) کے کسی غیر ذمہ دار مہاشا کی نہیں وزیر پال صاحب کی زبانی سُن لیں۔

اخبار کی تین کالمی جلی سرخی یہ ہے کہ "رشوت خوری کا استیصال سماج کے موجودہ ڈھانچے میں آسان نہیں"۔ پولیس عدالت اور خود انسداد رشوت ستانی کے مستقل افسروں وغیرہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کیوں آسان نہیں؟ اور بے بسی کی نوبت یہاں تک ہے کہ

"جب میں خود اپنے قریب کے ساتھیوں کو جن کے ساتھ بچپن سے میں نے کام کیا ہے اور جن کی قربانیاں بھی ہیں اور خود اپنے خاندان والوں نیز اپنے شناساؤں کو دیکھتا ہوں اور اب ۵۳ سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں تو میں ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ رشوت خوری ختم ہوگئی"

اب ذرا کان لگا کر سکولرزم کی اس بے بسی کا اصل سبب آگے سُنیں:

جو چیز بددیانتی اور رشوت خوری کو روکتی ہے وہ خوفِ خدا ہے، یا دوسری دنیا کا خیال لیکن آج سوسائٹی کا جو رنگ ہے اس میں خدا یا دوسری دنیا کا کوئی مقام نہیں رہا ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اسلامی و قرآنی اصطلاح میں معروف نام ہی ہے خصوصیت کے ساتھ خدا کی خوشنودی اور آخرت کی بہبودی والی جانی پہچانی پسندیدہ نیکی یا عمل صالح کا اور منکر خدا کی ناراضی اور آخرت کی بربادی کے ایسے ناپسندیدہ و فاسد عمل کا جس کو معاشرہ میں اس درجہ مردود و اجنبی بنا دیا گیا ہو، کہ لوگوں میں عموماً اس کے جاننے پہچاننے ہی سے انکار

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) روزانہ اسکولوں کالجوں میں ہم خدا کے انکار کی باتیں پڑھتے ہیں اور یہ سنتے ہیں کہ انسان بس ایک مٹی کا پتلا ہے۔"

شاید سکولرزم کی لاج رکھنے کے لئے آگے ایک دوسری تدبیر ارشاد ہے کہ

"دوسری چیز برائی سے روکنے والی اگر کوئی ہے تو ایمانداری، ایمانداری کی خاطر اور برائی سے بچنا برائی کی خاطر، سو ایسی تربیت ہمارے بچوں کو کہاں دی جاتی ہے ایک لیکھ پال سے لیکر وزیر تک اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ کیا ایسی تربیت اس کے گھرانے میں دی جاتی ہے، ہرگز نہیں۔"

گڑ کھانے اور گلگلوں سے پرہیز کرنے والی عامیانہ ہندی مثل یاد آتی ہے، بے خدا و آخرت کے ایمانداری ایمانداری کی خاطر یا نیکی برائے نیکی کی بودی منطق کا عملی جواب اس "بدی برائے بدی" سے کیوں نہ دیا جائے جو آج "آرٹ برائے آرٹ" کی عریانیوں، ترقی پسند ادب و شاعری کی فحاشیوں، کلچر یا ثقافت کی سخافتوں، آزمائشی بیاہوں، بن بیاہی ماؤں، قانونی یا رضامندانہ زناکاریوں اور گلی کوچوں میں پھینکے ہوئے، مرے ادھ مرے، زنائی بچوں وغیرہ طرح طرح کی ترقیوں کی صورت میں ہر ترقی یافتہ و ترقی خواہ ملک میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہی ترقی پر ہے۔

اس کے علاوہ "نیکی برائے نیکی" کی شاعری یا فلسفہ "برائے شعر گفتن" یا آرام کرسی کی حد تک تو خوب بہت خوب ہے لیکن حقائق و واقعات عملی دنیا میں اتنے شاعر و فلسفی کتنے بن جا سکتے ہیں جو مثلاً رشوت ہی کے ٹھوس مادی منافع کو محض "شعریت" و تفلسف کے پیچھے گنواتے رہیں۔ ہاں ہمارے وزیر با تدبیر نے ایک تیسری تدبیر جو تجویز فرمائی وہ بلاشبہ سب سے زیادہ عملی اور کارگر تدبیر ہو سکتی ہے۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

کیا جاتا ہو۔ یہ صورت نہ خالی انجمن بازیوں، جماعت سازیوں سے پیدا ہو سکتی ہے نہ بڑے بڑے جلسوں، کانفرنسوں کی صرف پنڈال کے اندر گونجنے والی خطیبانہ تقریروں سے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) "اور وہ ہے سوسائٹی کا ڈر کہ اگر ہم نے برائی کی تو سوسائٹی میں بدنام ہو جائیں گے لیکن جب سوسائٹی کا حال یہ ہے کہ جب بے ایمان کی بھی عزت کی جاتی ہو تو پھر کسی کو بے ایمانی کرنے میں سوسائٹی کا ڈر کیا ہو سکتا ہے"

بات بالکل پتہ کی ہے کہ آدمی عادۃً بے تکلف اور آسانی سے ایسی ہی چیز کو ترک و اختیار کر سکتا جس کی سوسائٹی میں روک اور چلن ہو یا جس پر نیک نامی و بدنامی، پسند و ناپسند، عزت و ذلت کا سماج کی طرف سے علانیہ نمایاں طور پر اظہار ہوتا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر پتہ کا وزیر صاحب ہی کا اقرارِ بے بسی ہے کہ

"جب حال یہ ہے تو حکومت کے بس میں کس طرح ہے کہ وہ سوسائٹی کا مزاج بدل دے جب خدا دل میں نہیں، پڑوس میں دیوار حائل ہے اور پولیس تھانہ سات کوس، تو یہ چاہو کہ سات کوس پر پولیس رشوت سے روکے کیسے ممکن ہے"۔ [1]

ماشاء اللہ سکولر حکومت کی نمک خواری کا حق وزیر صاحب نے ادا کیا ہو، نہ کیا ہو لیکن حق کی تلخ گوئی اور صاف گوئی کا حق بال بال ادا فرمادیا کہ سوسائٹی کے اس مزاج کو بدلنا سکولر حکومت کے بس کا روگ نہیں۔ اس کا علاج صرف خدائی حکومت ہی ہو سکتی ہے کہ کوسوں منزلوں باہر کی پولیس و عدالت کے ڈر کی جگہ دلوں کے اندر خدا و آخرت کا خوف و خیال پیدا و پائدار کیا جائے کہ اس خوف و خیال کی استواری نہ صرف سب سے زیادہ آدمی کو بجائے خود رکنے میں مؤثر ہو سکتی ہے بلکہ ہر شخص حسب تعلق اور اپنی بساط بھر دوسروں کو بھی روکے گا۔ باپ یا گھر کا سردار گھر والوں کو، بھائی بھائی کو، دوست دوست کو، پڑوسی پڑوسی کو، بلکہ راہ چلتا اجنبی اجنبی تک کو اس طرح روکے اور بچائے گا جس طرح کنویں تالاب میں گرنے والے کو بچانے پر مضطر ہو جاتا ہے۔ سماجی عزت و نیک نامی ان سے بچنے بچانے والوں ہی کا حصہ و حق ہوگی اور جس معاشرہ میں رشوت خوار موٹر نشین کی رسوائی اور ایماندار خاک نشین کی پیشوائی ہوتی ہو اس میں ناممکن ہے کہ بے ایمانی و بد دیانتی کھل پھول سکے۔

[1] قومی آواز ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء

نہ محض انشا پردازانہ رسالوں، کتابوں وغیرہ کے دفتروں انباروں سے۔ اس کی ایک ہی تدبیر معروف ومنکر کے امر ونہی کا کتاب وسنت پر مبنی وہی ہمہ گیر مفصلہ بالا نظام و انتظام ہے کہ اپنے پرائے جس کو جب جہاں کسی چھوٹے بڑے منکر میں مبتلا دیکھا جائے، اس کو بروقت وبرمحل ہی بطرزِ مناسب روک ٹوک تفہیم وتنبیہ کی جائے نیز منکرات پر اصرار کرنے والوں کو شادی وغمی، دوستی وقرابت، ملنے جلنے وغیرہ تمام سماجی تعلقات و مواقع میں محسوس کرایا جائے کہ سوسائٹی ایسے افراد کو ناپسندیدگی یا چشم پوشی کیا معنیٰ علانیہ ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ایک طرف فواحش ومنکرات میں مبتلا موٹر وشوفر بنگلہ وگملہ والوں کو معلوم ہو کہ بھائی بندوں یا سماج میں ان کو کوئی اچھی لڑکی ملنا دشوار ہوگا، دوسری طرف دال روٹی سے خوش پیدل چلنے والے دیندار ودیانت دار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لوگ اپنی لڑکیاں دیتے ہوں اور وہ لڑکیاں ایمانداری کی دال روٹی کو بے ایمانی کے پلاؤ زردہ سے زیادہ قبول کرنے والی ہوں۔ منکرات کے ردو انکار کا یہ معاملہ جس معاشرہ وملت میں بھی تمام معاشرتی تعلقات وتقریبات میں ظاہر ہوتا ہو اس میں پولیس وعدالت سے نڈر بدمعاشوں کو کیا خدا وآخرت سے بداعتقادوں کو بھی کھلے بندوں اپنی بدمعاشیوں اور بداعتقادیوں کے مظاہروں کی ہمت نہیں پڑسکتی۔

ذکر اصل میں معروف ومنکر ہی کے ذیل میں ایک بہت بڑے انفرادی سے بڑھ کر اجتماعی معروف ومنکر یعنی ذات البین کے فساد اور اس کی اصلاح کا آگیا تھا۔ اس فساد کی بڑی جڑ دراصل ہمارے بہت سے دینی واخلاقی معاصی ومنکرات ہی ہیں۔ معروف ومنکر کے

امر و نہی کی بدولت جو معاشرہ نفس و نفسانیت ضد و عدالت وغیرہ کے معاصی و منکرات سے جتنا پاک ہوگا، اولاً تو باہمی لڑائی جھگڑے اتنے ہی کم ہوں گے دوسرے جو ہوں گے بھی ایسے دیندار و دیانت دار معاشرہ کے فریقین میں شریعت و انسانیت کی راہ سے آسانی سے صلح و اصلاح ہو جائے گی۔ اور "مقدمہ بازی کی لعنت" تک نوبت کم ہی آئے گی۔ بس شرط وہی ہے کہ ایک طرف تو نفس و نفسانیت حرص و ہوس کی راہ سے ناجائز و ناحق باتوں پر لڑائی جھگڑا کرنے والوں کی دوستوں عزیزوں وغیرہ کسی کی طرف سے کسی طرح اعانت و ہمت افزائی قطعاً نہ ہو۔ دوسری طرف جو لوگ اپنی نزاعوں کا فیصلہ ہر طرح سمجھانے بجھانے کے باوجود شریعت و معقولیت کی راہ سے کرنے کرانے پر راضی نہ ہوں، ان کے خلاف سماجی ناپسندیدگی و بیزاری کا اظہار ہی نہیں مظاہرہ بلکہ بضرورت مقاطعہ ہونا چاہئے۔ بلکہ جن لوگوں میں کچھ دینی ہمت و حمیت زیادہ ہو، جن کو فریقین پر کوئی جاہی و مالی یا اخلاقی اثر اور دباؤ حاصل ہے، ان کو تو اس سے کام لے کر ظلم و زیادتی والے فریق کو دبانے میں پورا پورا کام لینا چاہئے، یا جیسا خود حدیث ہی میں آتا ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہئے، یعنی قدرت ہو تو ظلم و زیادتی سے باز رہنے پر مجبور کر دینا چاہئے۔ اوپر کہیں پوری حدیث گذر چکی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ حضورؐ نے قسم کھا کر فرمایا کہ تم معروف کا امر اور منکر سے نہی ضرور بالضرور کرتے رہنا اور ظلم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے باز رکھ کر ضرور بالضرور اس کو حق و انصاف کی طرف پھیرنے یا اس پر مجبور کرتے رہو، ورنہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تم سب کے دلوں کو ظلم و زیادتی کے منکرات کے

معاملہ میں بے حس اور پھر اس طرح لعنت زدہ فرما دے گا، جس طرح بنی اسرائیل کو فرما دیا۔"
خدا کی پناہ کیا آج ہم اس ملعونیت کے درجے کو نہیں پہنچ گئے ہیں۔

بخلاف اس کے جس ملت و معاشرہ میں پوری سماجی و اخلاقی طاقت سے منکرات و مظالم کا ہاتھ پکڑ لیا جاتا ہو اور اپنا پرایا کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ ہو، اس میں کوئی ظلم و زیادتی اس نوبت تک جا ہی مشکل سے سکتی ہے کہ کسی ظالم کو عدالت تک جانے کی جرأت یا مظلوم کو ضرورت رہے۔ اگر کوئی بدبخت ایسی ہمت کرے بھی تو ایسے معاشرہ میں گواہی شاہدی وغیرہ سے اس کی ہمت بڑھانے والے کا ملنا دشوار ہوگا۔ سوسائٹی کی پسند و ناپسند عزت و ذلت کی طاقت حکومت کی پولیس و عدالت سے کہیں زیادہ زبردست ہوتی ہے۔ مسلمان معروف و منکر کے اسلامی نظام کو برپا کر کے اپنے اندر اس کی معاشرتی یا سماجی طاقت پیدا کر لیں تو نہ صرف یہ طاقت ہی بہت کچھ اسلامی حکومت کا کام دے گی بلکہ یہی طاقت صحیح اسلامی حکومت کے قیام و اقامت کی صحیح راہ ہوگی۔
ایسے منظم و مضبوط معاشرہ پر اس کی مرضی کے خلاف اپنی پرائی حکومت زیادہ دنوں چل ہی نہیں سکتی۔ باقی گاڑی کو گھوڑے سے آگے جوتنے اور اسلامی حکومت کے بغیر بھی مسلمان معاشرہ جتنا اسلامی بن سکتا ہے بنانے سے پہلے اسلامی حکومت کے دعوے و دعوت کی گاڑی چلانے کی کوشش صرف فتنہ و فساد یا ناکامیوں اور خودکشیوں ہی کی دعوت ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی۔ اتنے چھوٹے منہ سے اتنی بڑی بات نکالنا ہوگی تو سخت جسارت و ملامت کی بات۔ تاہم عرض کئے بغیر رہا نہیں جاتا کہ کربلا سے لے کر

بالاکوٹ و شاملی، بلکہ تازہ تازہ مصر کی اخوانی تحریک تک کے انجاموں کے دیگر اسباب کے ساتھ خود دینی فہم و نظر کے اعتبار سے یہ بہت بڑا سبب نظر انداز کیسے کر دیا جائے کہ ملک و معاشرہ بہ حیثیت مجموعی یا اس کی اکثریت اپنی انفرادی و اجتماعی استطاعت کے اندر بھی اسلامیت والے ایمان و عمل صالح کی طاقت ضعیف کیا عملاً ضائع کر چکی تھی۔ ان دعوتوں اور تحریکوں کی اٹھانے والی بعض عظیم شخصیتوں کی مجاہدانہ عظمت سے حاشا و کلا انکار نہیں، نہ مجتہدانہ خطاؤں سے کوئی غیر نبی معصوم ہے۔ سوال صرف اس پورے ملک و معاشرہ کی (نہ صرف جماعت دعوت کی) بہ حیثیت مجموعی ایمان و عمل صالح والی صلاحیت و صلاح کا ہے کیونکہ زمین پر خدائی حکومت چلا سکنے کی صلاحیت و اہلیت والوں ہی سے استخلاف فی الارض یا حاکمانہ اقتدار کا وعدہ ہے۔

گذری ہوئی تاریخ تو تاریخ ہی ہو چکی خواہ بعید کی ہو یا قریب کی، اس میں زیادہ کاوش و نزاع بھی ایمان و عمل صالح کا صحیح مزاج و مذاق نہیں۔ یہ ہر طرح نالائق و ناکارہ، عاجز و درماندہ، اپنے گئے گذرے ٹوٹے پھوٹے ایمان کی بنا پر الحمدللہ ثم الحمدللہ اس کا بے شائبہ شک و ریب ایمان رکھتا ہے کہ اسلامی حکومت یا خلافت کے حصول و قیام کی بھی اسلامی راہ بالذات و براہِ راست اس حکومت کی طلب و دعوت ہرگز نہیں بلکہ پہلے ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی معتدبہ درجہ کے اسلامی زندگی برپا کرنا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ ہی کے نزدیک اور اس کی حکمت و مصلحت ہوگی تو بلا ہمارے مطالبہ حکومت کے وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ خدا سے وعدہ خلافی کا احتمال بھی ایمان

نہیں کفر کی شان ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ"۔

بلکہ سچ پوچھئے تو یہ کچھ اسی قسم کی بے ادبی و بے تمیزی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام سے وعدہ کرتا ہے کہ تم میری فرمانبرداری و رضاجوئی کا حق ادا کرو گے تو میں تم کو فلاں عہدہ یا جاگیر سے نوازوں گا تاکہ اس کے حقوق و فرائض بھی تم میری راہ و رضا کے موافق ادا کر سکو۔ غلامانہ جاں نثاری کا فرض یہ ہوگا کہ وہ ہر خیال و خواہش کو ذہن و دماغ سے نکال کر تن من دھن سے اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں اس طرح لگ جائے کہ نہ دن کو دن جانے، نہ رات کو رات۔ نہ کہ اس کے بجائے براہِ راست موعود عہدہ و جاگیر ہی کی سعی و طلب، فکر اور دھن میں لگ جائے۔ ایسے موعود د مشروط انعام و اکرام کی واحد و صحیح فکر و تدبیر اس کے سوا کچھ نہیں کہ بے چون و چرا وفاداری کے ساتھ کسی چھوٹے سے چھوٹے حکم یا امر و نہی میں اس بادشاہ کی خوشی و خوشنودی حاصل کرنے میں اپنی والی کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ چہ جائیکہ ایسا بادشاہوں کا بادشاہ جس کے علم نامحدود، کوئی چھپی سے چھپی چیز اس سے چھپی نہیں، جو اس کا اندیشہ ہو کہ شاید وہ میری جانبازانہ اطاعت کوشیوں پر پوری طرح مطلع نہ ہو یا میرے دشمن و بدخواہ کچھ لگائی بجھائی میں کامیاب ہو جائیں۔ علم ہی کی طرح اس کی قدرت بھی نامحدود لہٰذا اس کا بھی وہم نہیں کیا جا سکتا کہ عین وعدہ پورا کرنے کے وقت کوئی ہاتھ پکڑ لے یا اور کسی وجہ سے وہ عاجز و مجبور ہو جائے یا خود اس سے بادشاہی چھن جائے یا مر ہی جائے، اس لئے کسی نہ کسی صورت سے جلد از جلد یاددہانی کر کے وعدہ پورا کر لینا چاہیے۔

جب اس طرح کے کسی احتمال کی گنجائش نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سراپا رحم و رحمت، کرم و شفقت ہے۔ خصوصاً اپنے فرمانبرداروں اور اطاعت شعاروں کے حق میں، نیز ہماری اہلیت و صلاحیت، ہمارے دینی و دنیوی نفع و ضرر اور ہر طرح کی مصلحت کو بھی وہ ہم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا ہے۔ اس کا وعدہ اٹل ہے۔ کسی بھول چوک کا دور دور امکان نہیں، تو پھر نہ گھبراہٹ کی ضرورت، نہ جلدبازی کی۔ ضرورت صرف ایک ہی بات کے ہمہ تن اہتمام کی ہے کہ جب وہ ہم پر ہمارے اختیار و وسعت سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں ڈالتا تو بس ضعف و معذوری، محکومی و مجبوری کے جس ناموافق سے ناموافق حال میں بھی ہم ہوں اپنی وسعت و استطاعت بھر بندگی و طاعت میں کوتاہی و غفلت سے کام نہ لیں۔ بس اتنا ہی ایمان و عمل صالح کی زندگی کا آسان سیدھا سادھا مطالبہ ہے جس کے پورا کرنے پر اس کے اٹل وعدہ کی حکمت و مشیت بھی لازماً پوری ہو کر رہے گی۔

پھر قلم بظاہر موضوع سے بہک گیا۔ مگر بظاہر ہی۔ ورنہ مطلب وہی ہے کہ ایمان و اسلام کا اصل مطالبہ براہِ راست حکومت طلبی کا نہیں بلکہ محکومی کی بدتر سے بدتر حالت میں اپنے اختیار بھر ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرنا اور دوسروں پر جن پر جتنا اختیار ہاتھ زبان یا دل سے ہو اس کے موافق ان کو بھی امر و نہی کے ذریعہ اس زندگی پر چلانے میں کسی ڈھیل یا کمی و کوتاہی سے کام نہ لینا۔ کام کی ہمت و عزیمت رکھنے والوں سے اس ناکارہ کا سارا اصرار لے دے کر یہی ہے کہ وہ نام کی اسلامی یا غیر اسلامی جس بُری

بھلی حکومت میں بھی ہوں، اختیاری اعمال صالحہ یا اوامر و نواہی کے معاملہ میں انفرادی واجتماعی غفلتوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی جدوجہد ہی ہر حال میں دین کی مقدم جدوجہد جانیں۔ اور اوامر و نواہی کے لئے جدوجہد امر و نہی کے کسی ہمہ گیر نظام و انتظام کے سوا سوچی ہی کیا جا سکتی ہے اور اس سوچنے کو ہمارے ناقص علم و فہم کے حوالہ کرنے کے بجائے جس نے اپنی رضا و ناراضی کے اوامر و نواہی کی کامل کتابِ ہدایت عطا فرمائی ہے اسی نے اسی کتابِ ہدایت میں ساتھ ہی ساتھ ایسا کامل و ہمہ گیر نظامِ ہدایت بھی عطا فرما دیا ہے جس کے ذریعہ ہر کس و ناکس پڑھے اَن پڑھے کو ایک طرف امر و نہی کے ضروری ضروری احکام معلوم ہوتے رہ سکتے ہیں اور دوسری طرف ان پر عملی ترغیب و ترہیب ہوتی رہ سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس طرح صاحبِ کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کتاب کے تمام احکامِ ہدایت کی قولی و عملی تشریح فرما دی ہے، اس طرح معروف و منکر کے امر و نہی کے پورے نظامِ ہدایت کا قولی و عملی اسوہ چھوڑا ہے۔

باقی اس محرومی کا علاج ہی کیا کہ سب کچھ گھر میں ہوتے ہم غیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور ان کے دروازوں پر دریوزہ گری کرتے پھریں بلکہ ان کی بوزنہ صفت نقالی ہی کو اپنا سرمایۂ فخر و ترقی جاننے لگیں! حالانکہ ان غریبوں کا خود حال یہ ہے کہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے کبھی کچھ آنکھ کُھل جاتی ہے تو "بتوں کی دعا، خدا کی یاد" پر مضطر کر دیتی ہے۔ ابھی اوپر ایک وزیر با تدبیر کی تازہ تازہ فرماویں آپ وہی دو باتیں

تو سُن چکے جس کی تفصیل و تفہیم راقم آثم کی اس ساری دراز نفسی کا خلاصہ ہے یعنی ایک طرف معاشرہ میں خدا و آخرت کا خوف و خیال پیدا کرنا، دوسری طرف جاہ و مال دولت و ثروت کے بجائے معاشرہ میں عزت و ذلت، برتری و کمتری، نیک نامی و بدنامی کا بنیاد نیکوکاری و بدکاری کو بنانا۔ جس سوسائٹی میں بھی بدی اور بدوں کو اپنی ذلت و حقارت قدم قدم پر اپنوں، پرایوں سب میں محسوس کرنا پڑے، اس میں موٹر، شوفر، نوکر چاکر، کوٹھی بنگلہ سب کچھ رکھ کر بھی بدوں اور بدکاروں کو جینا اجیرن ہی ہو کر رہے گا۔ بنانے والے کی حکمت نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ ہمجنسوں اور ہم چشموں کی عزت بھری نگاہ کا مال و متاع سب سے کہیں زیادہ بھوکا ہے۔ بلکہ مال و متاع کی فراوانی بھی سچ پوچھئے تو زیادہ تر اس بھوک ہی کے لئے چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کی بدولت نام و نمود یا عزت و برتری حاصل کرے تو پھر وہ رشوت و خیانت وغیرہ ناجائز طریقوں سے ایسا روپیہ کیوں چاہنے لگا، جس کی بدولت موٹر و بنگلہ خریدنے سے کہیں زیادہ گھر باہر رسوائی و بدنامی خریدنا پڑے۔

ایک فساد ذات البین یا آپس کے لڑائی جھگڑوں ہی کو لے دیکھئے کہ ان میں سے کتنوں کی بنیاد کسی ایک یا دونوں فریقوں کی کچھ نہ کچھ ظلم و زیادتی، شر پسندی اور خود غرضی ہی ہوتی ہے۔ اگر ان چیزوں سے کسی سماج میں پوری طرح سماجی نفرت و بیزاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہو اور ان کے مرتکب کو شادی و غمی وغیرہ کے تمام معاشرتی تعلقات و تقریبات میں اپنی کمتری و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہو تو فرمایئے اتنے ڈھیٹ یا بے حیا

کتنے ہوں گے، جوان کا چوری چھپے نہیں، کھلے بندوں دن دوپہر کچہری دفتر ہر جگہ مسلسل ارتکاب کرتے رہیں۔ کوئی بجائے خود اتنی ڈھٹائی اور بے شرمی پر آمادہ بھی ہو جائے تو ایسے شر و فساد سے بیزار معاشرہ میں اس کا ساتھ اور شہ دینے والے اور وکلا کے دفتروں سے لیکر کچہری کے کٹہروں تک جھوٹ اور فریب کا طومار باندھنے والے کتنے ملیں گے جو اس شر و فساد اور ظلم و زیادتی کی رسی دراز ہونے دیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ معروف و منکر کے اسلامی احکام اور ان کے امر و نہی کے اسلامی نظام کا، بلکہ معروف و منکر کی نفس اصطلاح و تعبیر ہی کا منشا و مدعا تمام تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ معروف کو جاننے پہچاننے یا پسند کرنے کے سوا منکرات کو ان پر انکار و نکیر کے ذریعہ عملاً اتنا مکروہ و مبغوض بنا دیا جائے کہ معاشرہ میں ان کا جاننے پہچاننے یا پسند کرنے کیا معنی نام لینے والا ہی ملنا دشوار ہو جائے۔ یہی حقیقت حُب لِلّٰہ اور بُغض فی اللہ کے حکم کی بھی ہے کہ لوگوں یا اُن کے اعمال و افعال سے ہماری محبت و نفرت دوستی و دشمنی کا ہر تعلق صرف دو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و نا رضا پسند و ناپسند، فرمانبرداری و نافرمانی کی بنا پر ہو۔ اور میں کیا کہتا ہوں یہی تو انبیائی تعلیم و اسوہ ہے جو نبی کیا نبیوں کے باپ ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے کر کے دکھایا کہ باپ تک سے بغض و عداوت کا اعلان کر دیا۔ حتیٰ کہ بجز ان کے حق میں دعائے استغفار کے، وہ بھی بر بنائے وعدہ اور کوئی تعلق نہ رکھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس ابراہیمی عمل کو ہم مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ "اسوۂ حسنہ" ٹھہرایا گیا کہ:-

"تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کے عمل کا یہ بہت اچھا عملی نمونہ ہے کہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو بھی تم خدا کے سوا اپنا معبود مانتے ہو سب سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں کہ جب تک تم خدائے واحد پر ایمان (اور اسی کی بندگی و فرمانبرداری کے لوازم کو) قبول نہ کرو ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کھلے کھلے بغض و عداوت ہی کا معاملہ رہے گا البتہ ابراہیم کی زبان سے باپ کے حق میں اتنی بات نکل گئی تھی کہ تمہارے لئے استغفار کی دعا کروں گا پھر بھی محض زبانی دعا سے زیادہ کوئی اختیار قطعاً خدا کے آگے نہیں رکھتا (کہ مثلاً دعا قبول ہی کرالوں یا عذاب سے تم کو بچالوں)"۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ۔

(۶۰/۴)

جب اعلانی و اعتقادی کفر موجب بیزاری اور باعث عداوت و بغض قرار دیا گیا ہے تو کیا علانیہ عملی کفر یا کافرانہ زندگی کو کھلی چھوٹ اور آزادی دیدی جا سکتی ہے بلکہ ایک اعتبار سے تو زبان سے اقرار و ایمان اور عملی انکار و طغیان زیادہ سخت و اشد ہے کہ اس سے، خود ہماری طرف سے علانیہ ایمان کے استخفاف و تحقیر کے علاوہ

غیروں اور کھلے کافروں کی نظر میں اور بھی اسلام کی عزت و وقار کو بٹہ لگتا ہے اور اس کی طرف کسی رغبت کے بجائے اُلٹے نفرت ہوتی ہے۔ اپنی تباہی و بربادی کے ساتھ دوسروں کی ہلاکت و خسران کی یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے، اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں خود ہم مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی ہو رہی ہے۔

غرض دینی و دنیوی صلاحی و اصلاحی، دعوتی و تبلیغی جس پہلو سے بھی دیکھئے اہم و اقدم کام معروف و منکر کے امر و نہی	اہم کام معروف و منکر کے امر و نہی کے شعور کی بیداری ہے

نہی کے انفرادی و اجتماعی شعور و احساس کو زندہ و برپا کر کے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو از سرِ نو اسلامی زندگی اور مسلمان معاشرہ یا خیر امت بنانا ہے۔ اس کے بغیر خالی زبان کی درازی یا کاغذ کی ناؤ سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کسی کے بھی دین و دنیا کا بیڑا کسی طرح بھی پار نہیں لگ سکتا۔ زیادہ مقدم و موثر امر و نہی کا انفرادی شعور و احساس ہے یعنی وہی المؤمنون والمؤمنات بعضہم اولیاء بعض: ہر مرد و عورت اپنی نفسِ ایمانی ولایت و ہمدردی یا نگرانی و ذمہ داری کا یہ فرض محسوس کرنے لگے کہ راہ چلتے بھی کسی کو کسی دینی و اخلاقی خامی و کوتاہی میں مبتلا پائے اس سے روکنے اور بچانے میں "ہاتھ زبان یا دل" سے جو اور جتنی سعی و تدبیر کر سکتا یا اپنے محل و مقام کے لحاظ سے جس قسم کا کوئی مادی و اخلاقی اثر یا دباؤ ڈال سکتا ہو، اس سے کام لینے میں کوئی کمی نہ کرے۔

یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اندھے کی لاٹھی چلانے لگے۔ الحمد للہ کہ علمائے امت

حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے دین کے دوسرے اوامر ونواہی کی طرح خود امر ونہی کے احکام کلیات وجزئیات اصول وفروع، کتاب وسنت ہی کی روشنی میں مرتب فرما دیئے ہیں ان ہی کو ہر برے بھلے ماحول کے چوکھٹے میں بے تکلف فٹ کیا اور وقت وموقع مناسب کام لیا جا سکتا ہے۔ بس کلی اصول اس باب میں وقت کے حکیم ومجدد حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمۃ کا سامنے رکھنا چاہیئے کہ جسمی بیماریوں کی طرح دینی واخلاقی بیماریاں بھی بیماریاں ہی ہیں اور جس طرح ہم کو جسم کے بیماروں کے ساتھ تو ہمدردی وشفقت لیکن بیماریوں سے تکلیف ونفرت ہوتی ہے اور حسب تعلق وطاقت ہم ان کو دور کرنے کی دوا دوش میں کوئی کسر لگی نہیں رکھتے۔ نہ بیمار کو اس کے حال پر چھوڑ دینا گوارا کرتے ہیں۔ بعینہ یہی معاملہ معاصی ومنکرات کے بیماروں کے ساتھ نقلاً ہی نہیں عقلاً بھی کرنا چاہیئے کہ جیسا اور جتنا ان سے تعلق ہو اور جتنی اُن کے فلاح وبہبود کی ہم فکر وتدبیر کی طاقت رکھتے ہوں، اس میں کمی نہ ہو بلکہ جس طرح معمولی انسانیت کا تقاضا ہے کہ راستہ چلتے ہم کسی غیر سے غیر کو بھی کسی تکلیف ومرض میں پائیں تو جو کچھ برمحل اس کی مدد کر سکتے ہوں کریں۔ یہی تو مطالب ومطالبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معروف ومنکر کے امر ونہی کو راستہ تک کے حقوق میں داخل فرما دینے کا ہے۔ کتنی بڑی رحمت وشفقت ہے۔

اور اس شفقت وخیر خواہی کے تقاضے ہی سے حسب ضرورت بیمار کو کڑوی سے کڑوی دوائیں بھی پلانا پڑتی ہیں، بدپرہیزیوں سے زبردستی روکنا پڑتا ہے۔ گھر میں علاج و

پرہیز، دیکھ بھال کا حق خود اپنے سے نہ ادا ہو سکتا ہو تو اسپتال بھیجنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ ہو تو سخت سے سخت اپریشن کرانا پڑتے ہیں۔ اپنی وسعت بھر بلکہ قرض و دام کر کے دوا و علاج کے مصارف پورے کئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت تک ہوتا رہتا ہی جب تک مریض کے جانبر ہونے کی کچھ کبھی آس رہتی ہے۔ بلکہ معالجوں کے جواب دینے کے بعد بھی ہماری محبت و شفقت جواب نہیں دیتی اور جب تک بیمار کی سانس چلتی ہے کچھ نہ کچھ دوا دعا برابر چلتی رہتی ہے۔ یہ سب کس زندگی یا اس کی آرام و راحت کو بچانے کے لئے، جس کی نسبت یقین کامل ہے کہ سو دو برس بھی چلتی رہے تب بھی ایک نہ ایک دن چل ہی بسے گی تو پھر ایمان والوں کو ایمان ہی سے سوچنا اور بتلانا چاہیئے کہ کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کے بناؤ بگاڑ یا سود و زیان، فلاح و خسران کی خاطر ہم کو خود اپنے اور اپنے اہل و عیال اعزہ و احباب کے لئے کیا کچھ نہ کرنا چاہئے اور جان و مال کی کونسی فکر و تدبیر اٹھا رکھنی چاہیئے۔

ہماری پہلی حیلہ بازی | بعضے بڑے بڑے علم و صلاح والوں اور اچھے اچھے دیندار دوستوں عزیزوں کو دیکھا کہ اولاد کو دینی تعلیم کی طرف شروع شروع میں جوش و خروش کے ساتھ لے چلے۔ ابتدا حفظ قرآن سے کرائی لیکن آدھا سونہ ھا یاد کرا کے ہی ہمت ہار دی کہ کیا کریں، نہیں چلتا چلاتا۔ اور پھر نہ جانے کس ذہنیت کے تحت بیدینی و بددینی کی علمی و عملی راہوں پر اتنا آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا کہ عمل کیا ایمان تک کی خبر نہ رہی۔ ابھی چند دن پہلے ایک خاندانی مشہور بڑے صاحب علم و قلم بزرگ و

محترم دوست کے بھائی کا کچھ اس سلسلہ میں ایک تعزیت نامہ ملاحظہ ہو:

"میرا خاندان چند پشت اوپر سے علما و فضلا و صوفیا کا تھا۔ علاقہ پر اس خاندان کے زہد و تقویٰ کا بڑا اثر تھا بڑی عزت تھی کہ میرے اور بھائی صاحب کے بعد آنے والی نسلوں نے اس خاندانی وراثت و وقار کو یک قلم لات ماردی اور سب کے سب لارڈ کرزن ہیں، فرنگی صورت، فرنگی معاشرت۔ ہم لوگ خاموش دیکھ رہے اور دم بخود ہیں بلکہ علاقہ بھر دم بخود ہے۔ مگر ہم نے فکر نہیں لی آزاد چھوڑ دیا۔ اس پالیسی سے کم از کم کوئی دماغی کوفت تو نہیں ہے" میاں روپیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں"۔

بس ہر وقت میرا اور بھائی صاحب کا یہی رونا گانا ہے، یہ ایک عالمگیر وبا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔"

برادر گرامی قدر سلمہ سے سوال صرف اتنا ہے کہ کیا اس طرح ہم اپنی اولاد کو کسی خطرناک و مہلک بیماری میں مبتلا یا اس کو ہاتھ میں زہر کا پیالہ لئے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے آزاد چھوڑنا پسند کریں گے اور کیا ادنیٰ ایمانی ہمت و حمیت کے بھی یہ شایانِ شان ہے کہ "اپنی دماغی کوفت" کو بچانے کے لئے اولاد کو اگر اسلام کا سپاہی نہیں بنا سکتے تو اسلام دشمن کیمپ میں جاتے رہنے کا دم بخود تماشہ دیکھنے کی پالیسی اختیار کر لیں۔ پھر یہ پالیسی بہتوں کی انفعالی حدود ہی تک نہ رہتی، بلکہ اس دین دشمن راہ کے ساتھ عملاً اس درجہ تعاون اور ہمت افزائی کا معاملہ ہوتا ہے کہ محض دنیا کے لالچ میں ان " فرنگی

صورت، فرنگی سیرت وفرنگی معاشرت والے "لارڈکرزنوں ہی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی دامادی کا شرف بخشا جاتا ہو۔ بلکہ اس "لارڈکرزنی" میں مزید ترقی کرنے کرانے کے لئے ان بے غیرتوں بے شرموں کی طرف سے صرف جہیز میں موٹر و بنگلہ تک کی فرمائشیں نہیں ہوتیں، بہتیرے خود "لارڈکرزن" کے گھر جاکر پورا پکا "ولایت مآب" بننے بنوانے تک کی شرط لگاتے ہیں۔ تعجب ان بے حمیت وغیرت فروش دنیا پرستوں پر نہیں کہ ان کا تو "کالج کے چکر" سے لے کر "صاحب کے دفتر" تک پوری زندگی کا کاروبار ہی دنیا ہی رہ جاتی ہے۔ تعجب پر تعجب ایسے دینداروں، نماز روزہ بلکہ تسبیح و تہجد والوں کی عجیب وغریب ذہنیت پر ہے کہ ان کی نظر میں بھی دینی واخروی زندگی اور اس کا بناؤ بگاڑ اتنا کم وزن ہو چکا ہے کہ اس پر بھی دینی تعلیم و تربیت والوں کے بجائے فرنگی تعلیم و ترقی والوں ہی کو ڈھونڈھتے اور مقدور بھر ان کے بے حیائی و زرطلبی کے یہ مطالبات پورے کرتے ہیں۔

دوسری عذرتراشی | دوسرا عذر وہی "عالمگیر وبا" والا ہے کہ "اس کو کوئی روک نہیں سکتا" لیکن کیا طاعون ہیضہ وغیرہ کی جان لیوا وباؤں میں بھی یہی کہہ کر ہم تسلی حاصل کر لیتے ہیں؟ اور کیا ان سے بچنے بچانے کی مقدور بھر کوئی کوشش اٹھا رکھتے ہیں؟ پھر کیا ایمان لیوا وباؤں سے بچنا بچانا ہزار ہا درجہ زیادہ جان توڑ کوششوں کا متقاضی نہیں؟ جواب اپنے ہی گریبانوں میں سر ڈال کر دینا چاہئے کہ یہی نہیں کہ جان لیوا وباؤں سے مقابلہ میں ان ایمان لیوا وباؤں سے بچنے بچانے کی پاسنگ بھر بھی کوشش کرنے والے

ہم میں سے کتنے ہوتے ہیں، اور اس کے بجائے اُلٹے دین دشمن وایمان سوز آگ میں جان بوجھ کر جان ومال سب پر کھیل کر محض چند روزہ زندگی کے جاہی ومالی عہدہ ونوکری کی حرص وہوس میں اپنی چہیتی سے چہیتی اکلوتی اولاد تک کو خوشی خوشی جھونک دینے والے کتنے ہوتے ہیں! مراد خصوصیت سے بطور مثال اسکول وکالج ہیں۔ اس روز روشن حقیقت سے کوئی اندھا ہی ہوگا کہ خدا بیزاری کے ان وبائی مرکزوں سے کوئی ازلی خوش قسمت وسعادتمند ہی "عمل صالح" تو الگ رہا "ایمان صحیح" بھی اپنا سلامت لے کر باہر آتا ہوگا! خود اس تعلیم جدید کے ایک بڑے مستثنیٰ فرزند سعید[1] کی شہادت حرف

---

[1] ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" میں بلاشبہ تاریخ اسلام کے اس سب سے بڑے فتنہ کی تفصیل اور اس کی طرف توجہ دلانے کا حق ادا کر دیا ہے (جزاہ عن الاسلام وامتہ) لیکن موصوف کا یہ خیال کہ اس فتنہ کو جدید علم وفلسفہ کے مقابلہ میں کھینچ تان کر صرف قرآن کا کوئی فلسفہ بنا کر روکا جا سکتا ہے، ان کی ماشاء اللہ ایسی فلسفہ ساز ذہانت وصلاحیت کا جوش ہی جوش ہے! ان سے بڑھ کر حیرت ہی حیرت ہمارے مولانا علی میاں سلمہ کے اس جوش پر ہے کہ اس "نئے طوفان" کا زور تحریر وتقریر کے کلامیاتی طوفان یا تحقیقاتی ونشریاتی مجالس سے توڑا جا سکتا ہے۔ اس طوفان کے اٹھانے میں اہل باطل ہم سے ہزاروں درجہ آگے ہیں اور رہیں گے۔ ہم ان سے کبھی بازی لے جا سکیں گے۔ بے شک اس کا غذی یا الفاظی مقابلہ کا فرض بھی فرض کفایہ کے درجہ میں امت پر عائد ہے لیکن بجائے خود یہ کافی ہرگز نہیں۔ بقول حضرت دریابادی "صاحب صدق" "اگر الفاظ کے زور سے سب کو قائل کر دینا ممکن ہوتا تو امام رازیؒ کے بعد دنیا میں کوئی ملحد یا دہریہ باقی ہی کیوں رہ جاتا"۔

(۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء)

اس فتنہ کا تدبیری توڑ صرف گیلانی اقامت خانوں کی تجویز ہے مگر وہ ٹھوس عمل اور ہمت ماری کا کام ہے اس لئے اس کی داد تو خود ہمارے علی میاں سلمہ کے علاوہ بھی ہندوستان سے لیکر پاکستان تک سب ہی نے دی لیکن عمل کیلئے کوئی قدم آگے نہ بڑھا۔ سب سے بڑھ کر خود اس ناکارہ ہی نے اسکی تفصیل کچھ مکتوبات گیلانی کے مقدمہ میں لکھی ہے۔

حرف ناقابلِ انکار ہے کہ "اس نوعیت کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں بھی کبھی رونما نہیں ہوا۔

تیسرا بہانہ | ایک تیسرا بہانہ یہ ہے کہ دینی مدرسوں اور دارالعلوموں میں پڑھنے والوں یا عالم بن کر نکلنے والوں میں بھی سچے پکے دیندار جب شاذ و نادر ہی اب نظر آتے ہیں تو دین کے ساتھ دنیا بھی کیوں کھوئی جائے؟ بہت بڑی حد تک یہ بالکل سچ ہے جس کی کچھ تفصیل و توجیہ اوپر کہیں گذر چکی۔ بااین ہمہ ان کی اکثریت نہ صرف ٹوٹے پھوٹے نماز روزہ کی پابند ہوتی ہے بلکہ ایسے ازلی بدبخت و شقی ان میں شاذ و نادر ہی ملیں گے جن کا ایمان ہی متزلزل یا سرے سے رخصت ہو چکا ہو گا۔ اور دولتِ ایمان کی قدر و قیمت پہچاننے والے جانتے ہیں کہ ایمان ضعیف سے ضعیف اور بے عمل سے بے عمل بھی ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ قیمتی ہے۔

چوتھی شکایت | ان شیطانی وساوس کو شہ دینے والے حیلوں میں ایک یہ بھی ہے کہ بہتوں کو دیکھا کہ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت میں اپنی جان لڑا دی مگر نتیجہ الٹا رہا۔ جواب ایسے سارے حیلوں بہانوں کا ایک ہی سوال ہے کہ کیا کسی وبا یا وبائی آب و ہوا سے بچنے بچانے کی فکر و اہتمام کو غیر ضروری و لایعنی ٹھہرانے کے لئے کوئی عقلمند بھی اس عذر کو عاقلانہ قرار دے گا کہ فلاں فلاں ہر طرح کی فکر و تدبیر، دوا علاج کے باوجود اس وبا کا شکار ہی ہو کر رہا؟ اس طرح کی تمام دینی بے پرواہیوں اور کوتاہیوں کا بڑا بنیادی سبب یوم دین یا آخرت کی زندگی کا عملاً مدنظر نہ رہنا ہے۔ خفی و اجمالی ایمانِ آخرت (جس کو اوپر کہیں سلبی بھی کہا گیا ہے)

ایمان آخرت گذری حالت میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو نصیب ہے لیکن دنیا کے معاملات میں آخرت کا سود وزیاں نفع ونقصان مدنظر اچھے اچھے دینداروں میں کم ہی نظر آتا ہے۔

ان حیلہ جوئیوں کی وجہ!

غرض اگر جسم وجان کی دنیوی بیماریوں کی طرح روح وایمان کی دینی بیماریاں بھی بیماریاں ہی ہیں اور دنیوی بیماریوں سے صرف دنیا کی فانی زندگی کو خطرہ ہے اور دینی بیماریاں دین وآخرت کی غیر فانی وابدی زندگی کی ہلاکت و تباہی کا سامان ہیں، تو یوم دین وآخرت پر ایمان رکھنے والوں کو خود ہی سوچنا چاہیئے کہ دنیوی سود وزیاں کے بالمقابل دینی فلاح وخسران کا معاملہ کتنی زیادہ جان توڑ کوشش کا مقتضی ہے۔ لیکن عام صورت حال کیا بالکل برعکس نہیں کہ دنیا کے لئے پیسہ پیسہ پر جان دی جاتی ہے اور دین پیسہ پیسہ پر فروخت کیا جاتا ہے!

بس گھر باہر اپنوں پرایوں سب کے حق میں ہر چھوٹے بڑے معروف ومنکر کے امر ونہی کی نوعیت وحیثیت بالکل وہی ہے جو کسی چھوٹی بڑی بیماری میں مبتلا بیمار کی دوا پرہیز کے معاملہ میں حسب تعلق زیادہ سے زیادہ سعی وتدبیر کی۔ البتہ درجات میں دونوں کے اتنا زمین وآسمان کا فرق وتفاوت ہے کہ اگر ایک طرف خالص دنیوی سود و زیاں کے لحاظ سے ہفت اقلیم کی دولت وحکومت یا زندگی بھر کے فقر وفاقہ کا سوال ہو اور دوسری طرف ایک دن کیا، ایک گھڑی کے اخروی ثواب وعقاب کا، تو سرے سے آخرت کے منکر و کافر یا اس کے علم وشعور سے انتہائی جاہل وغافل مومن کے

سوا کون دانشمند آخرت کے چھوٹے سے چھوٹے نفع و ضرر کو دنیا کے بڑے سے بڑے نفع و ضرر کے مقابلہ میں نظر انداز کرنا گوارا کرے گا۔ یا آخرت کی چھوٹی سی چھوٹی اور دم بھر کی بیماری کو دنیا کی زندگی بھر کی صحت و تندرستی کے معاوضہ میں قبول کرے گا! ایسے سرپرستوں یا والدین سے بڑھ کر اولاد کا دشمن کون ہوگا جو جہنم نہیں، دنیا ہی کی کسی آگ کی طرف اٹھنے والے اس کے ہر چھوٹے بڑے تیز و سست قدم کو اگر سمجھا بجھا کر روکنے پر قادر نہیں تو زبردستی روکنے کو عین محبت و شفقت، ہمدردی و خیر خواہی نہ جانے گا۔ گو بالآخر ناقہم و نادان اولاد کی خود کشانہ ضد و والدین کے معالجانہ و خیر خواہانہ جبر پر غالب ہی آ کر رہے۔

یہ جبر و زبردستی تو بدرجۂ مجبوری اور بالکل آخری چارۂ کار ہوگا۔ ورنہ جس ملک و معاشرہ میں صرف زبان و دل سے معروف و منکر کے امر و نہی کا حق ادا کیا جاتا ہو، یعنی ایک طرف ہر چھوٹے بڑے معروف کی اس کے درجہ کے مطابق زبانی تعلیم و ترغیب ہوتی ہو اور معروف کے اختیار کرنے سے معاشرہ میں سرخروئی و سربلندی حاصل ہوتی ہو اسی طرح دوسری طرف ہر چھوٹے بڑے منکر پر اس کی حیثیت کے مناسب روک ٹوک ہوتی ہو اور اس کے مرتکب کی رسوائی و بدنامی تو ایسی سوسائٹی میں منکرات کا علانیہ ارتکاب کسی بڑے پیمانے پر جڑ ہی کیسے پکڑ سکتا ہے۔

اعمال کا کیا ذکر جبکہ توحید کے لالے پڑے ہیں

لیکن بار بار کہے بغیر رہا نہیں جاتا عقائد و اعمال کے دوسرے اصول و فروع کلیات و جزئیات کا نام ہی کیا لیا جائے، توحید جو سارے ایمان و اسلام کی جان و بنیاد اور اس کا سب سے بڑا امتیاز ہے اور جس کے دشمن انکار و الحاد سے بڑھ کر

شرک وشرکیات کے عقائد و رسوم ہیں۔ ان شرکیات میں غیر اللہ کی نذر و نیاز سے لے کر سجدہ ، رکوع اور طواف تک کا کون سا عبادت و استعانت کا مشرکانہ عقیدہ و عمل ہوگا جس میں ہمارے لاکھوں کروڑوں بھائی جاہل و عوام ہی نہیں، خاصے پڑھے لکھے خواص تک گرفتار نہیں۔ اور جن کا اعتقاد و عمل درگاہوں تعزیوں وغیرہ کے ساتھ بعینہ وہی نہیں جو پکے سے پکے مشرکوں کا اپنے دیبی دیوتاؤں کے ساتھ، دلیل بھی کم و بیش بعینہ وہی کہ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ اور نُقَرِّبُنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ یعنی ہم اُن کو خدا نہیں کہتے مانتے، البتہ خدا کے پاس یہ ہماری سفارش اور اس کے تقرب کا وسیلہ ہیں۔

میں تو اپنے نادان مسلمان بھائیوں کے جب ان مشرکانہ تصورات و افعال کو دیکھتا ہوں، تو ان کو غیر مسلم مشرکوں سے ممتاز کرنے والی کوئی دل لگتی دلیل و تاویل ڈھونڈھے نہیں پاتا! جہلا و عوام کو جانے دیں، کتنے علما و مشائخ ہیں جو کھلے کھلے شرکیات کے نفسِ شرک ہونے تک پر متفق نہیں۔ بلکہ غضب پر غضب ہے کہ خود قرآن و حدیث سے اس مشرکانہ ضلالت کی تائید و تاویل گھڑ گھڑ کر یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا کی شہادتیں فراہم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ شرک و شرکیات کی نجاست و گندگی کے ساتھ نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت جمع ہو سکتی ہے اور نہ اس کی تائید و فضل کے بغیر مسلمانوں کی دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی صلاح و اصلاح کی کوئی سعی و تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔ دین و ایمان کا راس المال تو توحید ہی ہے۔ جب وہی سلامت نہیں تو دوسروں کے لئے جو بظاہر سود و فلاح ہے مسلمان کے حق میں وہ بھی سراسر زیان و

خسران ہی ثابت ہو کر رہے گا۔

جو حضرات علماء و صلحا انفرادی یا جماعتی طور پر صحیح عقائد کے حامل اور اپنی ذات کی حد تک شرک و بدعیات سے مجتنب ہیں وہ بھی اپنی تقریروں تحریروں مجلسوں اور ملاقاتوں میں ان پر نہی و نکیر اب شاذ و نادر ہی فرماتے ہیں۔ اور سیاسی لیڈروں کی طرح زیادہ تر آئے دن کے فروعی مسائل و جزئیات ہی میں اُلجھے رہتے ہیں۔ امت کی ایمانی و عملی گوناگوں خامیوں، کوتاہیوں اور غفلتوں پر توجہ کرانے یا انفرادی و اجتماعی طور پر خطاب خاص و عام کے ذریعہ عقائد و اعمال کی اصلاح کی کسی منظم و مستقل سعی و تدبیر کے بجائے بس جدید رنگ کے جلسوں، کانفرنسوں یا میلا دی جشنوں میں کچھ جدید ہی رنگ کی تقریروں، یا رسائل و اخبارات وغیرہ میں اسی رنگ کی تحریروں پر قناعت فرماتے ہیں جو بالکل ایسا ہوتا ہے جیسے کسی مریض کو دوا دینے کی جگہ اس کو صحت و مرض پر لکچر دیئے جائیں۔

خلاصہ یہ کہ ایمان و عمل صالح کے اصول و فروع، جزئیات و کلیات کسی کے معاملہ میں نہ اب ہمارے عوام میں معروف و منکر کے امر و نہی کی المومنون بعضھم اولیاء بعض والی ایمانی ولایت یا دوستی و نگرانی کا کوئی پتہ و نشان ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بلا کسی تعلق یا معمولی جان پہچان تک کے محض مسلمان ہونے کے رشتہ سے راستہ گلی تک میں جس چھوٹے بڑے منکر یا برائی میں مبتلا پائے روک ٹوک اور بچانے کی کوشش کرے۔ نہ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا کے سے تہدیدی حکم کے ہوتے والدین سرپرستوں

یا کسی اور حیثیت سے راعی ونگراں کی ذمہ داری رکھنے والوں کو اپنے زیر نگرانی اہل وعیال افراد و جماعات کے معروف ومنکر کے باب میں خود اپنے مواخذہ ومسئولیت کی کوئی خاص فکر پرواہ۔ اور نہ "منکم امۃ" والی سب سے بڑھ کر ذمہ دار جماعت حضرات علما کو خیر کی طرف بلانے معروف کا حکم کرنے اور منکر سے باز رکھنے کے اپنے فرض منصبی کا احساس واہتمام الاماشاء اللہ۔

ایک ایسا ملک ومعاشرہ فرض کرو، جس میں نہ حکومت کی طرف سے حفظانِ صحت یا بیماری کی روک تھام کا کوئی انتظام، نہ ماں باپ یا سرپرست اپنے بال بچوں اور زیر سرپرستوں کی چھوٹی بڑی بیماریوں میں دوا پرہیز کی خبر لیتے ہیں، نہ عام لوگوں میں اتنی ہمدردی وغمگساری کہ اپنے پرائے کسی کو بیمار دیکھ کر اس پر ترس کھاتے اور مدد کرتے ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر اور طبیب جو زندگی بھر بیماری وتندرستی ہی کے علم وفن کی تعلیم ومہارت حاصل کرتے رہے وہ بھی اپنا یہ فن وپیشہ چھوڑ کر دوسرے مشاغل میں لگے ہیں۔ ایسے ملک ومعاشرہ کا حال اس کے سوا کیا ہوگا کہ گھر گھر اور گلی گلی چھوٹی بڑی ہر طرح کی بیماریاں پھیل گئی ہوں۔ ہماری دینی وایمانی، اخلاقی وروحانی بیماریوں کے معاملہ میں یہی فرضی مثال آج ساری دنیا کے مسلمانوں کا کم وبیش واقعی حال بن کر رہ گئی ہے۔ نتیجہ وہی ہے کہ افراد اور جماعتیں، ادارے اور انجمنیں سب ہی قریب قریب چھوٹے بڑے ہر طرح کے منکرات کا شکار ہیں۔ جس طرح کوئی فرد خواہ وہ چھوٹی سی چھوٹی بیماریوں میں سر سے پاؤں تک مبتلا ہو، انفرادی زندگی کے

فرائض ومشاغل کو صحتمندانہ طریقہ سے انجام نہیں دے سکتا، نہ ایسے افراد سے مرکب کوئی معاشرہ صحیح معنی میں زندگی کے اجتماعی ثمرات سے متمتع ہو سکتا ہے۔ ہو بہو اسی طرح جب کہنا چاہیئے کہ پوری امت مسلمہ اسلامی احکام ـــــ چھوٹے بڑے معروفات ومنکرات اوامر ونواہی ـــــ کے لحاظ سے ظاہری وباطنی امراض کی پوٹ بن کر رہ گئی ہو تو آخر صحتمند اسلامی زندگی کے دینی ودنیوی انفرادی واجتماعی، سیاسی ومعاشی ثمرات وبرکات کیسے اور کہاں سے ظاہر ومرتب ہو سکتے ہیں! مرض لے دے کر ایک ہی ہے ـــــ مسلمانوں کی نامسلمانی ـــــ اور لازماً

علاج بھی ایک ہی

یعنی وہی مسلمانوں کو مسلمان بنانا۔ بالفاظِ دیگر زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کی عملی زندگی کو زندہ یا اس کو از سرِ نو برپا کرنا۔ اس کی تدبیر بھی ایک ہی ہے دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے عام وتام نظام کا دوبارہ زندہ کرنا۔ سوال ہے کہ کون کرے؟ اس کا جواب بھی ایک ہی ہے حضرات انبیا ونبی الانبیا علیہم السلام کا نہ تو سیاسی کوئی پروگرام تھا، نہ معاشی منصوبہ بندی۔ ان کا اصلی منصب اور سارا مشن لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا، معروف کا حکم کرنا اور منکر سے منع کرنا تھا۔ یہی اہم اقدام فریضہ اب تمام عالم میں علمائے اسلام کا ہے۔ یہ نہ صرف خاتم النبیینؐ بلکہ تمام انبیا ومرسلین کے جانشین اور تمام بندگانِ خدا کے لئے نہ صرف دعوتی کام پر مامور اور اس کے امین ہیں، بلکہ جس چیز کی دعوت دیں اس پر عمل کی حفاظت ونگرانی بھی اُن

کی ذمہ داری ہے۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم العلماء امناء الرسل علی عباد اللہ من حیث یحفظون لما یدعون الیہ[1]۔ اس امانت و حفاظت کا حق ادا کرنے کے دو ہی بنیادی طریقے ہیں:۔

(۱) ایک تو دین کے تمام شعبوں ایمانیات و عبادات ہی نہیں معاملات اور اخلاق و معاشرات ظاہر و باطن قلب و قالب سب کے احکام کا علم حاصل کرنا اور "بلغ ما انزل الیک" کی وراثت کے مطابق دوسروں تک پہنچانا۔ اس تبلیغ ما انزل میں معروف و منکر کے امر و نہی کے حکم کی تبلیغ بھی داخل ہے کہ لوگ نہ صرف خود ایمان و عمل صالح کے مختلف اوامر و نواہی کو جانیں اور ان پر چلیں، بلکہ اپنے اپنے محل و مرتبہ کے لحاظ سے دوسروں کو بھی اوامر کا امر اور نواہی سے نہی، ساتھ ہی اپنی والی ان پر چلانے کی سعی کرتے رہیں۔ خود پیغمبروں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ (جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا ہے دوسروں کو پہنچا دو) کے علاوہ دوسرا کام یہ بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کو اس "ما انزل الیک" پر چلانے کے لئے معروف کا امر اور منکر کی نہی بھی فرماتے ہیں"۔ یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر۔

(۲) دوسرے حضرات انبیا کی دعوت و تبلیغ کی بڑی خاص خصوصیت یہ ہے کہ جس خیر کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے اور جن اوامر و نواہی کا امر و نہی فرماتے، ان پر عمل کا خود کامل و بے داغ نمونہ و مثال یا اسوہ ہوتے ہیں۔ علما کو بھی اس کا اہتمام زیادہ سے زیادہ

---

[1] الفتوحات الربانیہ ص۲۲۶

لازم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں وہ ایمان صالح کی دینی و اسلامی زندگی کا خود مقدور بھر بہترین نمونہ ہوں جس طرح رسولؐ کی ذات اقدس ساری امت و انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ تھی ــــ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ــــ اس طرح آپ کے ورثا اور جانشینوں کو بھی اپنے اپنے مقام اور حلقوں گھر باہر، مدرسہ و مسجد، خانقاہ و مجلس ہی میں نہیں، ہر جگہ اور دین و دنیا کے ہر معاملہ میں نمونۂ عمل ہوں۔ نیز دوسروں کے ساتھ بلکہ ان سے مقدم خود اپنے اہل و عیال، اعزہ و اقربا کی صلاح و اصلاح کی فکر ہو کہ اس کا بھی خاص طور پر خود رسول اللہ ہی کو حکم تھا۔ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ ــــ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ۔

(۳) ایک اور بہت زیادہ اہم انبیائی دعوت و تبلیغ کا امتیاز جس کو بار بار نام بنام قرآن مجید میں دہرایا گیا ہے مخلوق سے کامل استغنا ہے یعنی حضرات انبیاءؑ اپنی اصلاحی و دینی خدمات پر دنیا والوں سے کسی قسم کے اجر و معاوضہ کے قطعاً طالب نہیں ہوتے، ان کی نظر صرف خدا پر رہتی ہے ــــ لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ دنیاوی اغراض کے لئے دنیا والوں پر نظر بھی اخلاقی و نفسیاتی ہر اعتبار سے قدرۃً للہیت کے اثر کو لوگوں کی نگاہ میں گھٹا اور گرا دیتی اور قبول حق کی راہ میں بڑا حجاب بن جاتی ہے۔ یہ وصف اب الا ماشاء اللہ ہمارے اچھے خاصے کھاتے پیتے مشاہیر علما تک میں قریب قریب ناپید و نادر ہی ہے۔ عوام و خواص کوئی بھی ان کو جاہ و مال کی حرص و ہوس میں اپنی سطح سے بہ مشکل اونچا پاتے ہیں۔ جن کی بدولت انکار و استہزا کا

خصوصاً دین دشمنوں کو بڑا حربہ ہاتھ آجاتا ہے۔

عین ان سطروں کے دوران تحریر میں ایک مشہور خوش بیان پاکستانی واعظ و عالم پر ایسا ہی شدید و استہزائی طنز و طعن پڑھنے میں آیا۔ ماشاءاللہ معمولی خوش حالی نہیں، اچھے مالدار ہیں۔ ایک سرکاری کمیشن کے رکن تھے۔ اپنے رفقاء کمیشن سے اختلاف پر طویل بیان شائع کیا ہے، جو بجائے خود خوب مدلل و معقول ہے لیکن چونکہ کمیشن کا الاؤنس قبول کرنے میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہتے تھے اس لئے یاروں کو دلائل کا وزن گھٹانے کے لئے اس طرح کے فقرے چست کرنے کا موقع ہاتھ آگیا کہ "آپ ان اجتماعات میں شریک رہے اور مقررہ الاؤنس وصول کرتے رہے . . . . . نہ صرف ان تمام اجتماعات میں شریک ہوئے اور پورا الاؤنس وصول کرتے رہے، بلکہ کئی ماہ تک منہ میں گھونگھیاں ڈالے بیٹھے رہے۔" "جبہ و دستار پھڑکانے" تک کی پھبتی کسی گئی ہے! کاش موصوف نے الاؤنس کو رد فرما دیا ہوتا تو نہ صرف مخالفوں کو اُن کے دلائل کے رد کرنے کیلئے ایسے استخفاف کی گنجائش ملتی بلکہ ان دلائل کا اخلاقی وزن کتنا بڑھ جاتا۔

مگر کیا اور کس سے عرض کیا جائے کہ یہ ایک ہی مثال نہیں۔ بالعموم اب ہمارے اچھے اچھے علما و صلحا سب ہی سرکاری و غیر سرکاری علمی و دینی کمیٹیوں، کمیشنوں، جلسوں، کانفرنسوں، میلادی جشنوں، ریڈیائی تقریروں وغیرہ کے الاؤنسوں اور فسٹ کلاس کے سفرخرچوں وغیرہ کے وصول فرمانے میں سے پکے دنیاداروں سے ایک قدم پیچھے نہیں رہتے۔ تصنیف و تالیف کی خالص دینی خدمات

تک کو کتب فروشی کا مستقل کاروبار بنا لیا گیا ہے اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ کے لئے مشکل ہی سے کوئی کچھ چھوڑنا جانتا ہو گا۔

کہاں انبیائی وراثت والے علما کی شان و صفت یہ تھی کہ خدا و آخرت کے اجر و ثواب کے سوا دنیا کے مال و متاع پر وہ غلط انداز سے نظر بھی نہ ڈالتے، کہاں آج دنیا داروں کو اپنی اور ان کی دنیا داری و دنیا طلبی میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا غرض دعوت و اصلاح کے خالص انبیائی فرائض انجام دینے والے علما کا بالخصوص سب سے مقدم فریضہ خود اپنی ایمانی و اسلامی زندگی کو دوسروں کے لئے عمل و اتباع کا ممتاز و موثر نمونہ بنانا ہے۔ پھر دور و نزدیک کے عام مسلمانوں کو وعظ و تذکیر، تحریر و تقریر کے ذریعہ عام طور پر اور خاص زیر نگرانوں عزیزوں، دوستوں، ملنے جلنے والوں کو موقع و محل کے مناسب خاص تفہیم و تنبیہ سے خیر کی طرف بلانے، معروف کا امر اور منکر کی نہی کرتے رہنا، بس یہی انبیائی جانشینی کا حق ادا فرمانے والے علماء کی تمام تر زندگی ہے اور ہونی چاہئے۔ دل خوشی سے اچھل پڑا اور ان معروضات پر بڑا اطمینان ہوا کہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معروف و منکر ہی کے مباحث میں **منکراتِ عامہ** کے عنوان کے تحت اپنے عینی فرائض کے بعد علما کا مخصوص فریضہ یہی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے کہ

> "شہر کی ہر مسجد و محلہ میں ایک فقیہ یا عالم کا ہونا واجب ہے، جو لوگوں کو اُن کے دین کی تعلیم دیتا رہے۔ اسی طرح ہر گاؤں میں بھی ایک عالم ہونا واجب ہے، اور جو عالم

بھی اپنے فرضِ عین سے فارغ اور فرضِ کفایہ کے لئے فرصت رکھتا ہو، اس پر واجب ہے کہ اپنے شہر کے آس پاس کی بستیوں میں جاجا کر لوگوں کو دین کی باتوں اور شریعت کے فرائض کی تعلیم دیتا رہے۔"

علما یا فقہا کا تو یہی خصوصی و منصبی کام اور ذمہ داری ہے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ غیر علما اس ذمہ داری سے بالکل سبکدوش ہیں۔ حضرت امام ہی کا ارشاد ہے کہ "جو شخص ایک مسئلہ بھی جانتا ہے وہ اس کا عالم ہے۔" اور اس کے ذمہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ جانتا ہے دوسروں کو بتلائے ورنہ وہ بھی گناہ میں شریک سمجھا جائے گا۔ پھر آگے علما کو خاص طور سے متنبہ فرمایا ہے کہ ان سے اگر اس میں کوتاہی ہو

"تو بہت زیادہ گناہگار ہوں گے کیونکہ وہ اس کام کی زیادہ لیاقت و قدرت رکھتے ہیں۔ باقی دوسرے کاروباری لوگ اگر اپنے اپنے کاموں کو چھوڑ کر اس میں لگ جائیں تو معاشی ابتری پھیل جائے گی۔ جو انھوں نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے وہ مخلوق کی معاشی درستی کے لئے ناگزیر ہے۔"

بخلاف عالم یا فقیہ کے کہ

"اس کی تو خاص شان اور خاص خدمت ہی یہ ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو پہنچا ہے دوسروں کو پہنچاتا رہے کہ یہی وہ کام ہے جس میں علما انبیا کے وارث ہیں۔ کسی کو اس عذر سے گھر میں بیٹھ رہنا اور مسجد میں نہ آنا جائز نہیں کہ لوگ نماز ٹھیک نہیں پڑھتے بلکہ جب اس کا علم ہو تو ان کی تعلیم کیلئے نکلنا تو اور

واجب ہے، اسی طرح اگر معلوم ہو کہ بازار میں مثلاً کسی وقت یا ہمیشہ منکر کام ہوتا ہے اور اس کے دور کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو جائز نہیں کہ گھر میں بیٹھا رہے؟

آگے علما و عوام سب ہی مسلمانوں کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا اصلاحِ دین کی بعینہ وہی ترتیب تحریر فرمائی ہے جو راقم الحروف بار بار عرض کرتا آیا ہے کہ

"سب سے پہلے ہر مسلمان پر خود اپنی اصلاح لازم ہے کہ فرائض کی پابندی کرے اور محرمات کو ترک. پھر اپنے گھر والوں کو تعلیم کرے، پھر پڑوس والوں کو، پھر محلہ والوں کو، پھر شہر والوں کو، پھر شہر کے قرب وجوار والوں کو، پھر دیہاتیوں کو۔ اسی طرح دنیا کے سرے تک۔ اگر قریب والے اصلاح وتبلیغ کی خدمت کو اس طرح انجام دیں گے تو دُور والے سبکدوش رہیں گے ورنہ قریب و دور والے جو بھی اس خدمت کی استطاعت رکھتے ہیں سب ہی گنہگار ہوں گے اور جب تک روئے زمین پر ایک انسان بھی کسی ایک دینی فرض سے جاہل رہے گا اور عالم کو قدرت ہو گی کہ خود جاکر یا دوسروں کے ذریعہ اس کو بتلائے تب تک وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہ قرار پائے گا. . . . . . . اور اس کام سے بڑھ کر یا تو فرض عین ہے یا کوئی اور ایسا فرض کفایہ جو اس سے بھی اہم واقدم ہو"[۱]

البتہ اس زمانے میں ہر مسجد و محلہ، بستی و قریہ اور اس کے ہر گھر تک اسلام کے سارے احکام کو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح پہنچانا اور معروف و منکر کے امر و نہی کے

---

[۱] احیاء العلوم جلد دوم ص۲۶۸ مطبوعہ مصر۔

ذریعہ ان پر عمل کی نگرانی اس وسعت کے ساتھ قائم کرنا کہ "کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ چھوٹنے، جو کسی ایک دینی فرض سے بھی جاہل و غافل رہے" بڑے وسیع و مستحکم نظم و نظام کو چاہتا ہے مگر ہے ہر حال میں یہ کام ہر ملک و شہر اور آبادی کے علما ہی کا کہ وہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ والے باہمی مشورہ سے کوئی ایسا وسعت پذیر نظام تجویز فرمائیں جو خواہ شروع کسی ایک ہی مسجد و محلہ سے ہو لیکن تدریج و استحکام کے ساتھ اس طرح پھیلتا جائے جس طرح کوئی صالح تخم صالح زمین میں پڑ کر بڑھتے بڑھتے پھولوں پھلوں سے لدا ہوا تناور درخت ہو جاتا ہے۔ اسی خیال کے مدنظر خود اس سراپا نالائق و ناکارہ نے تجدید تعلیم و تبلیغ نام کے ایک رسالہ میں مجدد وقت حضرت مرشد تھانوی علیہ الرحمہ کے تبلیغی و اصلاحی ارشادات کی روشنی میں کچھ معروضات خصوصاً مساجد کی نظام کے عنوان سے ـــــ پیش کر دیئے تھے شاید وہ بھی کچھ لائق اعتنا ہوں۔

ضرورت باتوں کی نہیں عمل کی ہے!

لیکن عملی چیزوں میں خالی کاغذی ناؤ سے دین و دنیا کا کون سا بیڑا پار لگا ہے۔ باطل سے باطل تحریک کو بھی اگر کوئی عمل و ہمت کا مرد لے کر کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے ملک کے ملک چل پڑتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال عقل و نقل سب کے خلاف خدا بیزار اشتراکیت کی تحریک ہے تو پھر حق تو حق ہی ہے۔ البتہ انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ سن کر بہت کم اور دیکھ کر بہت زیادہ قبول کرتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی کسی معتدبہ آبادی میں کسی معتدبہ درجہ تک بھی ایمان و عمل صالح کی ـــــ محض عبادات نہیں، معاملات اخلاق و معاشرت ظاہر

باطن ـــ سب کی پوری اسلامی زندگی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی محسوس و مرئی ہو کر اپنوں پرایوں سب کی آنکھوں کے سامنے ہو تو پھر انشاء اللہ اسلامی معاشرہ کا یہی تخم مدنی زندگی کا پرتو بن کر دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی ہر قسم کے برگ و بار پیدا کرنا شروع کر دے گا اور مکّی زندگی کے سارے مصائب و مشکلات کو دور کر کے رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غیبی تائید و نصرت ایسے معاشرہ و جماعت کے ساتھ قدم قدم پہ ہوگی اور ایسی ہوگی کہ صلح حدیبیہ کی سی ظاہری کمزوریاں، نہ صرف مکہ کی فتح بلکہ "اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ" بن جائیں گی۔ نادانی ہیں بعض بڑے ایمان والے قلموں سے بھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سیاسی دوراندیشی کا شاہکار تھا"۔ حالانکہ وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم و رضوعنہ کی رضا والی کھری اور پکّی ایمان و عمل صالح والی زندگی پر مبنی اٹل وعدہ کی فتح مبین تھی۔

سالہاسال سے اپنی کچھ ٹوٹی پھوٹی تحریروں میں یہ کس مپرس عرض کر رہا ہے کہ مسلمان جب تک ٹوٹا پھوٹا ایمان و اسلام اپنے گلے سے لگائے ہیں، ان سے خدا کا معاملہ دنیا میں بھی عقلاً و نقلاً نہ وہ ہوگا نہ ہونا چاہیے جو دوسری قوموں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ تمہیل کا معاملہ ہے، ہمارے ساتھ تنبیہ کا کہ اپنے نام کے اسلام کو کام کا بنانے کی چونک پیدا ہو۔ خدا و رسول کا دامن چھوڑ کر خالص "سیاسی تدبر و دوراندیشی کا" شاہکار" بھی ہمارے حق میں سراسر تباہ کار ثابت ہو کر رہے گا ہماری ہزار تدبیروں کی تدبیر سب سے پہلے خدا سے اپنا معاملہ درست کرنا ہے۔

اور وہ درستی ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی حضرات صحابہ والی ایسی ہمہ جہتی محسوس و مرئی زندگی کے سوا کچھ نہیں، جس کو دوست دشمن سب گھر باہر مسجد اور بازار ہر جگہ دیکھ سکیں۔ یہ لکھ ہی رہا ہوں کہ ماشاء اللہ ایک نوجوان[1] مومن صالح ــــ وہ بھی جدید تعلیم یافتہ ــــ قلم کی چند سطریں صلح حدیبیہ ہی کے ذکر میں اتفاقیہ سامنے آگئی ہیں، حرف حرف راقم عاجز کے دل و دماغ کی ترجمانی ہیں۔ اس صلح کی سب سے بڑی فتح یہی تھی کہ اس کی بدولت مکہ کے مشرکوں اور مدینہ کے مسلمانوں میں کھلی آمد و رفت اور میل جول کے مواقع پیدا ہو گئے۔

"اس طرح ان (مشرکین) کو اسلام کو جاننے اور برتنے کا موقع ملا۔ روزمرہ کی زندگی میں مسلمانوں کی اخلاقی پاکیزگی اور برتری نے ان کے دلوں پر وہ اثر کیا جو برسوں کی جدوجہد نہ کر سکی۔ مسلمان بھی آزادی سے مکہ جانے لگے، وہ اگرچہ اپنی دعوت کے متعلق زبان سے کچھ نہ کہتے مگر ان کا عمل سیکڑوں تقریروں اور وعظوں کا (کیا ان سے ہزاروں درجہ بڑھ کر) کام کرتا اور دین کے منکروں کو دین کی طرف کھینچتا۔ اس سال جتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔"

بے شک امت کے کچھ افراد اور بعض جماعتیں یدعون الی الخیر کا فریضہ تو کچھ وعظ و تقریر، تحریر و تصنیف سے ادا فرما رہی ہیں وہ بھی خیر یا ایمان و عمل صالح کی ظاہری

[1] ڈاکٹر محمد آصف قدوائی سلمہ۔ الفرقان بابت ماہ نومبر ۱۹۵۶ء ص ۳۲

وباطنی زندگی کے پورے اوامر ونواہی کا نہیں۔ ایمانیات وعقائد میں شرکیات تک سے تعرض کم ہی کیا جاتا ہے۔ عبادات میں نماز وزکوۃ تک کی تصحیح وتاکید کا کماحقہ اہتمام نہیں ہوتا۔ باقی معاملات واخلاق اور معاشرت جن سے اسلامی زندگی دن رات چشم دید حقیقت بن کر گھر باہر اپنوں پرایوں سب کے سامنے آئی اور زبانِ حال سے ہر کھلی آنکھ کو خیر کی دعوت یا بھلائی کی ترغیب دیتی، وہ تو صدیوں سے عملاً اتنی ناپید ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان میں کسی فرق وامتیاز کی کوئی نشانی نہیں رہ گئی ہے۔ وجہ صرف وہی ہے کہ یَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ کے ساتھ ہی عملاً خیر کو برپا کرنے کے لئے یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کا جو نظام خود کتاب وسنت نے عطا فرمایا ہے اس کی تعلیم وتبلیغ اب بالید یا مقدور بھر قوت وطاقت سے کیا باللسان یا زبان اور تقریر وتحریر تک سے بڑے بڑے مقررین ومصنفین میں بھی کوئی دیوانہ اللہ کا بندہ ہی اس بدمزگی کو خریدتا ہوگا۔

پھر اس کے بغیر اسلام کے اس مدنی یا مثالی معاشرہ کا مسلمانوں کی کسی چھوٹی بڑی آبادی میں پرنور ونما ہونے کا سوال وامکان ہی کیا رہ جاتا ہے جس کے عملی معلمِ کتاب وحکمت (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا سلام واجازت کسی کے آجانے کی سی بظاہر چھوٹی سی چھوٹی معاشرتی چوک کو بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔ حکم ہوتا کہ واپس جاؤ اور پھر سلام واجازت کے بعد آؤ۔ سوچنا چاہئے کہ ایسے معاشرہ میں مہمات امور پر روک ٹوک یا معروف ومنکر کے امر ونہی کا کیا اور کس درجہ اہتمام ہوگا۔

ایک مستحکم مثالی معاشرہ پیدا کر دکھانے کی ضرورت ہے

ایک اور چیز بھی ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی کا کوئی چھوٹا بڑا عملی و مثالی معاشرہ پیدا کرنے میں مانع ہے۔ تقریر و تحریر کی حد تک دعوتِ خیر کی خدمات انجام دینے والے ایسے اہلِ علم و صلاح حضرات کی بحمداللہ خاصی تعداد پائی جاتی ہے جن کے نہ اخلاص میں کلام کیا جا سکتا ہے، نہ جد و جہد میں کوئی کمی و کوتاہی پائی جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کی بھی نظر اسلامی زندگی کا کوئی ہمہ جہتی ٹھوس اور مستحکم مثالی معاشرہ پیدا کرنے کی خدمت کی طرف نہیں جاتی۔ توجہ کہنا چاہیئے کہ تمام تر کیفیت سے زیادہ کمیت یا وسعت اور پھیلاؤ پر رہتی ہے۔ یہ انبیائی طریق و منہاج کے بجائے غالباً آج کل کے فرنگی طرز کا غیر شعوری تاثر ہے جو پروپگنڈے کے نام سے شر کے پھیلانے میں کارگر حربہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ حدود و اعتدال کے ساتھ اس حربہ سے کام لینے میں مضائقہ نہیں بلکہ ضرور لینا چاہیئے۔ لیکن خدائی نصرت و تائید — جو دینی و انبیائی طریقِ کار کا اصلی مدار ہے — اس کو متوجہ کرنے کا راز پروپگنڈہ کی وسعت نہیں بلکہ دنیا طلبی کے بجائے خدا کی رضا اور آخرت طلبی کی ٹھوس ہمہ گیر زندگی کی کیفیت والا مدنی معاشرہ ہے جو زبان سے کچھ کہے بغیر سیکڑوں ہزاروں تقریروں اور تحریروں سے زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ خالی زبان و قلم کا پروپگنڈہ تو بس ڈھول کے اندر پول والے اہلِ باطل ہی کو مبارک ہو۔

آج ہمارے سامنے دور و نزدیک ہندوستان و پاکستان کیا سارے اسلامی و غیر اسلامی ملکوں کے مسلمان جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں — ایمان کے

دل ودماغ سے سوچا جائے ـــــ توکیا وہ اس کے سوا اور ایمانی و عملی فساد کا خمیازہ ہیں کہ مردم شماری کے رجسٹروں میں نام لکھانے والے نام کے مسلمانوں کے سوا کسی معتد بہ درجہ میں بھی اسلامی اوامر ونواہی کے کام والا کوئی مرئی معاشرہ کسی ملک میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی آبادی کی بہت بڑی اکثریت ـــــ ۸۰، ۹۰ فی صد سے کم نہیں ـــــ ایک طرف علماً خیر ومعروف کے اسلامی احکام سے جاہل اور دوسری طرف عملاً کم وبیش ہر طرح کے معاصی ومنکرات، بدعات وشرکیات کا معاشرہ بن کر رہ گئی ہے۔ فسق وفجور لہو ولعب کی جن دوکانوں اور اڈوں کو دیکھئے مسلمان آبادیاں سب ہی کی رونق وآبادی میں اپنے عددی تناسب سے کہیں بڑھ چڑھ کر نمایاں اور نمائندہ ملتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو تعجب کی بات معاصی ومنکرات میں مبتلا ہونے والوں کی کثرت نہیں بچنے والوں کی قلت ہے کہ اتنے بھی کیسے بچ نکلے! یہ کھلا ہوا نتیجہ ہے دعوتِ خیر اور معروف ومنکر کے امر ونہی کی ہمہ گیر اسلامی تعلیم سے مسلسل صدیوں کی غفلت کا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ

ہندوستان میں اس وقت اسلام یا مسلمانوں کے دین کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اور ان کی آئندہ نسلوں کے لئے خصوصاً سب سے بڑا خطرہ بچوں کی ابتدائی جبری تعلیم ہے۔ اس کی راہ سے بلا کسی خارجی جبر واکراہ کے ایک آدہ نسل کے بعد ہی ہماری نسلوں میں رہے سہے نام کے اسلام کا نام باقی رہ جانا بھی (اعاذنا اللہ منہ) مشکل ہوگا۔ راقم حروف نے تقسیم کی بالکل ابتدا ہی میں جمعیۃ العلما کے بعض اکابر سے یہ اندیشہ عرض کیا تھا۔ ہفتہ وار صدق میں "مسلمانوں کی نئی مشکل کا پرانا حل" کے عنوان سے عام توجہ بھی

دلائی تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں سب سے مقدم اسی کی فکر ہے، گو ذرا دیر سے مگر مستقل طور جمعیت ہی کو اس خطرہ کی طرف توجہ ہوئی تھی۔ اور اب یوپی کی حد تک زیادہ انتظام و استحکام کے ساتھ تعلیماتِ دین کی تحریک کو تاہم جو تدابیر مد نظر ہیں وہ استیصال مرض کی نہیں، بلکہ مرض کے وقتی بحران کو دور کرنے کی۔ وقت کے بحران کو کسی نہ کسی نہج سے ٹالنا اہم واقدم بھی یقیناً ہے۔

خدا کرے بحران کا یہ خطرہ ٹل جانے کا کوئی سامان ہو جائے تو پھر استیصال مرض کا مستقل علاج وہی ہے کہ جمعیۃ یا علما کی کوئی اور جماعت اپنے کو مستقلاً منکم امۃ کے ——— دعوت خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی والے ———. اسی کام و نظام کے لئے وقف کردے جو علما کا اصلی و منصبی انبیائی فریضہ ہے۔ اگر اس فریضہ کا حق استحکام کے ساتھ شہر شہر، قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ ادا ہوتا رہتا تو آج مسلمان گھرانوں میں بلا کتاب و مکتب کے روایتی و موروثی طور ہی پر صحیح، دین عملاً اتنا راسخ و مضبوط ہوتا کہ کتابی و جبری تعلیم کے ناموافق حالات ایک نسل میں کیا نسلہا نسل میں آسانی سے اس کو زیر نہ کر پاتے۔ اور اس نام نہاد لادینی جبری تعلیم کے توڑ کا جو عملاً دینِ شرک کی تعلیم ہے کسی گھبراہٹ کے بغیر معقول و مستقل مداوا کر سکتے۔ باقی وقتی خطرہ کے لئے جو آج اس طرح کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں کہ اگر حکومت کچھ نہ سنے اور اسلامی توحید کی عین ضد جبری شرک کی تعلیم کی اصلاح نہ ہو تو خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کی تمام آبادیوں میں ہزاروں لاکھوں ایسے مکتبوں کا جال بچھا دیا جائے جن میں سرکاری جبری مدرسوں کے علاوہ

بچے گھنٹہ دو گھنٹے دینی تعلیم حاصل کیا کریں، ان میں کوئی مستقل وثمر کامیابی بجائے خود بھی مشتبہ ہی ہے۔ باقی ایمان وعمل کا جو ذہنی ونفسیاتی رسوخ گھر ملو اور روایتی فضا سے پیدا ہوتا ہے وہ تو بہرحال نرے کتابی مکتبوں سے نہیں پیدا کیا جاسکتا۔

اور اسی وجہ سے مشتبہ ہے کہ مسلمان گھرانوں میں دین کے علمی وروایتی تعامل وتوارث کے مٹ جانے سے دین کی قدر وقیمت عوام کے دلوں میں اتنی نہیں رہ گئی ہے کہ ان کے نجی مکتبوں کے وسیع پیمانے پر قیام وبقا کے لئے بقدر ضرورت سرمایہ جمع کیا جاسکے یا وہ اپنے بچوں کو ہنسی خوشی ان میں پڑھنے پر مجبور کریں۔ عوام تو عوام آج ہمارے مسلمان خواص ہی ایسے کتنے ہیں جو دنیوی تعلیم کی دنیوی ترغیبوں کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ ساتھ ہی قدرت ووسعت رکھتے ہوئے ضمناً ہی سہی خود اپنے بچوں کے لئے کوئی فکر کرتے ہوں۔ فکر وتدبیر تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کی دل میں قدر وقیمت ہو۔ ایسی وقتی تحریکیں وقتی بحران کو تو کچھ ٹال سکتی ہیں لیکن مرض کا مستقل علاج نہیں۔

پاکستانی مسلمانوں کی مقصد سے غفلت

پاکستان کی بھی ساری مصیبت یہی ہے کہ مسلمانوں کا دین کے علم وعمل سے توارثی وتعاملی یا روایتی تعلق زندہ نہیں رہا تھا۔ اب جو اُن کو آزادی ملی تو قدرۃً ہندوستان والوں ہی کی طرح زرطلبی ودنیا پرستی کی طرح طرح کی بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں اور فسق وفجور ہی کی راہوں میں اور زیادہ آزاد ہو کر کھل کھیلے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ دیکھ کر بھی حضرات علما کے اپنے اصل فرض مسلمان سازی سے زیادہ کیا کہنا چاہئے کہ تمام تر دستور سازی وغیرہ کے سے وقتی

مسائل ہی کی طرف منعطف ہے اس کا نتیجہ بھی صفر ہی نکلتا نظر آتا ہے۔ یہ وہی اصل مرض کے بجائے اشتداد مرض کے وقتی وظاہری علامات پر سارا زور لگا دینے کی غلطی ہے۔ سوچنے کی بلکہ انتہائی شرم کی بات ہے کہ ایسی مسلمان حکومت جو اسلام اسلام کے فلک شگاف نعرے لگا کر قائم کی گئی ہو، اس میں خود مسلمانوں ہی سے اسلامی دستور بنانے کا مطالبہ کرنا پڑ رہا ہو، جس طرح غیروں (انگریزوں) سے آزادی کا پڑ رہا تھا۔ پھر اس مطالبے کے ماننے اور منوانے میں بھی ہر طرح کی دشواریاں اور رکاوٹیں خود مسلمانوں ہی کی طرف سے ڈالی جا رہی ہوں۔ کیسے غضب وعبرت کے مناظر ہیں یہ! بات وہی ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کے سوا اپنے مسلمان ہونے کے تمام دوسرے ایمانی و عملی مطالبوں کو ہم بالکل بھول بھلا چکے ہیں۔ ہمارے ذہن میں تو اسلامی یا دینی حکومت کا مطلب بھی لے دے کر یہی رہ گیا تھا کہ بٹوارہ کرا کے بلا شرکتِ غیرے حکومت و آزادی کے دنیاوی مزے پوری طرح پوری آزادی سے لوٹنے کو ملیں گے۔

علمائے اسلام کا فریضہ۔ غرض ہندوستان ہو یا پاکستان، عرب ہو یا عجم جہاں کہیں کے مسلمانوں پر نظر ڈالئے ایک ہی مرض کا شکار پائیں گے کہ قولاً اپنے کو مسلمان کہنے کے باوجود عملاً زندگی کے ہر شعبہ میں ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی فراموش ہو چکی ہے۔ علاج خود فراموشی کی پیدا کی ہوئی ان ساری بیماریوں کا قدرۃً ایک ہی ہے، یاددہانی یا تذکیر کے منصوص و ماموں طریقے ـــــ دعوت الی الخیر ـــــ کو ہمہ گیر بنانا اور معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعے معاشرہ میں اس کو از سر نو برپا کرنا۔ اور اس کام کا اساسی

خصوصی طور پر جب ایک خاص جماعت منکم امۃ والے علما ہی پر فرض عاید کیا گیا جب تک وہی جماعت عرب و عجم ہر جگہ اپنے فرض کی ادائی کے لئے پوری طرح بیدار و کمربستہ نہ ہوگی، اس وقت تک جڑیں بہرحال دن پر دن سوکھتی چلی جائیں گی اور خالی شاخوں پہ پانی ڈال ڈال کر پھل لانے کی ساری کوششیں احمقانہ توقعات بنتی رہیں گی۔

جمعیۃ العلماء سے اپیل

ہندوستان و پاکستان میں نظم و نظام کے ساتھ جو جماعتیں اپنے اپنے رنگ میں دینی نقطۂ نظر سے کچھ اسلامی خدمات انجام دے رہی ہیں، تاریخی اولیت ان میں غالباً جمعیۃ العلما کو حاصل ہے۔ یہ اجنبی حکومتِ وقت کے مقابلہ میں دینی نقطۂ نظر لے کر ابتدائً سیاسی محاذ پر رونما ہوئی تھی تقسیم تک اس کا رُخ کم و بیش تمامتر اسی محاذ پر رہا۔ نئے حالات میں بھی زیادہ تر حکومت کی راہ و تعلق سے کچھ وقتی غیر سیاسی دینی و دنیوی خدمات ــــــ مثلاً ابتدائی جبری تعلیم کا مسئلہ یا متروکہ جائدادوں کے معاملہ ــــــ کی طرف متوجہ رہی۔ ہیں یقیناً یہ بھی سب مسلمانوں ہی کی خدمات۔ خصوصاً جبری تعلیم کا مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر جو ایمان لیوا اثر ناگزیر ہے، اس کا کوئی توڑ نکالنا ایک اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں وقت کے سب سے شدید دینی خطرہ و فتنہ کا سدباب ہے۔ لیکن ہے بہرنوع یہ بھی وقتی ہی خدمت و ضرورت۔ بلکہ اس وقتی خطرہ و فتنہ سے اس خطرناک شدت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا ہی اس لئے کہ حضرات علما نے دعوۃ الی الخیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کی اپنی مستقل منصبی خدمات سے قاصر رہے۔ علما کے ہر فرد اور ہر جماعت و جمعیت کا اصل فرض اپنے

اسی مستقل منصب کو ہاتھ میں لینا اور اس کا حق پورا کرنا ہے پھر انشاء اللہ وقتی مسائل و مشکلات اولاً تو پیدا ہی کم ہوں گے اور جو ہوں گے ان کا حل آسان ہوگا اور امت "منکم امۃ" والی جماعت کے اثر و نگرانی میں رہ کر دینی ہی نہیں یقیناً دنیوی یا سیاسی و معاشی فتنوں فسادوں سے بھی محفوظ رہے گی یا آسانی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہو سکے گی۔ جب مسلمانوں کی دنیا یا سیاست و معیشت سب کی سب بالکلیہ ان کے دین کے تابع ہے تو متبوع کی درستی از خود تابع کی درستی کو مستلزم ہے اور کسی وقتی و عارضی نادرستی و فساد کے ظہور کی صورت میں اس کی اصلاح بھی آسان ہی ہوگی۔

جماعتِ اسلامی کی اُلٹی منطق

دوسری نسبتہً نو پیدا جماعت اسلامی ہے، یہ بھی اصلاً سیاسی میدان ہی کی پیداوار ہے جو حکومت و سیاست کے غیر اسلامی نظامات و نظریات کے مقابل الٰہی حکومت یا اسلامی سیاست کی برتری کی دعوت و دعویٰ لے کر اٹھی تھی۔ نقطۂ نظر یہ تھا اور بڑی حد تک اب بھی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی صلاح و اصلاح کے لئے مقدم سیاسی انقلاب ہے۔ بلا اسلامی حکومت کے نہ مسلمان مسلمان بن سکتے ہیں نہ ان کے دینی و دنیوی مسائل و مشکلات حل ہو سکتے ہیں۔ یہ درحقیقت انبیائی تعلیم و تاریخ کی پوری منطق کو اُلٹ کر نتائج کو مقدمات اور مقدمات کو نتائج بنا دینا تھا۔ حضراتِ انبیا اور انبیائی راہ پر چلنے والوں کا سب سے پہلا کام دعوتی جد و جہد سے ایمان و عمل صالح کی زندگی یا معاشرہ پیدا کرنا ہے۔ باقی دینی یا الٰہی حکومت کا قیام و بقا خود خدا کی طرف اور اس کی نصرت خاص سے موعود و مشروط نتیجہ یا انعام ہے۔ پہلے ایمان و

عمل صالح والا معاشرہ پیدا کر لینے کا"۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ" (۲۴:۵۵) یعنی جو لوگ (کسی معتدبہ جماعت یا معاشرہ کی صورت میں) ایمان و عمل صالح کی زندگی کا ثبوت دیتے یا اس کا حق ادا کرتے ہیں ان کو زمین کی خلافت (اسلامی یا الٰہی حکومت) بھی ضرور اللہ تعالیٰ عطا کر کے رہے گا۔

اس کا ایک وقتی فائدہ | تاہم جماعتِ اسلامی کی الٹی منطق کا ایک وقتی فائدہ ضرور ہوا کہ جدید تعلیم کے افراد و طبقات جن کی ساری تعلیم و تربیت کا محور اسی دنیا کا جاہ و مال ہوتا ہے ـــــ اور حکومت دونوں کا مظہر اتم ہے ـــــ ان میں بہتوں کا رُخ دنیا کی اس راہ سے دین کی طرف پھر گیا۔ غلط راستہ پر کچھ اور چلنے کے بعد آدمی منزل کی سمت مڑ جائے تو صبح کا بھولا شام تک انشاء اللہ ٹھکانے ضرور پہنچ جائے گا۔ بعد کو الحمد للہ اس جماعت کو بھی معلوم ہوتا ہے اپنی اُلٹی منطق کا کچھ احساس ہوا اور حکومتِ الٰہیہ کے بجائے اقامتِ دین کی تعبیر اختیار کر لی۔ خصوصاً ہندوستان میں کام کرنے والی جماعت اسلامی تو اس تعبیر و تبدیل کا حق بھی ماشاء اللہ خاصا ادا کر رہی اور اپنی منطق کو سیدھا کرتی جا رہی ہے۔ دونوں میں بڑی خامی ایک ہی ہے کہ اُن کے اکابر و اصاغر سب کا دینی فہم و فکر زندہ اہل علم و عمل کی تعلیم و تربیت سے ماخوذ ہونے کے بجائے زیادہ تر صرف کتابوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لازماً غیر تربیت یافتہ ذہانت و ذہنیت اور تحریر و تقریر کے انشائی و خطابتی زور میں بارہا افراط و تفریط میں پڑ کر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔ کسی تجربہ کار ماہر طبیب کے مطب میں نسخہ نویسی کی مشق کے بغیر طب کی

خالی کتابیں پڑھ کر ان حضرات نے مطب کھول دیا اور علاج کرنے لگے۔ بس یہی ان کی ساری خامیوں کی جڑ ہے۔

اصل میں یہ کام بھی جدید سیاسی افکار و احوال اور اُن کے عیب و ہنر سے پوری طرح آگاہی حاصل فرما کر "علما راسخین" ہی کا تھا جب انھوں نے وقت کی اس ضرورت کا احساس اور اس کے لئے ضروری تیاری نہ فرمائی تو ضرورت تو ضرورت ہی ہے اپنے تقاضوں کو کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی چھوڑتی ہے۔ جو ان کو پورا کرنے کے لئے میدان میں آ گیا لوگ اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اب جو حضرات علما ان کی بے راہ روی یا بے اعتدالیوں کی شکایت فرماتے ہیں، ان کو سوچنا چاہئے کہ میدان خالی چھوڑ دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور کیا اس کا تدارک محض کچھ تردیدی رسالوں یا تکفیری فتووں سے ممکن ہے؟

اسلام کی سیدھی صحیح راہ پر چلنے والی جماعت "تبلیغی جماعت" ہے

سچ پوچھئے تو نبوت و اسلامیت کی سیدھی صحیح راہ و منطق بڑی حد تک اختیار کرنے والی نمایاں جماعت اس وقت "جماعت الیاسی" یعنی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت ہے اس کو بعض جوان سال و جوان ہمت دین کے ایسے اہلِ علم مل گئے ہیں جن کا علم و فکر ایک طرف محض کتابی نہیں بلکہ خود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ و دیگر مستند "راسخین فی العلم" علمائے امت کی صحبت و تربیت سے ماخوذ ہے، دوسری طرف انھوں نے اپنے تن من دھن سب کی بازی حکومت و سیاست سے قطع نظر فرما کر پہلے مسلمانوں کو مسلمان بنانے یا دعوت و اصلاح کی انبیائی خدمت پر لگا رکھی ہے۔ ساتھ ہی خود اپنے کو اصلاح و تربیت سے

اب بھی بے نیاز نہیں سمجھتے۔ اسی کی برکت ہے کہ باوصف ذہن وذہانت انشا وخطابت اور جدید معلومات ورجحانات سے خاص مناسبت وواقفیت میں جماعتِ اسلامی سے کسی طرح پیچھے نہ ہونے کے امت میں انتشار پیدا کرنے والی خود رائی اور اجتہاد و تجدد سے الحمد للہ بالکل محفوظ ہیں۔

اس جماعت میں ایک بڑی کمی

راقم نالائق وناکارہ کی نظر میں ایک ہی کمی —— بہت بڑی کمی —— تھی کہ ان حضرات کی توجہ کہنا چاہئے کہ تمام تر صرف ایمان و ایمانیات کے احیا یا ان کے راسخ وصادق بنانے تک محدود تھی۔ عملوا الصالحات میں صرف نماز پر زیادہ زور تھا حتیٰ کہ بہتوں نے اس کو صرف کلمہ ونماز کی تحریک سمجھ لیا ہے، باقی دین وشریعت کا وہ پورا حصہ جس سے خود اس دنیا کی پوری زندگی سراپا دین واسلام بنتی ہے۔ یعنی خالق کے ساتھ خود مخلوق یا بندوں کے باہمی تعلقات وحقوق —— معاملات و اخلاق اور معاشرت —— ان پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی حالانکہ ان کے بغیر خود ایمان وایمانیات ناقص اور بے جان رہتے ہیں، ایمان و عمل یا قول و فعل ایک دوسرے پر عمل ورد عمل ہی سے زندگی وتازگی اور قوت و استقامت پاتے ہیں جس طرح اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے روح وروحانیت کی ترقی و تکمیل کو جسم وجسمانیت (یا اعمالِ جسم) کے ساتھ وابستہ فرمادیا ہے، اسی طرح دین کی روح ایمان کی تکمیل نہ بغیر اعمال صالحہ کے ہوسکتی ہے اور نہ بلا عمل ایمان میں رسوخ واخلاص ہی نصیب ہوسکتا ہے۔

بڑی آرزو تھی اور ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ایسی دیوانہ وار خدمتگزار

جماعت کے بڑوں کو اس بڑی کمی کی طرف متوجہ فرمادیں۔ مدت ہوئی ماہنامہ الفرقان میں نگاہِ اولیں کے زیرِ عنوان یہ پڑھ کر دل مسرت سے اچھل پڑا تھا کہ آخران حضرات نے خود ہی اپنے تجربات کی بنا پر اس کمی کو محسوس فرما لیا اور دعوتی جدوجہد کے ساتھ عملی واصلاحی تربیت کی فکر پڑ گئی۔ اور عمل سے مراد صرف نماز روزہ کے خالی عبادتی اعمال نہ رہے، بلکہ دین و شریعت کے تمام شعبے عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق و معاملات اور معاشرت سب ہی مدنظر ہیں عصری رجحانات کی خاطر سیاست و حکومت کا بھی نام لے لیا گیا ہے۔ جو نفس دین کا کوئی جوہری جز یا مطالبہ و مقصود نہیں بلکہ صحیح و کامل زندگی کا موعود نتیجہ۔ اور پھر اسی دینی زندگی کی حفاظت اور مزید ترقی کا ذریعہ یعنی ایمان و عمل صالح کے اسلامی زندگی کے نتیجہ و انعام کے طور پر ایک طرف خلافتِ ارضی کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ دوسری طرف اس وعدہ کے پورا ہونے پر اسی ایمان کی ترویج و تحفظ میں معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ اس حاکمانہ و سیاسی اقتدار و قوت سے کام لینے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ کما قال اللہ: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (۲۲/۴۱)

مطلب یہ کہ ہم حاکم ہوں یا محکوم بالذات و براہِ راست انفرادی و اجتماعی خصوصی و عمومی طور پر اسلام کا اہم و اقدم مطالبہ ہم سے مقدور بھر ہر طرح کی جانی و مالی قربانیوں اور شدائد و مصائب کے تحمل کے ساتھ ایمان و عمل صالح کی زندگی کو خود اختیار کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ہے۔ پھر اس تکّی زندگی ہی سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو اپنے وقت پر

مدنی زندگی کا سامان رونما ہوکر استخلاف فی الارض یا عطائے حکومت کا وعدہ بھی پورا ہوکر رہے گا۔ تب ہی یہ حکومت اس کے شہری عوام و خواص سب اپنے اپنے محل و موقف کے لحاظ سے اپنے اقتدار و اثر کو معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ ایمان و عمل صالح کی دینی و اسلامی زندگی کی ترقی و ترویج میں استعمال کریں گے۔

درمیان میں یہ جملہ معترضہ اس لئے ضروری تھا کہ اقامتِ دین یا دین کی دعوتی و اصلاحی خدمات میں مطالبۂ حکومت کو شریک کر دینا ــــــ خصوصاً اس زمانہ میں حکومت و سیاست کی طلب و تحصیل کا جو مفہوم و مدعا ہوگیا ہے ــــــ دین کی دعوت کے ساتھ دراصل فتنہ و فساد کی دعوت کو شریک کر دینا ہے۔ انبیائی دعوت کے مزاج شناسوں کو تو بالخصوص جب تک کوئی معتد بہ آبادی یا ملک و قوم عملاً ایمانی زندگی کو اپنی زندگی نہ بنالے حکومت و سیاست کا نام بھی نہ لینا چاہئے۔ پاکستان جو ایمان و عمل صالح کی زندگی سے نہیں بلکہ غیروں کے لائے اور سکھائے ہوئے فساد فی الارض والے حکومتی و سیاسی نعروں اور مطالبوں سے غیروں ہی کے صدقہ میں بنا تھا وہ نام کا پاکستان ہوکر بھی جیسے ناپاک یا غیر صالح تخم سے پیدا ہوا ہے دین و دنیا دونوں کے حق میں ویسے ہی ناپاک ثمرات بھی پیدا کر رہا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر غیروں کے سیاسی مصالح و اغراض کا آلۂ کار بن کر۔ اس نام کے "اسلامی پاکستان" کی بنیادی کمزوری یہی اُلٹی منطق ہے کہ **ایمان و عمل صالح** والی اسلامی زندگی کی اندرونی طاقت کے بجائے محض بیرونی نعرہ بازیوں کی پیداوار ہے اگر وہاں کے صحیح دینی علم و بصیرت رکھنے والے حضرات نے اب بھی اس حقیقت کو نہ سمجھا

یعنی حکومت و سیاست کے شر و فساد میں الجھے رہنے کی جگہ **ایمان و عملِ صالح** دونوں کی ہمدوش تبلیغی و اصلاحی جدوجہد سے مسلمان عوام یا شہریوں کو **مسلمان** بنانے کا کام دعوتِ خیر اور معروف و منکر کے امر و نہی کے اسلامی نظام کے ذریعہ ایسے وسیع و مستحکم پیمانے پر شروع فرمایا کہ ہر ہر محلہ و قریہ کا ہر ہر گھر اس کے دائرہ میں آجائے، تو یہ نام کا پاکستان بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس دن اپنوں پرایوں کے ناپاک اغراض و مقاصد کی بھینٹ چڑھ کر رہ جائے۔ فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین۔

تبلیغی جماعت جیسی ہی جماعت سے صحیح اسلامی حکومت پیدا ہوگی	بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور بے موقع نہیں نکلی غرض تبلیغی جماعت کی نسبت کچھ ہو رہا تھا کہ اس یا اس جیسی

دوسری دعوتی و اصلاحی جماعتوں ہی سے صحیح اسلامی حکومت بھی پیدا اور پیدا ہو کر پائندہ رہ سکتی ہے خصوصاً عصرِ حاضر میں جبکہ عوام ہی عوام کے نام کا کلمہ کم و بیش ہر حکومت کا دین و ایمان بن گیا ہے تو خود حکومت اور اربابِ حکومت کو مسلمان بنانے اور بنائے رکھنے کا تدبیری کارگر راستہ بھی تو یہی ہے کہ سب سے زیادہ زور عوام کو مسلمان بنانے پر لگایا جائے تاکہ کچھ اور نہ سہی تو ان عوام کے ووٹوں ہی کی خاطر خواص اپنے کو مسلمان بنانے پر مجبور رہیں۔

ہر اعتبار سے ہر چیز پر مقدم کام عوام میں دینی دعوت اور ان کے ایمان و عملِ صالح کی اصلاحی تربیت ٹھہرتا ہے۔ خصوصاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کتاب و سنت پر مبنی نظامِ ہدایت کا احیا کہ عوام کی ہمہ گیر دینی تعلیم و تربیت کا مدار تمام تر

اسی پر ہے۔ البتہ دعوت و اصلاح کی یہ عمومی خدمت خصوصیت کے ساتھ خواص اہلِ علم و صلاح کی ذمہ داری ہے۔ عوام کو زیادہ تر خود اپنی اور اپنے اہل و عیال یا زیرنگرانوں کی اصلاح یعنی ان کے ایمان و عمل صالح کے تمام احکام کی نگرانی و خبرگیری کے فرض کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ہر عامی کو داعی و مبلغ یا انبیا کا وارث بنا دینے میں نہ صرف اس سے افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا قوی اندیشہ ہے بلکہ نفسیاتی طور پر اپنے کو مصلح و مقتدا جان بیٹھنے کی ہلاکتوں میں مبتلا ہو جانے اور اپنی اور گھر والوں کے بجائے دور دور کے دوسروں کی اصلاح کو سارا دین سمجھنے لگنے کا بھی۔ یہ نرا قیاس نہیں اس کس مپرس تک کے تجربے میں ایسی مثالیں آتی رہتی ہیں۔

ثم الحمد للہ کہ الفرقان ہی میں اور خود مولانا (محمد منظور) نعمانی سلمہ ہی کے "دین و شریعت" کے عنوان سے موعود تربیتی ہفتہ کی تقریروں کو پڑھ کر اس مایوس کو تو گویا کوئی بڑی کھوئی ہوئی دولت مل گئی۔ گو ۹۶ صفحوں کی ان بے حد دلنشین تقریروں میں معاملات و اخلاق اور معاشرت کا حصہ صرف سات صفحے کا رہا۔ تاہم جن اعمال و اخلاق کا تعلق صبح اٹھنے سے لیکر رات کے سونے تک بیداری کی کم و بیش ساری سرگرمیوں سے رہتا ہو، ان کی طرف اس جماعت کے اکابر کی مستقل توجہ ہو جانا، انشاء اللہ مستقبل کے لئے بہت امید افزا[۵] ہے سب کچھ رہا نہیں جاتا کہ یہ برکت تھانوی تجدیدات کی ہمہ گیری

---

[۵] انا للہ کہ یہ امید بھی امید ہی رہی! حتی کہ ابھی ان اوراق پر نظر ثانی کے دوران میں نئی تعلیم کے ایک پرانے شریک جماعت نے اپنی اس سے کنارہ کشی کی وجہ یہی بتائی کہ اخلاق و اعمال کی اصلاح سے بڑی بے پروائی ہے۔

ہی کی ہے، جس نے عقائد و عبادات کے ساتھ اخلاق و معاملات اور معاشرت سب کو "دین و شریعت" میں ان کا پورا پورا حق و حصہ از سرِ نو دلایا۔ انسانی روح کو اس ناسوتی زندگی میں بھیجنے کا مقصد و منشا ہی سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ پوری زندگی کے ہر طرح کے معاملات و مشاغل کو عبادت بنا کر اس کے کمالاتِ عبدیت کی تربیت و تکمیل فرمائی جائے۔ ورنہ خالی تسبیح و تقدیس کی عبادت کے لئے فرشتوں کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور یہی راز ہے کہ خدمتِ خلق کی چھوٹی باتوں کا بھی اجر نماز روزہ کی نفلی و استحبابی عبادتوں سے کتنا زیادہ موعود ہے۔

دعوتِ خیر کے ساتھ معروف و منکر پر امر و نہی بھی ضروری ہے

ابھی ایک اور بڑی کسر کی طرف توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے یعنی یدعون الی الخیر میں تو ایمانیات و عبادات سے ترقی فرما کر معاملات و اخلاق اور معاشرت کی دعوتِ خیر کو شریک کرنے کا ارادہ فرما لیا گیا ہے لیکن "یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر" کا حکم بھی تو "یدعون الی الخیر" کے بالکل ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا تا رہا کہ دعوت الی الخیر کے ساتھ خیر پر عمل اور اس کی عملی نگرانی معاشرہ میں معروف و منکر کے امر و نہی سے پورے قرآنی نظام کو از سرِ نو برپا کئے بغیر ناممکن ہے۔ دین کیا دنیا کی بھی کوئی دعوت اس وقت تک پھل پھول نہیں سکتی جب تک معاشرہ میں عملاً اس کو عزت و وقعت اور اس کی مخالفت کو ذلت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے کسی سوسائٹی یا سماج میں وہی باتیں جڑ پکڑتی اور پروان چڑھتی ہیں جن کے کرنے پر پسندیدگی اور نہ کرنے پر ناپسندیدگی کا

اظہار زبان و عمل دونوں سے کیا جاتا ہو۔ یہی عام سماجی پسند و ناپسند پیدا کرنا حقیقت ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی۔

بعض لوگ اس تحریک کو محض کلمہ و نماز کی جانتے ہیں مگر جہاں تک معروف و منکر کے امر و نہی کا تعلق ہے نماز کے ترک یا اس کے منکرات تک پر کوئی روک ٹوک دیکھنے سننے میں مشکل سے آئے گی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مسجدوں کے جو منکرات گنائے ہیں اور جن پر روک ٹوک کو واجب ٹھہرایا ہے، ان میں بعض بعض تو ہمارے زمانے میں اس درجہ عام ہیں کہ سیکڑوں میں شاید دو چار ہی کو ان کی پرواہ کیا علم بھی ہو۔ مثلاً کتنے ہیں جو نماز میں کلام مجید صحیح پڑھتے ہوں۔ امام صاحب نے لکھا ہے کہ نماز میں قرآن غلط پڑھنے والوں کو نہ صرف ٹوکنا بلکہ ان کی تصحیح یا صحیح پڑھنے کی تعلیم بھی واجب ہے اسی طرح کتنوں کو دیکھو گے کہ سکون و اطمینان یا تعدیل ارکان کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ اچھے اچھے علما کو دیکھو گے کہ دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں، اتنا بھی کہتے کسی کو نہیں سنا کہ بھائی مسجد آئے، وضو کیا، اتنا وقت دیا پھر دو چار منٹ کی جلد بازی سے کیوں کی کرائی محنت اکارت کر لیتے ہو۔ حالانکہ بجز حنفیہ کے جیسا کہ امام صاحب نے لکھا ہے دوسرے تمام ائمہ کے نزدیک ایسی نماز صریح حدیث کی رو سے سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ اس طرح نماز اکارت کرنے والوں کو دیکھ کر جو لوگ خاموش رہتے ہیں وہ بھی شریک گناہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ

"اگر کوئی شخص مسجد میں معتکف ہو اور اس طرح کے منکرات کی روک ٹوک میں اس کو

اتنا مصروف رہنا پڑے کہ خود اپنی نفل نمازوں اور ذکر وغیرہ تک کا موقع نہ ملے تو بھی ان منکرات پر روک ٹوک ہی میں لگا رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ روک ٹوک ایسی عبادت ہے جس کا نفع دوسروں کو پہنچتا ہے اور واجب ہے بخلاف نفل و ذکر کے کہ اس کا نفع خاص اپنی ذات تک محدود ہے۔"

حد یہ کہ واقعی و واجبی ضرورت سے زیادہ معاشی فکر و تدبیر پر بھی معروف و منکر کا امر و نہی مقدم و واجب ہے۔ اور واجبی ضرورت و حاجت کی حد خود امام صاحب نے یہ لکھی ہے کہ کسی کے پاس اگر ایک دن کھانے کا انتظام بھی نہ ہو تو البتہ وہ معاش کی فکر و تدبیر میں منکر پر روک ٹوک سے معذور سمجھا جائے گا۔ کہاں "دین و شریعت" کے مزاج شناس اور امام غزالیؒ جیسے امت کے مسلّم مجدد و مصلح کی نگاہ اور فہم "دین و شریعت" میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی یہ اہمیت و اقدمیت اور کہاں ہمارے عوام کیا خواص علما بلکہ ان حضرات تک کی اس معاملہ میں غفلت و مسامحت جنہوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں دعوت و اصلاح کی خدمت میں لگا دینے کی سعادت حاصل فرما رکھی ہے۔ مگر چونکہ بظاہر زیادہ کیا سارا زور دور دراز تبلیغی سفروں، دوروں اور گشتوں پر نظر آتا ہے، اس لئے لازماً خود اس خدمت میں عملی حصہ لینے والوں پر بھی یہی پہلو غالب رہتا ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس غلو کی خرابی پر خود ان پر اس خدمت کے اساطین کی نظر پڑ گئی ہے کہ

"یہ پہلو ہماری اس دعوت میں اتنا غالب ہے کہ بعض اوقات لوگوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد اور اس جماعت کا کام بس جدوجہد اور دوڑ

دھوپ ہے۔ اس کے سوا کوئی متعین مقصد یا اصلاحی و تربیتی کام ان لوگوں کے سامنے نہیں. حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو اصل کام کے لئے صرف ذریعہ ہے۔ ورنہ اصل مقصد اور اصل کام تو حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی (وہی تمام اعمالِ صالحہ والی) کا پیدا کرنا اور عام کرنا ہے یعنی مومن کے لئے جن حقیقتوں پر یقین ضروری ہے، ان کا یقین مسلمانوں میں عام ہو اور مومن کی جیسی (تمام اعمال زندگی کے اعتبار سے) علمی و اخلاقی و دعوتی زندگی ہونی چاہئے، وہی مسلمانوں کی عمومی زندگی ہو۔[1]

ماشاء اللہ، جزاک اللہ، بارک اللہ! بس زیادہ دوڑ دھوپ پر زور لگانے کے بجائے یہی عمومی زندگی مسلمانوں کی کسی معتدبہ آبادی یا معاشرہ میں پیدا کرنا، وہ ٹھوس کام ہوگا کہ اس کے بعد ہر فرد کی چلتی پھرتی "علمی و اخلاقی" زندگی خود ہی ٹھوس اور مجسم "دعوتی زندگی" ہوگی اور اس کا پیدا ہونا معروف و منکر کے امر و نہی کے پورے عمومی و خصوصی قرآنی نظام و انتظام کے بغیر عملاً ناممکنات سے ہے۔

ایک اور گمنام اصلاحی جماعت | یاد ش بخیر! ایک اور نسبتہً گمنام جماعت کیا فردِ فرید کے مد نظر دونوں پہلو نظر آئے۔ مراد ہردوئی (یوپی) کے اشرف المدارس والے حضرت مولانا ابرار الحق سلمہ ہیں. ماشاء اللہ اپنی ذات ہی سے ایک چھوٹا موٹا مدرسہ بھی ہیں، جس میں عملی اور عملی نگرانی پر علم سے کم نہیں، زیادہ ہی زور ہے. طلبا ہی نہیں اساتذہ وغیرہ دیگر متعلقین مدرسہ کے

---

[1] زیر خطِ راقم آثم نے جن الفاظ کو کر دیا ہے وہ حرف حرف خود اس کے دل کی آواز اور آرزو ہے جو خود سراپا ناکارہ ہونے کی بدولت دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔

معاملہ میں بھی اس کا پورا اہتمام رہتا ہے کہ ان کی صورت وسیرت علمی واخلاقی زندگی دینی مدرسہ کے شایانِ شان ہو۔ عام دینی مدرسوں میں ایک بڑا دینی روگ ہے کہ مجلس شوریٰ و انتظامیہ وغیرہ کے ارکان واعضا کیا معنیٰ خود اساتذہ اور خاص مدرسہ کے متعلقین و ملازمین تک کی علمی واخلاقی حالت کی پرواہ کم ہی کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک نامی گرامی دارالعلوم کے متعلق یہ معلوم ہو کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ ایک معلم صاحب کہنا چاہئے کہ رشوت وخیانت کی بھی تعلیم اپنے شاگردوں کو باقاعدہ دیتے ہیں۔ حیرت بالائے حیرت کہ اس کی خبر بھی اہلِ اہتمام واختیار کو پوری طرح اور مدتوں سے ہے! باقی معمولی دینی و اخلاقی کمزوریوں کا سبق تو خود اپنے نمونوں سے ہمارے دینی مدارس و منتظمین، ارکان و اعیان کم بیش سب ہی دیتے رہتے ہیں۔ اشرف المدارس میں ایسے مدرسین وغیرہ کی قطعاً کوئی جگہ نہیں جو خود صورۃً وسیرۃً صالح یا کم از کم اپنی اصلاح کے لئے پوری طرح تیار نہ ہوں۔

مدرسہ ہی کی طرح مولانا سلمہ کہنا چاہئے کہ اپنی ذات ہی سے دعوۃ الحق نام کی ایک سراپا دعوتی واصلاحی تحریک بھی ہیں۔ اس کی بھی خاص خصوصیت یہی ہے کہ نفس دعوتِ خیر کی حد تک ایمان وعمل صالح کے تمام شعبوں کی طرف بلایا اور متوجہ کیا جاتا ہے[۱] بہتر و فسد و منکر کے امر و نہی کو پورے قرآنی واسلامی مذکورۂ صدر نظم و

---

[۱] یہ کام بڑے خلوص وللہیت کے ساتھ حضرت حکیم الامت کے ایک قدیم فیض یافتہ پختہ سن پختہ مزاج اور شائستہ مذاق بزرگ حضرت میر امام الدین صاحب حیدر آبادی بھی اپنی عمر کے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

نظام کی طرف ذہن کو التفات نہیں۔ تاہم خطاب خاص و عام دونوں سے اس کا حق بھی بہت کچھ ادا ہوتا رہتا ہے۔

اس جماعت کی ایک خاص غفلت | البتہ ایمان و عمل صالح کی پوری اسلامی زندگی کا کوئی نمونہ کا معاشرہ پیدا کرنے کے صبر آزما کام کی طرف دعوۃ الحق کی تحریک کو بھی کوئی توجہ نہیں۔[1]

اس کے خدمتگزاروں میں ایک بڑی کمی | توسیع و تعمیم کے حق میں بھی اس دعوت میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس کے خدمت گذار عصری اسلحہ سے عملاً بالکل غیر مسلح ہیں، نہ عصری علوم و معلومات، نہ عصری رنگ کی انشا و خطابت، نہ کتابیں، نہ رسائل و اخبارات غرض عصری پروپگنڈے کے جائز و ضروری سامان بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لازماً وسعت و کمیت یا پھیلاؤ کے لحاظ سے تحریک کی رفتار بہت دھیمی ہے لیکن اسی نسبت سے کیفیت کا رنگ خاصا گہرا بھی ہے یعنی اس دعوت سے جو ذرا زیادہ قریب و مانوس ہوتا ہے، نماز روزہ کے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) آخری دس پندرہ سال انجام دیتے رہے (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ) اوران کے حدود تبلیغ وارشاد ریاست حیدرآباد سے گذر کر ایک طرف ضلع شولاپور (بمبئی) دوسری طرف بجوڑا (صوبہ مدراس) اور تیسری طرف بنگلور تک پھیل گئے تھے۔ حضرت موصوف کے کام میں "جوشِ امر و نہی سے زیادہ "جذبۂ شفقت" کارفرما تھا۔ (غ۔م)

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) بلکہ اس سے بھی مقدم چیز کی طرف سے غفلت ہے یعنی یہ کہ خود حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے خلفائے کرام میں تنظیم و اتحاد اور مرکزیت کے ساتھ اس نظام کو برپا کرنے کی کوشش!! کاش اس سلسلہ میں خانوادہ چشتیہ کے آفتابِ ہدایت حضرت سلطان الاولیا نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ کی تبلیغی مساعی پر غائر نظر ڈال کر اپنی رہبری کا سامان فراہم کیا جائے۔ (غ۔م)

علاوہ اس کے معاملات واخلاق اور معاشرت میں بھی خاصی اسلامیت نمایاں ہوتی ہے۔ باطن وسیرت کا انقلاب قدرۃً ظاہر وصورت پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ یوں بھی دعوتِ خیر کے ساتھ معروف ومنکر کے امر ونہی کے امتزاج واہتمام سے مسلمان صدیوں سے اتنے اجنبی ہو چکے ہیں کہ دونوں کی جامع دعوت میں طول وعرض کی زیادہ وسعت پیدا ہونا بہت دیر طلب اور بڑی جدوجہد کا طالب ہوگا۔

دونوں جماعتوں میں اتحاد کی ضرورت

احقر کے علم ونظر میں بس یہی دو جماعتیں ہیں جو سیاست وحکومت سے یک قلم قطع نظر کرکے دعوت وتبلیغ کے خاص وخالص انبیائی ورثہ کے کام کو مخلصانہ طور پر خالص دینی نقطۂ نظر سے انجام دے رہی ہیں۔ اسی لئے بڑی تمنا رہی کہ کچھ نہیں تو ان دونوں ہی میں اگر پورا پورا تعاون نہیں تو کم از کم اتنا تباعد بھی نہ رہتا جو ایک دوسرے سے "خذ ما صفا" کے اخذ واستفادہ میں حاجب ہو چندے یہ صورت رہی بھی۔ اور یہ ناکارہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا رہا کہ دونوں ایک ہوکر دعوت واصلاح کے معیاری نمونے کو انشاء اللہ امت کے سامنے رکھ ہی دیں گی۔ مزاج ومذاق کا کچھ نہ کچھ اختلاف وتفاوت ہر دو آدمیوں میں بالکل قدرتی امر ہے۔ یہ بھی بالکل ضروری نہیں کہ بڑے بڑے مخلص افراد یا جماعتیں بھی ایک کام کو ایک ہی رنگ وطرز سے انجام دیں۔ یا سب کی سب کسی ایک نظم وتنظیم کے تابع ہو جائیں۔ گو اسلام کا مطالبہ ایک ایسی وسیع تنظیم ہی کا ہے۔ تاہم دین کے مخلص خادموں میں اتنی بیگانگی تو کسی طرح روا نہیں کہ ایک دوسرے سے مخلصانہ اخذو

استفادہ کے مواقع تک میسر نہ ہوں۔ ایسا بعد و بیگانگی بجائے خود ہی قطعاً غیر اسلامی اور اسلامیت کی روح کے سرتاسر منافی ہے۔ اپنے مرض "دخل در معقولات" سے مضطر ہو کر دونوں سے ایک آدھ بار عرض بھی کیا۔ مگر کس مپرس کی کون سنتا ہے' اس لئے "داشتہ آید بکار" کے مقولہ پر عمل کر کے "نوشتہ آید بکار" ہی سے اپنی بھڑاس کچھ نکال رہا ہوں کہ شاید کبھی کسی کی نظر قائل کی نالائقیوں سے قطع نظر کر کے قول پر پڑ جائے۔ ورنہ اپنی تو ساری نابکار زندگی کا خلاصہ ہی بس "یک کاش بود کہ صد جا نوشتہ ایم"۔

علماء اپنی ذمہ داری کو سمجھ لیں | حاصل معروضات اور بار بار عرض کرنے کی بات یہی ہے کہ امت کی ہر بگڑی کو بنانے کی تدبیر فقط ایک ہی ہے کہ منکم امتہ والے علماء امت جو اس امت کے راعی و نگہبان یا رکھوالے قرار دیئے گئے ہیں' وہ اپنی رکھوالی کی دونوں ذمہ داریوں کا حق ساتھ ساتھ اسی طرح ادا کریں جس طرح خود قرآن ہی میں وہ ساتھ ساتھ ان پر عائد فرمائی گئی ہیں۔ (۱) یعنی خیر کی طرف لوگوں کو بلانا جس سے مراد ظاہر ہے کہ کامل خیر یا "دین کامل" کی ایمان و عمل صالح والی زندگی کے ہر شعبہ ــــ عقائد و عبادات' معاملات و اخلاق اور معاشرت ــــ کے احکام کی دعوت ہے۔ (۲) اور ساتھ ہی ساتھ معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ ان احکام کی عملی ترویج و نگرانی۔ ان ہی دونوں کی ہم آہنگی دعوت اور اصلاح دین کی وہ بنیاد ہے کہ جتنی زیادہ یہ استوار و مستحکم ہو گی اتنے ہی زیادہ مسلمان اپنے ایمان و عمل میں راسخ و پختہ ہوں گے۔ اس طرح ایک طرف نہ قادیانی و پرویزی وغیرہ گھر کے بھیڑیوں کے لئے

ان مستحکم و راسخ ایمان و عمل والوں کو شکار کرنا آسان ہوگا اور نہ ایسے پختہ ایمان و عمل والے مسلمان والدین کی گود اور گھر میں پرورش پائی ہوئی اولاد کو غیر اسلامی ـــــ نام نہاد سکولر ـــــ جبری تعلیم کے ذریعہ اسلام سے اس طرح اور اس آسانی سے گمراہ و دور کرنا آسان ہوگا جس طرح آج اسکول میں جاتے ہی وہاں کا رنگ چڑھ جاتا ہے تاہم تابہ امکان ابتدائی تعلیم میں اُن کو خالص سرکاری اسکولوں سے بچانا بھی ضروری ہے ان کی عملی جیتی جاگتی اسلامی زندگی خود باہر والوں یا غیر مسلموں کے لئے کانوں سنی تقریری و تحریری تبلیغ سے کہیں زیادہ کارگر یہ آنکھوں دیکھی دعوت و تبلیغ ہوگی۔ زبان آوری کی باتیں دلوں میں اترنے سے زیادہ ہوا میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

احتیاط کے ساتھ عصری مطالبات کا حق ادا کریں

البتہ اب جس نئے عہد و عصر میں "دعوت الی الخیر" اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے قرآنی و اسلامی نظم و نظام کو از سرِ نو اٹھانا اور کھڑا کرنا ہے اس کے نئے تقاضوں اور عصری مطالبوں کا اس حزم و احتیاط کے ساتھ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ تجدید کے مطالبات کا حق بھی ادا ہو اور تجدد کی بے راہ رویوں سے حفاظت بھی ہو۔ ان ہی دونوں باتوں کے پیش نظر تجدید تعلیم و تبلیغ میں مجدد وقت کا ہاتھ پکڑ کر کچھ تجاویز عرض کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ اس "کودک نادان" کی ان میں بھی بعض باتیں قابلِ توجہ ہوں گی۔

نظامِ دعوت و تبلیغ مدون ہو جانا چاہئے

ہمارے ائمہ دین نے کتاب و سنت اور اپنے علم و فراست تقویٰ و طہارت کی روشنی میں جس طرح دینی تعلیمات کے ہر شعبہ کے کلیات و

جزئیات کو مستنبط و مرتب فرما دیا ہے' اسی طرح دعوتِ خیر یا تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول و فروع کو بھی بڑی کاوش و دانش سے منضبط فرما دیا ہے۔ ہمارا کام زیادہ تر بس ان کو بدلے ہوئے عصری ظروف و دواعی کے قالب میں ڈھال لینا ہے۔ خاص طور پر حکمت و فراست اور تدبیر و تدبر سے کام لینے کی ضرورت معروف و منکر کے امر و نہی کی تجدید و ترویج میں ہے کہ یہ امت کے عوام کیا خواص و علما تک میں کم و بیش بالکلیہ متروک ہو جانے کی بدولت' اس کے اصول و آداب سب ہی فراموش ہو چکے ہیں۔ شاذ و نادر کوئی اس فرض کو گھر یا باہر ادا بھی کرتا ہے تو دیکھا کہ اکثر اندھے کی لاٹھی چلانے لگتا ہے حالانکہ اسلام کی بڑی خصوصیت اعتدال و توازن ہے۔ اس کے تمام اوامر و نواہی ہی تعدیلی حدود و قیود سے مقید ہیں۔ ایک احیاء العلوم ہی میں معروف و منکر کے امر و نہی کے ان حدود و قیود اصول و آداب کے تمام اطراف و جوانب پر بڑی سیر حاصل بحث موجود ہے۔ ذرا صحیح ذوقِ تجدید سے کام لے کر ان کو جدید احوال و ظروف کے مطابق بنا لینا ہے۔

عملی رہنمائی کے لئے اصل الاصول اس باب میں ایک ہی بات ہے۔ حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ کے ہاں اس پر خاص زور تھا کہ معاصی و منکرات کی نوعیت تمام تر دینی و اخلاقی و روحانی بیماریوں کی ہے لہٰذا ان کے بیمار کے ساتھ معاملہ بالکل وہی کرنا چاہیئے جو جسمانی بیماریوں کے بیمار کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی **معاصی سے نفرت اور عاصی پر شفقت**۔ جسمانی بیماری میں ہمارا معاملہ اپنوں پرایوں'

دوستوں عزیزوں چھوٹوں بڑوں سے کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ بیمار پر تو ہم کو ترس و رحم ہی آتا ہے لیکن بیماری کو دور کرنے میں حسب تعلق اپنی والی کوئی جانی و مالی، ترغیبی و ترہیبی سعی و تدبیر اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ نہ بیمار کی کسی بیجا خوشی و خواہش یا رعایت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ کڑوی سے کڑوی دوا، بڑے سے بڑے آپریشن، سخت سے سخت پرہیز سب ہی کچھ کرنا کرانا پڑتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ مستقل و دیرپا تکلیف یا ہلاکت سے بچانے کے لئے یہ ظاہری سختیاں بھی عین ہمدردی و خیر خواہی ہی یا شفقت ہی شفقت ہوتی ہیں۔

پھر آخرت کی زندگی سے بڑھ کر کون زندگی مستقل و دائمی ہوگی اور اس کی ہلاکت و بربادی سے بڑھ کر کون سی ہلاکت و بربادی ہوگی۔ آخرت پر اگر ایمان و یقین ہے، تو وہاں کی چھوٹی سی چھوٹی راحت و مصیبت کو یہاں کی بڑی سے بڑی راحت و مصیبت کے مقابلے میں بھی نظر انداز کرنا کیسے جائز ہوگا۔ اسی طرح موقع و مناسبت اور ذمہ داری و مسئولیت کے لحاظ سے جہاں نرمی و ترغیب سے کام نہ چلے منکرات کو روکنے کے لئے اختیاری جبر و سختی کو بھی کام میں لینا جائز ہی نہیں واجب ہوگا۔ حدیث میں تغییر بالید سے اسی کو تعبیر فرمایا گیا ہے کہ جہاں بس چلے منکر کو ہاتھ یا قوت سے مٹانا بھی فرض ہے۔

البتہ اس جبر و سختی تخویف و ترہیب کا بھی رنگ وہی ہمدردانہ و خیر خواہانہ ہو جو ایک مہربان معالج یا تیماردار کا بیمار کے ساتھ حسب ضرورت دوا و علاج اور پرہیز کے معاملے میں سختی و زبردستی کا ہوتا ہے، نہ کہ نفرت و حقارت یا بے ضرورت غصہ و

گرمی کا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جبر و زبردستی میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ تیسرے خود امر و نہی کرنے والے کو جانی و مالی ایسا شدید ضرر نہ پہنچے جس کو وہ صبر کے ساتھ برداشت یا مدافعت کی قوت نہ رکھتا ہو۔ لیکن اگر برداشت کر سکتا ہو تو سبحان اللہ عین عزیمت و جہاد ہے! اسی لئے حدیث میں منکر کو روکنے کے لئے حسب استطاعت و برداشت تین درجات رکھے گئے ہیں، ایک ہاتھ یا قوت سے جہاں اس کی قوت ہو۔ دوسرا زبان سے۔ اگر اتنے کی بھی ہمت یا موقع نہ ہو تو آخری درجہ جس کو ایمان کا کمزور سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے یہ ہے کہ کم از کم دل سے برا جانے جس کا لازمہ یہ ہے کہ خود کو جہاں تک ہو سکے دور و نفور رکھے۔

گو ہمارے اندر اب اتنی دینی حمیت و حرارت ہی کتنوں میں ہے کہ دین و ایمان کے معاملات یا معاصی و منکرات پر غصہ آتا ہو۔ دل سے برا جاننے والے اور برائیوں سے دور و نفور یا ان میں شرکت سے گریز کرنے والے بھی خال خال ہی ہوں گے۔ تاہم تھوڑے بہت ہر طرح ہی کے لوگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اوپر معروف و منکر کے امر و نہی کی دینی اہمیت پر جو زور دیا گیا ہے اس سے متاثر ہو کر کوئی بندۂ خدا الٹی سیدھی لاٹھی چلانے لگے اس لئے احتیاطاً چند اصولی قیود و شرائط بھی آخر میں عرض کر دیئے گئے۔ باقی جس طرح حضرات علما کا کام دعوتِ خیر کے سلسلے میں ایسے احکام کی تعلیم و تبلیغ ہے جن سے روزمرہ کی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، اسی طرح معروف و منکر کے نفس امر و نہی کے حکم کی تعلیم و تبلیغ کے ساتھ اس کے وجوب و استحباب اور جواز کے ضروری ضروری

احکام یا قیود و شرائط بتلاتے رہنا بھی ضروری ہے۔ اور پڑھے لکھوں کو مناسب کتابوں کے نام۔

باقی بار بار عرض کرنے کی اصل بات ایک ہی ہے کہ جب تک ایمان و عمل صالح کے تمام ابواب ـــــ عقائد و عبادات، دیانات و معاملات، اخلاق و معاشرات ـــــ سب ہی کے معروفات و منکرات کے امر و نہی کو از سر نو امت میں زندہ و رائج نہ کیا جائے گا، اس وقت تک اجتماعی طور پر نہ کوئی چھوٹی بڑی مسلمان آبادی اسلامی یا اسلامی سماج اور سوسائٹی بنے گی اور نہ اسلامی زندگی کے اجتماعی ثمرات و برکات رونما ہوں گے۔ نہ دینی و دنیوی، نہ معاشی نہ معادی، نہ سیاسی نہ سماجی۔ نماز روزہ سے بڑھ کر دین اور دینی زندگی پیدا کرنے والی کون سی چیز ہوگی۔ نماز کی خاص خصوصیت و خاصیت یہی تو بتائی گئی ہے کہ وہ فواحش و منکرات سے روک دیتی ہے ـــــ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) اسی طرح روزہ کی خاص غرض و غایت تقویٰ یا پرہیزگاری و پاکبازی کی زندگی پیدا کرنا ہی تو ہے ـــــ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ـــــ لیکن کیا اکسیر سے اکسیر دوا بھی اپنی خاصیت و اثر کو پوری طرح ظاہر کر سکتی ہے، جب تک ایک طرف اس کے اجزا اور ترکیب استعمال وغیرہ پوری طرح درست نہ ہوں اور دوسری طرف اس کے اثر و خاصیت کو خفیف و زائل کرنے والی بد پرہیزیوں سے پوری طرح پرہیز یا بچنے بچانے کا اہتمام نہ ہو۔

عام مسجدوں کو جانے دیں، عام خانقاہوں اور مدرسوں کی مساجد تک میں

جا کر دیکھ سکتے ہیں کہ حضورِ قلب یا خشوع و خضوع کا ذکر نہیں، معمولی تعدیل ارکان تک کی کوتاہیوں پر بھی کوئی اتنا کہنے والا مشکل سے ملے گا کہ میاں تمہاری نماز یہ ٹھیک نہیں ہوئی، ٹھیک طریقے سے پڑھا کرو۔ اسی طرح روزہ کو لوگ طرح طرح کے منکرات سے پیٹ کا خالی فاقہ بناتے رہتے ہیں۔ لیکن علما و مشائخ کی مجلسوں میں بھی ان پر نکیر کا کوئی لفظ کسی زبان سے کم ہی نکلتا ہوگا۔ اور ایسی مثالوں کی تو کہتے شرم آتی ہے ـــــ ایسے علما و مشائخ میں بھی کمی نہیں، جو تہجد و اشراق اور ایام بیض وغیرہ کے نفلی صوم و صلوٰۃ کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ معاملات و اخلاق اور معاشرت کی بہتیری موٹی موٹی بد پرہیزیوں تک سے پرہیز نہیں فرماتے۔ قدرۃً عام طور سے نہ پیر خانقاہوں میں مریدوں کو ان کی ایمان و عمل صالح کی کوتاہیوں پر روک ٹوک کرتے دیکھے جاتے ہیں نہ دینی مدرسوں کے استاد شاگردوں کو تفسیر و حدیث اور فقہ سب کے سبق پڑھا دینے کے علاوہ ان پر عمل کی تاکید و نگرانی کرتے پائے جاتے ہیں

ایک اور بات مسلمانوں کے خالص دینی اداروں، مدرسوں یا جماعتوں کا بھی کسی ایک اجتماعی نظام پر مجتمع ہونا تو بظاہر اب ان ہونی بات ہے۔ تاہم دین کی سب سے بڑی سہولت اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے کسی فرد و جماعت کو بھی خود اپنی استطاعت و وسعت سے زیادہ کا مکلف و مسئول نہیں ٹھہرایا ہے۔ لیکن اپنی وسعت و اختیار کی حد تک ہم مسئولیت و مواخذہ سے چھوٹ بھی

نہیں سکتے۔ جس فرد یا جماعت سے یہی دامے درمے، قدمے سخنے، جس طرح اور جس قدر بھی مسلمانوں کی دینی اصلاح کی دین ہی کے احکام و مطالبات کے مطابق جو سعی و تدبیر اپنی والی ہوسکے اس میں کوتاہی بہرحال بڑی مجرمانہ کوتاہی ہوگی۔ سوال صرف مقدور بھر سعی و تدبیر ہی کا ہوگا۔

لہٰذا جن افراد یا جس جماعت، ادارہ و مدرسہ کے اہل بست و کشاد کی سمجھ میں معروضاتِ بالا کچھ آجائیں ان کی طرف عملی قدم اٹھانے کے لئے اپنی ذات یا جماعت کی بساط تک کسی مزید انتظار و عذر کی گنجائش قطعاً نہیں۔ راقم عاجز کی سمجھ میں دینی مدارس کے ذمہ دار حضرات کو خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ فرمانا آسان بھی ہے اور مقدم بھی۔ اور ان ہی کی توجہ انشاء اللہ مستقبل کے لئے مستقل و مستحکم بنیاد کا کام دے گی۔ امت کے دینی راعی و نگہبان یا رکھوالے ڈھلنے ان مدرسوں ہی میں ہیں، ان مدرسوں کا قالب اگر درست ہو جائے یعنی اس میں ڈھلنے والے اگر سالانہ دس بیس فی صد بھی "منکم امۃ" والے مطالبات کو پورا کرنے والے ہوں جو "دعوۃ الی الخیر" اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی لگن رکھتے ہوں اور ملک میں پھیلتے رہیں تو انشاء اللہ اصلاح کی یہ بالکل فطری راہ اپنوں پرایوں، سب میں دین کی حفاظت و اشاعت دونوں کے لئے کافی و کارگر ہوگی۔

اول و آخر یہ کہ نیت تمام تر اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی فلاح ہو، اپنی بھی دوسروں کی بھی۔ دنیا براہِ راست و بالذات مطمح نظر نہ ہو۔ اعتماد کی نظر بھی

دعوتی اسباب وتدابیر پر نہیں، مسبب الاسباب پر ہو۔ ورنہ بالعموم دیکھا جاتا ہے کہ دین، ودعوت کے مخلص خادم بھی نفس تدابیر میں اتنا الجھ جاتے ہیں کہ حدود کا لحاظ نہیں رہتا۔ خدا ورسول کی رضا وناراضی پسند وناپسند یا احکام وشریعت کا لحاظ واہتمام مقاصد ہی میں نہیں وسائل واسباب میں بھی لازم ہے۔

جماعت سازیوں، انجمن بازیوں یا طرح طرح کے اداروں کی کثرت، علیٰ ہذا تمدن وتہذیب، علم وادب، ثقافت وانسانیت، سیاست ومعیشت، جمہوریت وحریت وغیرہ کی گوناگوں بے شمار الگ الگ دعوتوں یا تحریکوں کا ایک بڑا مضر اثر معاشرہ میں فکر وعمل دونوں کے حق میں شدید انتشار وپراگندگی کا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ہر جماعت وتحریک والے نفسیاتی طور پر حق کو کم وبیش اپنے ہی دائرہ میں دائر جان کر تعصب و تنگ نظری کے مفاسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف آج کل کی سی مصنوعی تحریکوں یا جماعتوں میں ان کے مقاصد کے ساتھ فقط اخلاص ووفاداری رکھنے والوں ہی کا جمع ہونا عملاً ناممکن ہوتا ہے بلکہ جیسے جیسے کوئی جماعت پھیلتی جاتی ہے غیر مخلصین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ یہ جماعت کے اندر داخل ہوتے ہیں لازماً ان کے اثر سے پوری جماعت کی للّٰہیت وعملیت متاثر ہوتی ہے۔

یہ اجمالاً عام ایسے مفاسد ہیں، جن سے جدید طرز کی کسی صحیح سے صحیح مقصد پر مبنی جماعت اور تحریک کا محفوظ رہنا بھی عملاً ناممکن ہے۔ انبیائی تاریخ میں ایسی مصنوعی رنگ کی جماعت سازیوں کا قطعاً کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اگر ان میں خیر کا پہلو غالب ہوتا

تو یہ کوئی ایسی دور کی کوڑی یا دقیق بات نہ تھی جس کو انبیا جیسی ایمانی فراست پا نہ لیتی اور جاہلیت جدیدہ کی فرنگی رہنمائی کا انتظار کرنا پڑتا۔ یا اگر ایسا ہی فوق الفہم معاملہ ہوتا ساتھ ہی دعوتی و اصلاحی کاموں کے لئے مفید و موثر یا شر کے مقابلے میں خیر کا کم از کم غالب عنصر رکھنے والا تو خود وحی کے ذریعہ صراحتہً یا اشارۃً کوئی نہ کوئی رہنمائی ضرور ہو جاتی۔

باقی اسلامی توحیدی مرکزیت کے حق میں تو یہ فرنگی جماعت سازیوں کی وبا صرف زہریلی ہی زہریلی ہے۔ مسلمان کے لئے تو دراصل ایک ہی دعوت، ایک ہی تحریک "توحید" کا ایک ہی نعرہ ہے۔ اس کے بعد اس کا سارا کام اسی توحیدی ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی زندگی اپنے اختیار و مقدور بھر برپا و راسخ کرتے رہنا۔ تہذیب و تمدن، قومیت و وطنیت، جمہوریت و اشتمالیت (سوشلزم) یا اشتراکیت اور آرٹ و کلچر وغیرہ کے نئے نئے معبودوں کا اس عنوان و اہتمام سے نام لینا بھی کہ یہ زندگی کے کوئی خاص مقاصد ہیں، مومن کو مشرک بنانے والی نادان کی دوستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کی بیدار و پائدار زندگی اپنی عین حقیقت و خاصیت ہی کی رو سے زندگی کے باقی تمام دوسرے شعبوں کو صالح بنا کر رہے گی۔

٭

عملی اشارات

قصہ کوتاہ :-

۱:- انسان کو کائنات و مخلوقات میں پیدائشی و خلقی طور پر احسنِ تقویم کا جو سب سے اونچا مقام و منصب عطا ہوا ہے اس کے بقا و تحفظ کی ذمہ داری تمام تر "ایمان و عمل صالح" کی اپنی اختیاری زندگی پر ڈالی گئی ہے۔ ورنہ پھر اسی انسان کی جگہ ساری پستیوں سے پست ـــ اسفل السافلین ـــ تحت الثریٰ[لہ] ہے۔ انفرادی و اجتماعی ایمان و عمل صالح کے بغیر اس انتہائی گراوٹ یا "اسفلیت کے زیان و خسران سے" انسان و انسانیت کو نہ اس کی عقل و دانش بچا سکتی ہے، نہ علوم و فنون، نہ تہذیب و تمدن، نہ سائنسی اکتشافات و ایجادات، نہ حریت و حکومت اور نہ جمہوریت و اشتراکیت، نہ منصوبہ بازیاں اور سوشلزم۔

۲:- البتہ ایمان و عمل صالح کی اختیاری زندگی کو اختیار کرنے اور اس پر آسانی سے چلنے چلانے کے لئے انسان کی "احسنِ تقویم" والی فطرت ہی کے مناسب "تواصی بالحق" کا نہایت کارگر تدبیری نظام بھی عطا فرما دیا گیا ہے۔ یعنی ایمان اور عمل صالح کی

لہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین الا الذین امنوا وعملوا الصالحات۔

صحیح یا "برحق" تعلیمات و احکام کی تفہیم و تاکید اور فہمائش کا انفرادی، قومی و بین اقوامی ہمہ گیر نظام۔ اس کے ہم آہنگ دو جز ہیں :-

(۱) ایک تو حق و خیر یا سچائی اور بھلائی کی باتوں کی نفس دعوت و تبلیغ، اپنے علم و بساط کے مطابق لوگوں تک اُن کو پہنچانا اور ان پر عمل کی طرف بلانا۔ اس کا نام خصوصیت سے "دعوتِ خیر" ہے۔

(۲) دوسرے اپنے اپنے محل و منصب، وسعت و قوت کے موافق ہر بھلائی برائی کا امر و نہی روک ٹوک، بالفاظِ دیگر ہر برائی سے ہر اپنے پرائے کو مقدور بھر روکتے اور بھلائی پر عمل کراتے رہنا تاکہ بھلائی معاشرہ میں خوب جانی پہچانی (معروف) بن جائے اور برائی لوگوں میں نفرت و حقارت یا رد و انکار کی چیز (منکر) بن جائے۔ حتیٰ کہ لوگوں کو اس کے علانیہ ارتکاب یا اس پر اصرار کی ہمت نہ رہے۔ یہی حقیقت "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی ہے۔

انفرادی "آمنوا و عملوا الصالحات" کے ساتھ تواصی بالحق کی اصطلاح "دعوت الی الخیر" اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو جامع ہے۔ اور عملاً دونوں زیادہ تر ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور چلنا چاہئے۔

۳۔ بڑا سوال یہ ہے کہ عوام میں حق و خیر کا یہ علم یا معروف و منکر پر یہ امر و نہی کیسے پیدا اور رائج ہو۔ جواب جیسا کہ بار بار دہرایا جا چکا ایک ہی ہے کہ ایک خاص پوری جماعت کا خاص فرض و فریضہ یہی ہو کہ ایک طرف وہ خود لوگوں میں حق و خیر کی

دعوت و تبلیغ اور معروف و منکر کا ہاتھ زبان یا دل سے جس جس طرح جس حد تک ممکن ہو امر و نہی کرتی رہے اور دوسری طرف دوسروں کو بھی بتلاتی رہے کہ تمہارے لئے حق و خیر یا برائی بھلائی کا خود جان مان لینا اور عمل کر لینا کافی نہیں۔ بلکہ اپنی واقفیت و حیثیت کے مطابق اپنے اپنے بال بچوں رشتہ داروں دوستوں، پڑوسیوں ملنے جلنے والوں کو واقف کرانے اور مقدور بھر عمل کراتے رہنا بھی دینی فریضہ ہے۔

۴۔ اس طرح قال و حال زبان و عمل کی جدوجہد سے جب کسی ملک و معاشرہ میں معروف و معتدبہ درجہ میں اپنی معروفیت و عزت یا پسندیدگی کی جگہ حاصل کر لے گا اور منکر انکار و نفرت یا ناپسندیدگی و بیزاری کا سزاوار بن جائے گا تو لازماً اس کے افراد میں نہ معروف کا ترک عام و آسان ہو گا نہ منکر کا ارتکاب۔ یہی معاشرہ صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ ہو گا جس سے غیر مسلموں کا مسلسل و یکسر غیر متاثر رہنا بھی غیر ممکن ہی ہو گا۔ ایسا ہی معاشرہ یا امت "خیر امۃ" ہو کر دوسری امتوں قوموں یا پوری انسانیت (الناس) کے حق میں معروف و منکر کے امر و نہی کا حق ادا کر سکے گی۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ؕ

۵۔ پھر یہی خیر امت بہ حیثیت امت اپنے ایمان و عمل صالح کی طاقت سے دنیا کی بھی ہر طرح کی اجتماعی ـــــ سیاسی و معاشی اور سماجی ـــــ خیر و برکت یہاں تک کہ اقتدار حکومت جو کسی قوم کی سب سے بڑی قومی رفعت و عظمت جانی جاتی ہے، اس کا قطعی و حتمی وعدہ بھی اسی ایمان و عمل صالح ہی کی زندگی سے پورا ہو گا۔

كما قال الله تعالىٰ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ...

۶۔ لیکن اس خلافتی اقتدار و حکومت کی غرض بھی جاہ و مال کی شخصی یا قومی سامراجی یا اشتراکی لوٹ کھسوٹ قطعاً نہیں، بلکہ ایک طرف وہی خود اپنی ایمان و عمل صالح کی زندگی کی تقویت اور دوسری طرف معروف و منکر کے ذریعہ دنیا میں بھلائی یا خیر و صلاح کو پھیلانا اور برائی یا شر و فساد کا مٹانا۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔

بیسیوں صفحے کے معروضاتِ بالا اور ان کی طرح طرح سے بار بار کی تاکید و تکرار کا ماحصل و مدعا دو لفظوں میں اتنا ہی ہے کہ خود مسلمانوں کی کیا پوری انسانیت کی دین و دنیا کی فلاح و نجات کا دار و مدار تمام تر خود مسلمانوں کا بہ حیثیت امت ایمان و صلاح کی اسلامی زندگی اختیار کرنا اور معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ اس کو ساری دنیا میں برپا کر کے کفر و فساد کی زندگی کو مٹانا ہے۔ لہٰذا انسان کے دینی و دنیوی ہر طرح کے زیان و خسران سے بچنے بچانے کی صحیح سیدھی راہ بالآخر ایک ہی ٹھہرتی ہے — خود مسلمانوں کا مسلمان بننا بنانا — یہی دو لفظی مطالبہ مسلمانوں سے خود اسلام کی کتاب کا بھی ہے کہ "مسلمانو! بس مسلمان ہو جاؤ" يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا۔ لیکن خود مسلمان پہلے مسلمان کیونکر بنیں بنائیں؟

جواب وہی ایک ہی ہے کہ ایمان و عمل صالح کی انفرادی و اجتماعی، ظاہری و باطنی زندگی پیدا کریں، ایسی زندگی پیدا کرنے کی تدبیر بھی فقط وہی ایک ہی ہے کہ

"دعوتِ خیر" اور معروف و منکر کے امر و نہی کے لئے خود کتابِ اسلام کے بتلائے ہوئے نظامِ ہدایت کو ازسرِ نو زندہ و برپا کریں۔

اس تدبیر کا پہلا قدم بھی وہی ایک ہی ہے کہ امت میں جو جماعت یا "امت در امت" (منکم امۃ) خاص طور پر "داعی الی الخیر" اور "آمر بالمعروف و ناہی عن المنکر" کے منصب کے لئے موزوں ہے، وہ اپنے اس خصوصی مقام و منصب کو پہچانے اور اس کے حقوق و فرائض کو عملاً ادا کرے۔

ظاہر ہے یہ خصوصی جماعت وہی ہو سکتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ خیر اور معروف و منکر کے اصول و فروع کا اتنا معتد بہ علم حاصل کرتی اور رکھتی ہے کہ ایمان و عمل صالح کے ضروری ضروری احکام کی "دعوت خیر" کے ذریعہ تعلیم اور معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ ان کی عملی ترویج و تربیت کر سکتی ہو۔

الحمد للہ کہ نفس علم کی حد تک اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہمارے چھوٹے بڑے سیکڑوں دینی دار العلوم ایمان و عمل صالح کے علوم دین کی نفس تعلیم کا حق بقدر ضرورت ادا کر رہے ہیں اور ہزاروں علمائے دین فراغ و تکمیل کی سندیں لے کر ان سے نکلتے رہتے ہیں۔ کمی ان میں بالعموم دو ہی باتوں کی ہوتی ہے، ایک ایمان اور اعمالِ صالحہ میں معتد بہ رسوخ و استقامت کی، دوسرے اپنے دعوتی خصوصی مقام و منصب کے شعور و احساس کی۔ خیر یا دین کے جس علم کو انھوں نے بھرپور جوانی تک حاصل کیا ہے اسی کی "دعوت" اور اسی کی معروف و منکر کے امر و نہی کے ذریعہ درس میں

عملی ترویج و اشاعت مرتے دم تک زندگی کے ہر حال و ماحول میں ان کا واحد منصبی فریضہ ہے
ایمان ان کا بالعموم "لما یدخل الایمان فی قلوبکم" کے درجہ تک رہتا ہے، اس کو
شعوری طور پر داخل قلب یا راسخ بنانے کی تربیت مقدم ہے۔ یعنی دینی تعلیم کے ساتھ
ساتھ اس کے قلبی و قالبی عملی مطالبات کی نگرانی۔ جس قدر آدمی اپنے کسی علم و خیال یا
اصول پر عمل کرتا ہے، اسی قدر وہ راسخ یا پختہ و پائدار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے دینی
دارالعلوموں میں معمولی وہ بھی بے جان نماز روزہ کے علاوہ اخلاق و معاملات اور
معاشرت کے ان اعمالِ صالحہ پر توجہ نہ ہونے ہی کے برابر فرمائی جاتی ہے، جن کا
تعلق بندوں کے باہمی حقوق و فرائض سے ہوتا ہے۔ حالانکہ دراصل ہمارے ایمان و
ایمانیات کی کسوٹی یہی حقوق و فرائض ہیں۔ مثلاً اگر ہم آخرت کی ابدی جزا و سزا،
جنت و جہنم پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، پھر بھی دنیوی جاہ و مال وغیرہ کے فانی سود و زیاں
کے مقابلہ میں اس ابدی نفع و ضرر کی پرواہ نہیں کرتے، تو ہمارے ایسے ایمان کی حقیقت
ایک بے دلیل دعوے سے زیادہ نہیں رہتی۔ اپنوں پرایوں کسی کی نظر میں بھی نرے زبانی
دعوے کا محض کلامیاتی انشا پردازیوں یا انشا گفتاریوں سے دل میں کتنا وزن پیدا ہوگا
معیار یہ ہے کہ جب دنیا و آخرت کے کسی نفع و ضرر کا مقابلہ ہو تو ہم بلا اضطراری
صورتوں کے آخرت کو دنیا پر قربان کرنے یعنی خدا اور رسول کی نافرمانی و ناراضی خریدنے
پر آمادہ نہ ہوں۔ سچ پوچھیے تو دین کو دنیا پر قربان کرتے کراتے رہنے کی ہماری حرصی
دنیا طلبی ہی ہماری تمام دینی بیماریوں ہی کی نہیں خود دنیا کی ساری بربادیوں کی بھی

جڑ ہے۔ اسی کی بدولت ہم ایمان و عمل صالح والی زندگی کے ان انفرادی و اجتماعی معاشی و سیاسی ثمرات و برکات کو بھی جو اس دنیا کے حق میں منصوص و موعود ہیں کھوتے رہتے ہیں[1]۔

دنیا نام ہے اصل میں دو ہی چیزوں جاہ و مال کا۔ ان ہی کے ناجائز و ناواجب یا حرصی مطالبہ و مقابلہ سے اخلاقی، معاملاتی اور معاشرتی سب ہی طرح کے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں۔ دینی درس گاہوں کی تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ اس سرچشمۂ مفاسد پر نگاہ رکھنا اہم و اقدم ہے۔ ان سے فارغ ہو کر باہر آنے والے ہمارے علماء کی بیشتر کمزوریوں کی بنیاد حبِ جاہ و مال کے جذبات ہوتے ہیں، اور یہی ان کو "لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی اپنی انبیائی سطح سے قدم قدم پر گراتے رہے ہیں۔ اونچے اونچے مشاہیر تک میں شاذ و نادر ہی کوئی ان گراوٹوں سے پاک ملے گا۔

اس لئے دینی تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کو ان میں تعلیم پانے والوں کی عام اخلاقی و عملی تربیت کے ساتھ اس پہلو پر بہت خاص توجہ فرمانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ دنیاوی تعلیم کے اسکولوں کالجوں کی نقالی میں ان ہی کی طرح محض کتابی امتحان

---

[1] من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ۔ تقویٰ نام ہی ہے ایمان و عمل صالح کی جامع زندگی کا اور جو فرمایا جاعت خدا پر بھروسہ کر کے ایسی زندگی کو اپنائے گا خدا کا وعدہ ہے کہ اس کے ہر قسم کے معاشی و غیر معاشی مسائل و مشکلات کو بے شان و گمان راہوں سے حل فرماتا رہے گا اور یہی کثیر آیات میں انفرادی و اجتماعی ہر طرح کی دنیوی کامیابیوں کا راز ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی ہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔

اور اس کے پاس فیل کے کچھ مقررہ نمبر کو جو الٹی سیدھی کسی طرح حاصل کرلے، اس کے ہاتھ میں عالم و فاضل کی سند پکڑا دینا دینی مدرسوں کی بڑی الٹی مہلک راہ اور ان کے ذمہ داروں کے حق میں بڑے مواخذہ کی بات ہے۔ امت کے تھانوی حکیم و مصلح نے تو اخلاقی و عملی معتدبہ اصلاح کے بغیر اس طرح عطائے سند یا دستار بندی کو صریح خیانت اور جھوٹی شہادت قرار دیا ہے[1]۔ کیونکہ یہ سند مدرسہ والوں کی طرف سے دراصل اس بات کی سند و شہادت ہوتی ہے کہ یہ مسلمانوں کے مقتدا ہونے کے لائق ہیں۔ وہ ان کے علم و عمل اخلاق و معاملات پر بھروسہ کرکے ان کی پیروی کریں۔

اخلاقی و عملی تربیت کے لئے ایک اور بڑی عملی و مفید ساتھ ہی آسان تدبیر بھی حضراتِ مدارس کے لئے قابلِ توجہ ہے۔ بہت سے دینی مدرسوں میں طلباء و اساتذہ کی تعداد سیکڑوں تک جاتی ہے۔ ان کی ضروریات کا ایک ذخیرہ (اسٹور) اگر دوکان کی صورت میں خود مدرسہ کے اندر مدرسہ ہی کے انتظام میں ہو جس میں باری باری خود طالب علموں سے کام لیا جائے، تو نہ صرف ان میں لین دین میں طفیفی مواقع کی اصلاح سے ان کی عام امانتی و دیانتی بلکہ ساتھ ساتھ کاروباری تربیت بھی ہوگی۔ اس دوکان کی نوعیت طلبہ و اساتذہ کے بقدر استطاعت حصوں پر مبنی مشترک سرمایہ کے امداد باہمی کے سے اسٹور کی ہو۔ جس کی وجہ سے ہر ایک کی دلچسپی اس میں ذاتی و شخصی بھی ہوگی۔

---

[1] اصلاح الرسوم۔ ص

راقم ناکارہ کے دل و دماغ میں ایسی کتنی بالکل آسان عملی باتیں بھری پڑی ہیں مگر خود عملاً اپاہج ہونے کی بدولت شیخ چلی کی اسکیمیں ہو کر رہ گئیں ! "داشتہ آید بکار" کی طرح شاید "نوشتہ آید بکار" پر کسی صاحب عمل کی نظر اس اشارہ سے پڑ جائے۔

غرض مسلمانوں کو مسلمان بننے بنانے یا اسلامی امت و معاشرہ کو اسلامی خطوط پر از سر نو تعمیر کرنے کے لئے سب سے پہلے "منکم امۃ" والے معماروں کو صحیح معمار بنانے کی فکر ناگزیر ہے۔ ورنہ ہر تعمیر تخریب ہی کے نتائج زیادہ پیدا کرتی رہے گی جیسا کہ صدیوں سے کر رہی ہے۔ پھر انشاء اللہ ان معماروں یا علماء حق کی ذرا مستحکم تنظیم ہر ملک کے معاشرہ کے مسلمانوں کو —— خواہ وہ مسلمان حکومت کے باشندے ہوں یا غیر مسلمان کے، اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں —— مسلمان بننے بنانے کا حق ادا کر سکے گی۔ اور مسلمانوں کا کماً و کیفاً کسی معتد بہ درجہ میں ایمان و عمل صالح والی اسلامی زندگی اختیار کر لینا ہی بجائے خود ایمانی و تدبیری دونوں رُخوں سے ان کے دین و دنیا کے تمام مسائل و مشکلات کا حل ہو گا۔ ایمانی تو اس لئے کہ دین و دنیا کی —— جیسا کہ بار بار عرض کیا جا چکا —— فلاح و نجات، صلاح و سعادت کا خدائی حتمی وعدہ ایمان و عمل صالح کی توأم جامع زندگی ہی پر ہے۔ تدبیری اس لئے کہ عقلی طور پر بھی دیکھا جائے تو دنیا کے سارے معاشی[1] و معاشرتی سیاسی و تمدنی، قومی و بین اقوامی فسادات زیادہ تر

---

[1] سب سے زیادہ آجکل معاشی یا غریبی و بے کاری وغیرہ کے مسائل ہی نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے ان کے متعلق اسلام کی متوازن و مستقیم راہ پر "تجدید معاشیات" میں کچھ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

افراط و تفریط کی گمراہیوں کا خمیازہ ہیں اور انسانی زندگی کی اسلامی متوازن و مستقیم راہ بجائے خود بالخاصہ اسی طرح دنیاوی زندگی کے ہر شعبہ کی صحت و سلامتی کی ضامن ہے جس طرح متوازن غذا جسمانی صحت و سلامتی کی۔ کیسی عجیب و غریب ایمانی فراست و حکیمانہ نظرامت کے تھانوی حکیمؒ کی تھی کہ جہاں خالص ایمانی وثوق و یقین کے ساتھ یہ ارشاد ہے کہ "خدا کی ذات پر بھروسہ کرکے قسم کھاتا ہوں کہ اگر سب مسلمان احکامِ حق پر عمل پیرا ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کی سعی و کوشش میں لگ جائیں تو چند روز میں انشاء اللہ کایا پلٹ ہو جائے"۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ چیلنج ہے کہ وہ خدا و رسولؐ پر ایمان یا ان کی رضا و اتباع کی نیت سے نہ سہی، دوسری دنیاوی تدبیروں کی طرح محض دنیا کی:-

"ایک تدبیر ہی کا درجہ سمجھ کر کر دیکھیں۔ آخر اور بھی تدابیر کر رہے ہو، ایک یہ بھی سہی . . . . (خصوصاً) جب تمہاری ساختہ پرداختہ تدابیر میں اب تک کامیابی نہیں ہوئی تو اللہ و رسولؐ کی بتلائی ہوئی تدابیر کو تدابیر ہی کی نیت سے کرکے دیکھ لو۔ . . . . اگر کامیابی نہ ہو چھوڑ دینا . . . . لیکن کرکے دیکھو تو۔ کرنے سی پھانسی کیوں لگتی ہے، مرے کیوں جاتے ہو۔ بہت دنوں بتوں کی پرستش کرکے تجربہ کر لیا اب ذرا خدا کو بھی پوج کر دیکھ لو"۔[۱]

---

[۱] تجدید دین کامل۔ ص ۲۰۴ و ۲۰۵۔

اس از سرِ نو تعمیری تنظیم کا آغاز ہمارے دینی بڑے مدارس کے اکابر چاہیں تو آج ہی فرما سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے فارغ التحصیل یا قریب بفراغت طلباء میں دو چار فی صد اب ایسے نکل آئیں گے جن کی اخلاقی و معاملاتی حالت نسبتہً بہتر ہو، خصوصاً جاہ و مال کے حرص سے مغلوب نہ ہوں۔ معاشی ضروریات میں بقدرِ ضرورت پر قانع ہوں یا رہ سکیں۔ اگر اتفاق سے متوکل یا خود مستغنی ہو تو کیا کہنا، ورنہ مدرسہ ہی کی طرف سے اس کا انتظام ہو، تاکہ جن لوگوں میں دعوت و اصلاح کا کام کرے ان سے قطعاً کسی طرح کی مالی و جانی خدمت کا طالب نہ ہو، نہ ہدیۃً کچھ قبول کرے۔ اس باب میں ضروری ہدایات کی تفصیل تجدیدِ تعلیم و تبلیغ میں کر دی گئی ہے۔

اب ایسے داعی و مصلح کے ذریعہ کام کی ابتدا مسلمانوں کے چاہے جتنے چھوٹے سے چھوٹے حلقہ یا آبادی سے ہو لیکن ہو ہمہ گیر کماً بھی اور کیفاً بھی یعنی نہ آبادی کا کوئی گھر اور فرد اس سے باہر رہے اور نہ اسلامی تعلیمات کو صرف کلمہ و نماز یا عبادات تک محدود رکھا جائے، بلکہ عقائد و عبادات کے فرائض و واجبات کی تعلیم و اصلاح کے ساتھ ساتھ ہی پورا زور اخلاق و معاملات اور معاشرت میں زیادہ سے زیادہ اسلامیت پیدا کرنے پر لگایا جائے۔ تاکہ اسلامی اعمال صالحہ والی زندگی کے نقد انقد فوائد اور برتری کا تجربہ اپنوں پرایوں مسلمان غیر مسلمان سب کو ہو۔ عقائد و ایمانیات دل اور باطن کی چیزیں ہیں، اور عبادات زیادہ تر اخروی و انفرادی نفع کی۔ اسلام و اسلامیت کے ظاہری و دنیوی ثمرات و برکات کا علانیہ ناقابلِ تردید مظاہرہ

جب ہی ہوگا کہ اسلامی عقائد و عبادات کی روح خدا و رسول کی خوشنودی و پسند اور آخرت کی فکر و رغبت قدم قدم پر مسلمانوں غیر مسلمانوں سب کے ساتھ ہمارے لین دین کے معاملات اور اخلاقی و معاشرتی تعلقات میں دن دوپہر گھر باہر بازار و دفتر ہر جگہ محسوس و متحرک نظر آئے۔

راستہ اس کا وہی ایک ہے "تواصی بالحق و بالصبر" یا معروف و منکر کے امر و نہی کی انفرادی ذمہ داریوں کا عملی شعور پیدا کرانا مثلاً ایک گاؤں یا محلہ مسلمانوں کی پانسو آبادی کا ہے جس میں گھروں کی تعداد سَو ہے پہلے ان گھروں کے سردھروں یا حدیث کی زبان میں راعی و نگرانوں کو ذہن نشین کرایا جائے کہ تمہاری مسلمان ہونے کی ذمہ داریاں نہ صرف کلمہ اور نماز روزہ کی عبادتوں پر ختم ہو جاتی ہیں اور نہ صرف اپنی شخصی ذات تک ان کی پابندی ہے۔ عبادات ہی کی طرح اور تعداد میں ان سے بہت زیادہ اخلاق و معاملات اور معاشرت کے اسلامی فرائض و واجبات ہیں جن کو خود ادا کرنے کے ساتھ اپنے اہل و عیال یا زیر نگرانوں سے ادا کرائے بغیر نہ دنیا میں اپنی دینی ذمہ داریوں سے ہم عہدہ برآ ہو سکتے ہیں نہ آخرت میں ان کی بازپرس سے۔ تم پر جس طرح اپنے زیر نگرانوں بال بچوں وغیرہ کی دنیوی چند روزہ زندگی کی آرام و راحت کے لئے کھانے کپڑے، بیماری آزاری کی فکر اور دیکھ بھال واجب ہے، اس سے ہزاروں درجہ زائد ان کی آخرت کی ابدی زندگی کے بناؤ بگاڑ کی نگرانی و خبرگیری بھی تمہاری عین دینی و اسلامی ذمہ داری ہے۔ ورنہ تم اُن کے اس سے بڑھ کر دشمن ہوگے

جیسے کوئی اپنی اولاد کی جوانی اور بڑھاپے کے مستقبل سے بے فکر ہو کر جوان ہونے تک اس کو خالی طفلانہ مشاغل یا کھیل کود میں لگا رہنے دے جس کی بدولت آگے چل کر زندگی بھر وہ بیکاری و فاقہ کشی کی مصیبت جھیلتی رہے۔

پھر جس طرح تم خود اپنی زندگی کے سارے دنیوی معاملات کو اسلام کی نگرانی میں دیئے بغیر خالی کلمہ و نماز سے سچے پکے مسلمان نہیں بن سکتے اسی طرح اپنے زیر نگرانوں کی بھی پوری زندگی کو اسلامی بنانے کی اپنی والی کوشش کے بغیر ان کی نگرانی کی جواب دہی سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور جس طرح ان کی دنیا کو ہر طرح بنانے اور اس کو ہر بگاڑ سے بچانے کے لئے تن من دھن کی کسی کوشش میں کوئی اپنی والی کسر نہیں اٹھا رکھتے اسی طرح بلکہ اس سے ہزاروں گنی بڑھ کر فکر و تدبیر ان کے دین کو بہتر سے بہتر بنانے اور چھوٹے بڑے بگاڑ سے بچانے کی، خصوصاً جب تک وہ تمہاری نگرانی میں ہیں تمام تر تمہاری ذمہ داری ہے۔

جب تک دینی و اسلامی ذمہ داری کے اس شعور و احساس کو بیدار و پائدار کر کے خود مسلمان گھروں کو مسلمان نہ بنایا جائے گا اس وقت تک نہ گھر سے باہر مسلمانوں میں اسلامی زندگی اپنے موثر و کارگر مظاہر کے ساتھ رونما ہو گی اور نہ خالی گھر کے باہر کے محض کتابی مکتبوں، مدرسوں اور کاغذی دفتروں کی خارجی کوششوں سے خارجی و ماحول کے دین دشمن زہریلے اثرات سے ان کا محفوظ رہنا الا ماشاء اللہ ممکن ہو گا۔ یہ نرے خارجی وقتی علاج ہیں جو نہ مرض کی گہرائی تک

جاتے ہیں نہ ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں پختہ اسلامیت نام کے اسلامی مکتبوں، مدرسوں، کتابوں، رسالوں، تقریروں، تحریروں گشتی دعوتوں وغیرہ "بیرون خانہ" تدبیروں سے اس وقت تک ہرگز ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ان کے ساتھ اور ان سے بہت زیادہ زور "درون در" یا گھر کی زندگی کو پختہ اسلامی بنانے کی فکر دل پر نہ ہو۔ پھر انشاءاللہ خارجی تدابیر بھی سونے میں سہاگے کا کام دیں گی۔ دین کے حق میں گھر کی بے دینی و بد دینی کی غیر اسلامی زندگی سے بڑھ کر خطرناک و مہلک باہر کا کوئی زہر نہیں۔ مہلک سے مہلک جراثیم کا حملہ کامیاب زیادہ تر ایسوں ہی پر ہوتا ہے جو مدافعت کی اندرونی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔

اس گھریلو زندگی کی از سر نو تعمیر میں بھی نماز روزہ کے فرائض و واجبات کے ساتھ ساتھ ہی سب سے زیادہ توجہ مال و جاہ کے معاملات پر ہو کہ واجبی حقوق کے سوا کوئی کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے کیا معنی پوری خوش دلی کے بغیر لینا گوارا نہ کرے۔ نہ بیوی میاں سے، نہ میاں بیوی سے، نہ بھائی بھائی سے نہ بیٹا باپ سے، نہ باپ بیٹے سے۔ اسی طرح ماں باپ کی اولاد پر، بڑے بھائی بہن کی چھوٹے بھائی بہن پر، بڑائی میں بجز اسلامی آداب معاشرت کے حقوق و خدمت کی رعایت کے جاہی جذبات کی پرورش نہ ہونے پائے۔ اور یہ حقیقت خوب ذہن نشین کی کرائی جاتی رہے کہ اسلامی معاشرت کی روح یہ ہے کہ بے سبب کسی انسان کیا کسی جانور کو بھی ہم سے ذرا سی بھی اذیت نہ پہنچے کسی ظلم و زیادتی کا انتقام جائز

بیشک ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ جائز حدود سے تجاوز نہ ہو، ورنہ عفو و درگزر اور اصلاح سے کام لے تو کیا کہنا۔[1]

گھر کے راعی یا نگراں کو دونوں باتوں کی نگرانی میں بھی کوتاہی نہ کرنی چاہیے نہ گھر کے افراد میں کسی کو کسی سے بلاوجہ کوئی چھوٹی سی چھوٹی تکلیف پہنچے اور اگر پہنچ جائے تو مظلوم کی طرف سے انتقام میں زیادتی نہ ہونے پائے۔ ورنہ تنبیہی و تادیبی ضرورت سے زیادہ خود نگراں کی اصل کوشش اپنے زیر نگرانوں میں عفو و اصلاح کی تربیت اور عادت پیدا کرنے کی ہو۔ مثلاً بھائیوں بہنوں میں آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا یا ناچاقی ہو تو ایک طرف جس کی زیادتی ثابت ہو اس کو تدارک اور عفو خواہی پر آمادہ کرے اور جس پر زیادتی ہوئی ہو اُس کو عفو و درگزر پر، اور دونوں کو "اصلحوا ذات بینکم" کی تعلیم کے مطابق اپنی طرف سے اصلاح میں پہل پر آمادہ کرے اور جو پہل کرے اس کی تحسین و تعریف سے ہمت افزائی ہو۔ اگر اس پر کوئی آمادہ نہ ہو تو پھر "اصلحوا بین اخویکم" کے حکم کے مطابق خود معاملہ کی تحقیق کر کرا کے ان میں انصاف و اصلاح جلد از جلد کرا دے۔

ورنہ ہوتا بالعموم یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دلوں میں میل پیدا ہوتے ہوتے مستقل گرہ پڑ جاتی یا قرآنی اصطلاح میں غل پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دو سگے بھائیوں کے دل بھی شاذ و نادر ہی کسی گھر میں ایک دوسرے سے ملے یا صاف نظر

---

[1] جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ (شوریٰ ع ۴)

آتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اخلاق و معاملات کی موٹی موٹی بدعنوانیوں ہی سے نہیں، ناگواری کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بچنا بچانا چاہیے۔ قرض یا عاریت کے لین دین میں جن لوگوں کی نیت خراب نہیں ہوتی ان کی بھی عام عادت یہ ہوتی ہے کہ وقتِ وعدہ پر نہ قرض ادا کرتے ہیں نہ عاریت یا مانگے کی چیز واپس کرتے ہیں۔ بار بار کے تقاضے اور یاددہانیوں سے قدرۃً فریقین کو ناگواری ہوتی ہے۔ اکثر مانگے کی چیز کی حفاظت کا حق بھی پوری طرح نہیں ادا کیا جاتا اور خراب حالت میں واپس کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک عام بے پرواہی لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ چاقو، قینچی، قلم، پنسل وغیرہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو نہ صرف مالک کی اجازت و اطلاع کے بغیر اٹھا لے جاتے ہیں بلکہ کام نکل جانے کے بعد فوراً اپنی جگہ پر پہنچا بھی نہیں دیتے۔ غریب مالک اپنی ضرورت پر ڈھونڈھتا پھرتا اور پریشان ہوتا ہے۔ ایک اور بدانتظامی و بدسلیقگی ہم میں اور ہمارے گھروں میں کم و بیش وباہی کی طرح پھیلی ہوئی ہے، نہ چیزوں کی جگہ مقرر ہوتی ہے نہ کاموں کا وقت، جس کی بدولت وقت ضائع اور چیزیں رواں دواں بھی بہت ہوتی ہیں اور بار ہا وقت اور جگہ پر چیز نہ ملنے سے پریشانی بھی ہوتی ہے اور نقصان بھی، ہیں بظاہر یہ باتیں جزئیاتی، لیکن ان سے نفس و قلب دین و دنیا سب کے بڑے بڑے کلیاتی اخلاقی و معاشرتی مفاسد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اُن کو ہلکا اور حقیر جاننا خود ہماری عقل و فہم کے ہلکے پن کی دلیل ہے۔

عرض کرنا یہی ہے کہ جس طرح ہم مسلمانوں کے دین دنیا سب کے فسادیا

بگاڑ کا سب سے بڑا سرچشمہ ہمارے گھر ہیں، اسی طرح ہماری اصلاح یا بناؤ کی کارگرد پائیدار صورت بھی گھروں ہی سے اس کی ابتدا ہے۔ مسلمان معاشرہ یا امت میں کوئی گھر عمومی واصلاحی انقلاب بے اس کے برپا نہیں کیا جاسکتا کہ اصل توجہ گھریلو زندگی یعنی معاشرہ کے ہر واحد یا اکائی (گھر کی) کی اصلاح وانقلاب پر ہو۔

ان سطروں کو لکھ ہی رہا ہوں کہ جماعت اسلامی (ہند) کے آرگن دعوت کا ایک اقتباس سامنے آگیا۔ احمدی حضرات کو ان سے اختلاف کے باوجود یورپ افریقہ میں اسلام کی خدمت پر داد دی گئی ہے کہ:۔

"یہ لوگ کرۂ مریخ سے وارد نہیں ہوئے، انھوں نے اپنے خاص نظام کے تحت اپنے نظریات وعقائد کی تربیت حاصل کی اور اپنے کردار کو پختہ کیا اور مذہب کی جو دولت انھوں نے پائی اس کو لے کر وہ افریقہ اور دوسرے ممالک میں پہنچے اور ایقان کے سہارے اس کی دکانیں وہاں سجائیں جہاں دین کا نام لینا بھی دوسروں کے لئے باعث شرم ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ احمدی حضرات کا اس طرح دور دراز ملکوں تک پہنچ کر اپنی جیسی دین کی دعوت وخدمت کی جدوجہد ان کے کردار وایقان کی تربیتی پختگی ہی پر مبنی ہے اور یقیناً وہ اپنے گھروں یا اہل وعیال میں اپنے نظریات کی ایقانی تعلیم وتربیت کا اہتمام اس سے بہت زیادہ کرتے ہیں جس کا ہمارے اچھے اچھے علماء ومشائخ کے گھرانوں میں کم ہی ہوتا ہے نتیجہ معلوم ہے کہ ہمارے

"جو نوجوان گھر ہی پر اسلام سے واقف نہیں، جن کے پاس نہ خزانہ ہے نہ اس کی کنجی، وہ مغربی ممالک میں جا کر یہی کر سکتے ہیں کہ انھیں اپنی اسلامیت پر شرم آئے اور مغربی افکار سے متاثر ہوں اور فیصلہ یہ کریں کہ مغربی قوموں نے مذہب سے آزادی حاصل کر کے ترقی کی اور اس کی وجہ سے انھیں مشرق پر برتری حاصل ہوئی۔ گویا اصل مسئلہ تربیت کا ہے اسلام اور کفر کا نہیں ہے۔ گھر کے ماحول میں جو رنگ چڑھ جائیگا خواہ اسلامی رنگ ہو یا غیر اسلامی، اسے مغربی ممالک میں جا کر نکھرنے کا موقع ملتا ہے۔ جو شخص گھر میں اسلام کی تربیت سے محروم رہا وہاں جا کر اور اضافہ ہوگا، اور جس نے یہ نعمت گھر پر حاصل کر لی وہ کہیں بھی چلا جائے اپنی پونجی کی حفاظت ضرور کرے گا۔"[1]

سوال فقط یہ ہے کہ گھر میں یہ رنگ چڑھنا یا اس نعمت کا حاصل کرنا خالی گھر کے باہر کی تقریروں تحریروں، رسالوں جلسوں، کانفرنسوں، کنونشنوں، مدرسوں، اداروں وغیرہ سے ممکن ہے؟ یا خود گھر کے اندر کسی نظام و انتظام کی ضرورت ہے؟ اور کیا ایسا کوئی انتظام "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" والے خود گھر کے راعی یا نگران کا اپنی مسئولیت و مواخذہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے سوا کافی و کارگر ہو سکتا ہے؟ غرض اصل مسئلہ اگر کفر و اسلام کا بھی نہیں بلکہ اسلامی تربیت کا ہے، تو اس مسئلہ کا اصل حل بھی ایک اور صرف ایک ہے کہ اصل زور اصلی تربیت گاہوں یعنی

---

[1] صدق جدید ۱۶ر جون ۶۱ء

مسلمان گھروں کو مسلمان بنانے یا ان کی اصلاح و انقلاب پر لگانا چاہیے۔ پھر ان واحدوں یا اکائیوں سے جو معاشرہ مرکب ہوگا وہ آپ سے اسلامی معاشرہ اور اسلام کی خیر امۃ اور دنیا کی بہترین قوم ہوگی۔

ایسے ٹھوس گھریلو انقلاب و اصلاح کی تدبیر بھی ایک ہی ہے کہ طول و عرض کے پھیلاؤ سے قطع نظر کر کے بہتر ہوگا کہ زیادہ نہیں کم و بیش پانسو کی مسلمان بستی یا آبادی کو کوئی معتدبہ درجہ میں علم و عمل کی مخلصانہ و مصلحانہ صلاحیتیں رکھنے والا لے کر بیٹھ جائے اور اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک اس آبادی کے گھروں کی بہت بڑی اکثریت کم از کم ۷۵ فی صد کی مطلوب اصلاح نہ ہو جائے۔ مرکز اس کا مسجد ہو، جس میں دو چار چار گھر کے سر دھروں یا راعیوں کو ان کی فرصت کے مناسب وقت میں جمع کر کے یا خود اُن کے گھر جا کر بار بار اُن کی ایمانی و اسلامی راعیانہ ذمہ داریوں کو ذہن نشین کرائے۔ اور ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ ضروری ضروری احکام یا اوامر و نواہی کی عام وعظ و تقریر کے ذریعہ مردوں عورتوں سب کو یک جا کر کے تعلیم و ترغیب ہو۔ جس میں حقوق اللہ کے فرائض و واجبات کے بعد سب سے زیادہ اور حقوقِ عباد کے فرائض و واجبات اور خصوصاً ایسے نواہی پر ہو جن سے ذرا بھی ایک سے دوسرے کو کوئی جانی و مالی اذیت پہنچ کر آپس میں بے لطفی یا دلوں میں کدورت پیدا ہوتی ہو۔ بچوں کے لئے جو مکتب ہو اس کے نصاب میں بھی ایمانیات و عبادات کے فرائض و واجبات کے بعد خصوصی توجہ بندوں کے باہمی معاملاتی و اخلاقی اور

معاشرتی چھوٹے بڑے حقوق و فرائض پر ہو۔ اور نری کتابی تعلیم کی تشویق و ترغیب سے بڑھ کر انعامات وغیرہ کے ذریعہ بچوں میں اخلاق و معاشرت کی عملی باتوں کا ذوق و شوق بڑھایا جائے کہ کھیل کود ہر چیز میں آپس میں ان کا خیال رکھیں۔

بچوں سے بھی بڑھ کر ہر گھر کے بڑوں کو اس کی تعلیم و تاکید ہو کہ گھر کے اندر کی طرح گھر کے باہر پاس پڑوس والوں، اپنوں، پرایوں، مسلمانوں غیر مسلمانوں سب کے ساتھ لین دین کے معاملات ہی میں نہیں، میل جول یا اخلاق و معاشرت ایسے اسلامی اوامر و نواہی کا بھی پورا خیال رکھیں، جن سے دوسروں کو راحت زیادہ سے زیادہ پہنچے اور اذیت سرے سے نہ ہو کہ دلوں کا ملنا اس کے بغیر ممکن نہیں۔ ان باہر والوں مسلمانوں میں آپس میں جو چھوٹی بڑی نزاع پیدا ہو، مسلمان اپنے اسلامی حکم ہی کی رُو سے اس کی اصلاح میں خود پیش قدمی کرے (اصلحوا ذات بینکم) بلکہ موقع آنے پر غیر مسلمانوں کیا دشمنوں تک کے ساتھ انصاف و احسان کرے کہ اسلام جس تقویٰ کا مطالبہ کرتا ہے اس کا تقاضا یہ بھی ہے (لا یجرمنکم شنآن قوم الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقویٰ)

اگر کسی نزاع کے فریقین خود اصلاح میں کوتاہی کریں تو مسلمان معاشرہ کا ہر فرد حسب موقع مامور ہے کہ وہ درمیان میں پڑ کر اصلحوا بین اخویکم کے حکم کے مطابق نزاع کو دور کرنے کرانے یا مصالحت کی سعی و تدبیر میں اپنی والی کوئی کمی نہ کرے مسلمانوں کے متعلق تو ہر مسلمان پر اسلامی اخوت ہی کی بنا پر اس اصلاح کا فرض

عائد ہے لیکن راقم ہذا نے تو ایک بڑے صاحب حال وقال بزرگ[1] کو دیکھا، جو عرصہ تک سشن جج بھی رہ چکے تھے کہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان فریقین میں صلح ہی زیادہ تر کرا دیتے تھے اس زمانے کی عدالتوں سے کسی مسلمان یا انسان کو بچا لینا اس کی دنیا و دین کی بہت بڑی خیر خواہی ہے۔ اس لئے کہ ان میں قدم رکھنے کی پہلی شرط اسلامیت و انسانیت سب کو خیر باد کہہ دینا ہے۔ اور اسلامیت یا مسلمان ہونے کے تو اس کے سوا کوئی معنیٰ نہیں کہ "زندگی کے تمام معاملات و منازعات میں خدا و رسول یا اُن ہی کے مطابق حکم کرنے والوں کے احکام کے آگے سر ڈال دیا جائے۔ پھر اگر ان میں بھی کوئی اختلاف ہو تو اس کی بھی زیادہ علم والوں سے تحقیق کرکرا کے بالآخر خدا و رسول ہی کے حکم کو مرجع بنایا جائے، یہی خدا و آخرت پر ایمان لانے کے معنیٰ ہیں۔ باقی جو لوگ ایمان و اسلام کا دعویٰ کر کے بھی غیر خدائی احکام کو قبول کرتے ہیں وہ دراصل خدا کے بجائے شیطان یا طاغوت کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں، جن کی سرشت ہی خدا سے طغیان و بغاوت ہے تو گویا شیطان جس سے ہم کو کفر کا حکم دیا گیا تھا، اُلٹے اس پر ایمان لا بیٹھتے ہیں، ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ "شیطان نے ان کو گمراہ کر کے ایمان کی راہ سے بہت دور جا پھینکا" یا زبان سے اسلام کے دعوے اور عمل سے اس کے انکار کو صریح کفر نہیں کفر سے بدتر نفاق کہہ لو۔ جیسا کہ آگے ہی اسی سلسلے میں ہے کہ "ایسے مدعیانِ ایمان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم اپنے ایمان کے دعوے

---

[1] حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

ہیں سچے ہو" تو آؤ خدا اور رسول کے حکم کو قبول کرو، تو صاف پہلو تہی پر اُتر آتے ہیں اور ذرا آگے کیسی لرزا دینے والی تنبیہ و تہدید رسولِ اسلام ہی کو خطاب فرما کر ہے کہ "قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ اس وقت تک مومن (یا مسلمان) نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑوں میں آپ سے (یعنی شریعت کے مطابق) تصفیہ نہ کرائیں پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور پوری پوری طرح اس کو تسلیم کرلیںؔ[1]۔"

اگر گھروں میں اپنی اپنی جگہ اسلامی زندگی پیدا ہو گئی تو باہر بھی آپ سے آپ ایسے مسلمانوں میں اول تو جھگڑے رونما ہی کم ہوں گے اور جو ہوں گے ان کے فیصلہ میں آسانی سے فریقین کو شریعت کا حکم ماننے پر آمادہ کیا جاسکے گا۔ اور جب تک کوئی مجبوری و اضطرار نہ ہو معاشرہ کے دباؤ کے خلاف انشاء اللہ عدالت کا رخ کرنے کی کوئی ہمت نہ کرے گا۔ کیونکہ ایسے اسلامی معاشرہ میں جھوٹی گواہیوں وغیرہ سے مدد دینے والے اس کو قدم قدم پر آج کل کی طرح کہاں ملیں گے۔ تاہم اس نظم و نظام کے تحت اصلاحی کام کرنے والوں کو اپنے اپنے حلقہ یا واحدہ میں اس کا خصوصی اور پورا اہتمام رکھنا چاہیئے کہ آپس کا کوئی جھگڑا عدالت کے دروازہ تک نہ جانے پائے الا آنکہ فوجداری وغیرہ کی کسی غیر معمولی صورت میں خود حکومت ہی دخیل ہو جائے

---

[1] یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔۔۔۔ یصدون عنك صدودا۔۔۔۔ فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (نساء ع ۹،۸)

اور معاملہ باہمی تصفیہ و مصالحت کے اختیار سے باہر ہو جائے۔

مسلمانوں کے قریباً تمام طبقوں جماعتوں وغیرہ میں ایک خدا ایک رسول اور ایک کلمۂ توحید والی وحدت رکھ کر بھی جو ہر جگہ تمام انفرادی و اجتماعی زندگی میں "بنیان مرصوص" والے اتفاق و اتحاد کے بجائے کہنا چاہیے کہ افتراق و انشقاق ہی کے کلمہ کا دور دورہ ہے، اس کا بھی واحد علاج غیر اسلامی گھریلو زندگی ہی سے اصلاح کا آغاز ہوگا۔

عمل میں اسلام کی روح و مزاج آج کل کی خودداریوں نفسانیوں پر مبنی نام نہاد آزادی نہیں بلکہ خدا و رسول یا شریعت کی بے چون و چرا غلامی ہے، اس غلامی یا اطاعت کو تعلیم و تربیت سے گھروں میں اس طرح پیدا کرنا کہ گھر کے راعی یا نگراں کی اطاعت بھی اسلامیت و شریعت یا خدا و رسول کی رضا و ناراضی ہی کے ماتحت ہو اور پھر ایسے گھروں سے مل کر معاشرہ کی جو اکائیاں یا واحدے وجود میں آئیں گے، ان میں بھی آپ سے آپ شریعت کے دائرے سے نکل کر تفرق و تشتت کی گنجائش کم سے کم ہی نکل سکے گی۔ اسلامی مزاج کی رو سے جس طرح ہر گھر کا ایک مطاع راعی و نگراں ہونا ضروری ہے، جس کے گھر والے سب کے سب شریعت کے ماتحت احکام میں بے چون و چرا مطیع ہوں، اسی طرح تنظیم کے لئے ایسے گھروں کے جو مثلاً پانچ پانچ سو آبادی کے حلقے یا اکائیاں بنائی جائیں ان کا بھی ایک صاحب امر راعی و نگراں یا سر دھرا ہو۔

اور ایسے حلقوں میں اصلاح کا کام کرنے والے اہل علم وصلاح (یا دینی دارالعلوموں کے صالح تربیت یافتہ) جہاں ایک طرف ہر حلقہ کے، ہر گھر کی اصلاح کریں وہاں دوسری طرف پورے حلقہ میں جو دینی اصلاح کے قبول کرنے کی صلاحیت و قابلیت سب سے زیادہ رکھتا ہو، اس کو ضروری تعلیم و تربیت سے معتد بہ درجہ میں اس کا اہل بنایا جائے کہ وہ اس پورے حلقہ کا سردھرا یا راعی ہو۔

اس کی استعدادی اہلیت وصلاحیت کی سب سے اہم واقدم شرط بھی وہی ہوگی کہ جاہی ومالی حرص وطمع کا مادہ اس میں نہ ہو، یا اتنا کم ہو کہ تربیت سے اس کو حدود میں لایا جاسکے، ایسے ہی شخص پر لوگ قدرۃً زیادہ اعتماد و اتفاق کر سکیں گے خصوصاً جب تربیت کے بعد اس کی بے غرضی وانصاف پسندی کے تجربات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ عملی تربیت کے ساتھ ساتھ ضروری دینی معلومات کی جو کمی اس میں ہو وہ بھی پوری کرائی جائے۔ جس کے لئے عربی داں کیا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں۔ تاہم آج کل سہولت اسی میں زیادہ ہے کہ کوئی ایسی جامع کتاب اس کو سبقاً سبقاً سمجھا کر پڑھا دی جائے جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد اخلاق ومعاملات اور معاشرت سب کے ضروری ضروری روزمرہ پیش آنے والے مسائل اور ان کے اصلاحی معلومات پر حاوی ہو[۵]۔ اب یہی مقامی

---

[۵] بہشتی زیور کے سوا ایسی کتاب کسی دوسری زبان یا عربی تک میں معلوم نہیں۔ البتہ اس کی زبان کو ذرا عصری بنا کر ایک عصری ایڈیشن کی ضرورت ہے ۱۲۔

شخص اپنے پورے واحدہ کے تمام گھروں کا مستقل نگراں یا راعی و امیر ہوگا۔

جس دین نے اپنی امت و معاشرہ کو بات بات میں اختلاف و خودرائی یا تفرق و انتشار کے مفاسد سے بچانے اور اجتماعی انضباط (ڈسپلن) پیدا کرنے کے لئے سفر کی عارضی رفاقت تک میں اطاعت پر اتنا زور دیا ہو کہ تین آدمی بھی اگر ساتھ سفر کریں تو ایک کو اپنا امیر یا مطاع بنا لیں، وہ یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ کسی چھوٹی بڑی مستقل آبادی کے افراد "شتر بے مہار" زندگی کے لئے چھوڑ دیئے جائیں۔ . . . .

اور جس طرح ایسے ہم سفروں کا یہ عذر لایعنی ہوگا کہ بلا اسلامی حکومت کے ایسا امیرِ سفر کیسے بنایا یا منتخب کیا جائے، اسی طرح نام کی مسلمان یا غیر مسلمان کسی حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے انتشار و پراگندگی کی زندگی بسر کرنے کا خود اسلام کی نگاہ میں قطعاً یہ کوئی معقول و مقبول عذر نہیں ہو سکتا کہ جب تک سیاسی و حاکمانہ اقتدار رکھنے والا کوئی مسلمان امیر و حاکم نہ ہو ہم جاہلیت کی موت مرتے ہیں۔ اسلامی زندگی کا تو اولین مطالبہ اپنی وسعت و اختیار بھر اس کے احکام پر ہر موافق و مخالف ماحول میں عمل کرنے کرانے کی جو صورتیں پیدا کی جا سکتی ہوں ان کے بہرحال ہم مکلف ہیں۔ صاحبِ اقتدار حقیقی اسلامی حکومت ہر جگہ ہر وقت قائم کر کرا لینا ہمارے اختیار میں نہیں۔ لیکن ہمارے تھوڑے بہت جو معاملات مسلمان یا غیر مسلمان حکومت کی قانونی گرفت و مداخلت سے باہر ہیں کم از کم ان میں اسلامی احکام کے مطابق اجتماعی زندگی بسر نہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لازماً اختیار بھر اس کی

تکمیل ہم پر لازم ہے کہ کسی نہ کسی نظم و نظام کے تحت اپنا کوئی امیر یا راعی و نگراں بنا لیں[1] پھر خدا کو راضی کرنے کی مخلصانہ نیت کے ساتھ چھوٹی سی چھوٹی مسلمان آبادی بھی اپنے اختیار کی حد تک اپنے کو اسلام کی منضبط نگرانی و اطاعت میں دیدے گی تو مزید وسعت کا آگے راستہ "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ" کے وعدہ کے تحت قدرتی طور پر خود ہی انشاء اللہ کھلتا چلا جائے گا۔ اور اس راستہ سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا، سیاسی اقتدار والے حقیقی اسلامی غلبے کے ظاہری اسباب بھی پیدا ہو کر رہیں گے۔ باقی آج کل جو زیادہ تر غیروں کی ریس میں مسبب الاسباب سے عملاً قطع نظر کر کے خالص اسبابی راہوں پر زور دیا جا رہا ہے تو یہ ایمانی و اسلامی منطق کی رو سے ایسی اُلٹی راہ ہے کہ مسلمانوں کے حق میں بالخصوص اس خدا چھوڑی راہ کے نتائج بھی جس طرح صدیوں سے روز بروز اُلٹے نکل رہے ہیں آئندہ بھی الٹے ہی نکلتے رہیں گے۔ یہی سبق و شہادت چودہ سو سال کی پوری اسلامی تاریخ کا ہے۔

---

[1] اس کا ایک عملی تجربہ بہار کی امارتِ شرعیہ کی صورت میں وقت کے مستند و مسلم صلحا و علما فرما بھی چکے ہیں اور اس پر کافی تحریری مواد بھی موجود ہے جو قابل مطالعہ و توجہ ہے نظری و عملی دونوں اعتبار سے۔ آگے نہ بڑھنے کا سبب ٹھوس عملی خدمات کا ہمارے اندر روز افزوں قحط ہے، دوسرے اس تنظیم کے حضرات کی نظر میں آبادیوں کی چھوٹی چھوٹی محدود مذکورہ طرز کی اکائیاں بنا کر ان میں اس نظم و انتظام کو پختہ فرمانے کی طرف نہیں گئی جس کی وجہ سے کوئی ہمت افزا اچھا عملی نمونہ ایک بھی سامنے نہ آسکا، نہ علما و خواص کے، نہ عام مسلمانوں کے۔ سراپا نابکار و تباہ کار راقم ہذا کے نزدیک ضرورت اسی کی ہے کہ ابتدا خواہ محدود آبادی سے ہو لیکن ہو وہ نمونہ کا بار آور صالح تخم۔

بہر حال واحدہ دار مضبوط و منضبط طریق کا جو ایک سرسری نقشہ اوپر پیش کیا گیا ہے ایسے ہی عملی نقشہ کے تحت ان واحدوں کی تعداد جیسی جیسی بڑھتی جائے تو مثلاً قریب قریب کے پانچ واحدوں کو ملا کر ان کے مقامی راعیوں یا امیروں میں جو اپنے صدق و اخلاص علم و عمل فہم و تدبیر کے لحاظ سے بہ حیثیت مجموعی زیادہ اہل ہو، اس کو ان پانچوں واحدوں کے راعیوں کا ذمہ دار راعی و نگراں یا امیر قرار دیا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سلسلہ کو ضلع وار اور اضلاع کو صوبہ یا ریاست وار اور ریاستوں کو ملک گیر بنایا جا سکتا ہے۔[1]

بیشک ہے یہ شیخ چلی کی بکواس، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس شیخ چلّی کو

---

[1] آج کل کی نام نہاد جمہوریت و عوامیت میں اور اس کے انتخابی لاکھوں کروروں ووٹروں کے لاکھوں کروروں کے مصارف (امریکہ کے نئے صدر کے انتخاب میں ۸۱ کرور خرچ ہوئے) کے علاوہ طرح طرح کے مفاسد اور ہڑبونگ، تو سرے سے اسلامی مزاج و روح کی ضد ہی ضد ہیں۔ اس کو بھی اسلامی نقشہ میں اگر جگہ مل سکتی ہے تو ہر بالغ کی ہڑبونگی رائے دہندگی کی صورت میں نہیں، بلکہ ہر واحدہ کے معتمد راعیوں کی نمائندگی کے واسطہ سے۔ اس طرح کہ مثلاً ایسے پانچ پانچ سو والے بیسیؔ واحدوں کے نمائندے اپنے میں دس ہزار کے لئے ایک راعی و نمائندہ منتخب کریں۔ اور پھر ایسے دس ایک لاکھ کے لئے۔ اور وہ دس ایک کرور کے لئے یہاں تک اوپر جاتے جاتے اخلاص و عمل علم و فہم ہر اعتبار سے ملک کے چیدہ چیدہ و معتمد نمائندے اسلامی خلیفہ کو اپنے ہی میں سے منتخب کریں۔ اس کی تفصیل شاید کچھ تجدید سیاست میں ہو سکے۔ گو نرے کاغذی "سلسلۂ تجدید" کی کتابوں نے اب اس سے بھی دل سرد کر دیا ہے۔ صرف یہ خیال کچھ ہمت بندھا دیتا ہے کہ شاید "کودک ناداں" کے قلم کا یہ تیر اتفاقاً اگر صحیح نشانہ پر پڑ گیا ہو، اور کسی صاحب عمل و اخلاص کی نظر اس پر پڑ جائے تو وہ کچھ کام لے لے۔

عقلاً و نقلاً ہر طرح پورے شرح صدر کے ساتھ اس امر پر اطمینان و اصرار ہے، کہ مسلمانوں کا دین و دنیا کا بیڑا صرف اور صرف ایمان و عمل صالح کی زندگی پیدا کرنے سے پار ہو گا اور یہ بار بار دہرانے کی بات ہے کہ عمل صالح سے صرف روزہ نماز وغیرہ کے عبادات ہرگز مراد نہیں۔ حقوق عباد کی اہمیت تنظیم کے ہر مرحلہ پر مد نظر رہنا لازم ہے۔ اس اطمینان و اصرار پر الحمدللہ امام غزالیؒ جیسے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مسلم امام مصلح و مجدد کی ایسی تحریر و تجویز نے مہر لگا دی، جس کی تفصیل اوپر ص ـــــ پر گزر چکی۔ باقی زیادہ تر عصری و فرنگی رنگ میں شرابور جیسی تحریکوں اور تدبیروں یا کاغذی دفتروں کے بیڑوں پر بیڑے بناتے چلے جانے سے ہماری دین و دنیا کا کوئی بھی بیڑا ہرگز ہرگز پار نہ لگے گا۔ ان کی قسمت تو دیر سویر ڈوبنا ہی ہے جس کے آئے دن تجربات مسلمانوں کے حاکم و محکوم سب ہی ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں۔[1]

---

[1] آج کل جبلپور کے انتہائی وحشیانہ و جارحانہ اور خونیں فسادات سے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو بھرپور تنبیہی تازیانہ لگا ہے تو اس سلسلہ میں بھی کہنا چاہیئے کہ توجہ تمام تر صرف کنونشنی راہوں پر ہے۔ اور ایک کنونشن کے جوڑ پر آج ہی (۲۱ جون ۱۹۶۱ء) کے اخبار میں دوسرے کنونشن کی تیاری کی خبر پڑھی انا للہ ثم انا للہ۔

حضرت مولینا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

دو (۲) عظیم علمی و عرفانی شاہکار

تدوینِ حدیث

جس میں

حدیث کی حقیقت اور شرعی حیثیت، اس کے جمع و تدوین کی سرگذشت، اس کی حجیت اور تشریعی اہمیت، نیز منکرینِ حدیث کے شکوک و شبہات اور عامیانہ اعتراضات کے تسلی بخش جوابات، ان تمام پہلوؤں پر نہایت محققانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے بلاشبہ یہ اپنے موضوع پر ایک نہایت جامع اور لاجواب کتاب ہے۔

قرآن و حدیث سے دلچسپی رکھنے والے ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے +

ضخامت تقریباً پانچسو صفحات کاغذ اعلیٰ

کتابت و طباعت معیاری مجلد گردپوش

قیمت چھ روپے آٹھ آنے

مقالاتِ احسانی

جس میں

تصوف و احسان کی ماہیت و اہمیت حصولِ احسان کے عام اور خاص طور طریقے ان کے باہمی اختلاف کے وجوہ و اسباب نیز اس قسم کے دوسرے مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے مدلل اور مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اسی طرح فتوحات شیخ اکبر اور مثنوی مولانا روم کے عارفانہ حقائق اور صوفیانہ معارف کو نہایت مؤثر اور روح پرور انداز میں پیش کیا گیا ہے جسے پڑھ کر قلب میں طمانیت اور ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔

یہ کتاب بھی اپنے رنگ کی پہلی اور بے نظیر کتاب ہے

ضخامت تقریباً پانچسو صفحات، کاغذ،

کتابت و طباعت معیاری، مجلد گردپوش

قیمت چھ روپے آٹھ آنے

ادارہ مجلس علمی کراچی

مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی